تاریخ

دعوت و عزیمت

حصہ اول

عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ
نامور مصلحین اور ممتاز اصحابِ دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف
ان کے علمی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ

مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ

مجلس نشریاتِ اسلام
۱۔ کے۔ ۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۱، کراچی ۱۸

جملہ حقوق طباعت واشاعت پاکستان میں
بحق فضل ربی ندوی محفوظ ہیں۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ؒ

اپنی حیات میں مندرجہ ذیل اداروں کے ذمہ دار رہے

- ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
- صدر مجلس انتظامی ومجلس عاملہ دار المصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
- صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی ومدینہ یونیورسٹی
- صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ۔

نام کتاب ______ تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ اول)
تصنیف ______ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ؒ
طباعت ______ احمد برادرز پرنٹنگ پریس، کراچی
ضخامت ______ ۴۳۶ صفحات

ٹیلیفون : ۶۶۰۱۸۱۷

اسٹاکسٹ : مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام ۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۔ کراچی ۷۴۶۰۰

تاریخ دعوت و عزیمت

(حصہ اوّل)

عربی ——— کویت و بیروت
انگریزی ——— لکھنؤ، کراچی
اردو ——— لکھنؤ
اردو ——— کراچی

فہرست

تاریخ دعوت و عزیمت

حصۂ اول

مضمون	صفحہ
دیباچہ طبع دوم	۹
پیش لفظ	۱۱ - ۱۲
مقدمہ	
اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل	۱۷ -- ۳۰
زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے	۱۷
امت اسلامیہ کا انحراف سب سے زیادہ پر از خطرات ہے	۱۸
اسلام کے بقا اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات	۱۸
اسلام کے قلب و جگر پر حملے	۱۹
دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی	۲۰
مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت	۲۶
ہر فتنے اور ہر خطرے کے لئے نئی شخصیت موجود	۲۷
تاریخ کے گمشدہ ماخذ	۲۸
اسلام کی میراث	۲۹
پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ	۳۱ — ۵۲
عہد اموی میں جاہلی رجحانات و اثرات	۳۱
عہد اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا نقطۂ نظر	۳۲
انقلاب حکومت کی ضرورت اور اس کی مشکلات	۳۳
حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی جانشینی	۳۴
خلافت کے بعد ان کی زندگی	۳۵
ان کی انقلابی اصلاحات	۳۶
اعمال و اخلاق کی طرف توجہ	۳۸
تدوین علوم اور احیائے سنن	۳۹
چند خطوط و فرامین	۴۰
تبلیغ و اشاعت اسلام کی طرف توجہ	۴۸
ان کی اصلاحات کے اثرات اور ان کا رد عمل	۴۹
ان کی زندگی کا جوہر	۵۰
حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات	۵۱
دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں اور حضرت حسن بصریؒ	۵۳ — ۶۸
امت میں اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف	۵۳
تابعین کی دعوت ایمانی	۵۴
حضرت حسن بصریؒ	۵۵
حسن بصری کی شخصیت اور ان کی امتیازی صلاحیتیں	۵۵
حسن بصری کے مواعظ	۵۷
ان کی حق گوئی و بیباکی	۶۲
اصلاحی حکومت میں تعاون اور استغنا	۶۳

اخلاق و مناقب کی شہادتیں ۶۵
حسن بصری کی وفات اور ان کی مقبولیت ۶۷
انقلاب حکومت کی کوششیں ۶۷

خلافت عباسیہ اور دینی دعوت و تذکیر
۶۹ — ۷۲

خلافت عباسیہ اور اس کے اثرات ۶۹
بغداد کے داعی الی الخیر ۷۰

تدوین حدیث و فقہ
۷۳ - ۸۳

امت کی دو فوری ضرورتیں ۷۳
تدوین حدیث ۷۵
محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی ۷۵
فن اسماء الرجال ۷۶
محدثین کی احتیاط و امانت ۷۷
قوت حافظہ اور استحضار ۷۸
مجالس درس میں سامعین کا ہجوم ۷۹
صحاح ستہ ۷۹
تدوین فقہ ۸۰
ائمہ اربعہ اور ان کی خصوصیات ۸۱
ائمہ اربعہ کے شاگرد و جانشین ۸۲
تدوین فقہ کا فائدہ ۸۲

فتنۂ خلق قرآن اور امام احمد بن حنبلؒ
۸۴ — ۱۰۲

فلسفۂ الٰہیات اور ذات و صفات کی بحثیں ۸۴
معتزلہ کا عروج ۸۵
امام احمد بن حنبلؒ ۸۶
فتنۂ خلق قرآن ۹۲
امام احمد ابتلاء و امتحان میں ۹۶
واقعہ کی تفصیلات امام احمد کی زبان سے ۹۶
بے نظیر عزیمت و استقامت ۹۹
امام احمد کا کارنامہ اور اس کا صلہ ۱۰۰

فتنۂ اعتزال اور ابو الحسن اشعری اور ان کے پیرو
۱۰۳ — ۱۱۸

معتزلہ کا علمی اقتدار اور اس کے اثرات ۱۰۳
سنت کے وقار کے لئے ایک بلند شخصیت کی ضرورت ۱۰۴
امام ابو الحسن اشعری ۱۰۵
امام ابو الحسن اشعری کا جذبۂ تبلیغ و احقاق حق ۱۰۶
ان کی ذہنی صلاحیتیں اور علمی کمالات ۱۰۶
ان کا مسلک اور ان کی خدمات ۱۰۸
ان کی تصنیفات ۱۱۳
عبادت و تقویٰ ۱۱۴
وفات ۱۱۴
امام ابو منصور ماتریدی ۱۱۴
اشعری حلقہ کے علما اور ان کا علمی اثر ۱۱۶

علم کلام کا انحطاط فلسفہ اور باطنیت کا فروغ
اور
ایک نئے متکلم کی ضرورت
۱۱۹ - ۱۲۹

علم کلام کا انحراف و انحطاط ۱۱۹
فلسفہ کا رواج ۱۲۰
فلسفۂ یونان کے عرب ناقل و شارح ۱۲۱
جماعت اخوان الصفا اور اس کے رسائل ۱۲۱
معتزلہ و فلاسفہ کا فرق ۱۲۲
باطنیت کا فتنہ ۱۲۳
ظاہر و باطن کا مغالطہ ۱۲۴
نبوت محمدی کے خلاف بغاوت ۱۲۶

ایک نئی شخصیت کی ضرورت ١٢٨

امام غزالیؒ
١٣٠-١٩٦

تعلیم اور علمی عروج ١٣٠
گیارہ سال کی رہ نوردی اور اس کے تجربات ١٣١
خلوت سے جلوت کی طرف ١٣٧
امام غزالیؒ کا تجدیدی کام ١٤١
فلسفہ پر عمل جراحی ١٤١
تہافت الفلاسفہ کا اثر ١٤٥
باطنیت پر حملہ ١٤٥
زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ ١٤٦
احیاء العلوم الدین ١٤٦
تنقید و احتساب ١٤٨
علماء و اہل دین ١٤٩
حکام و سلاطین ١٥٦
مسلمانوں کے دوسرے طبقے ١٦٢
ایک اصلاحی و تربیتی کتاب ١٦٧
احیاء العلوم اور فلسفۂ اخلاق ١٦٨
حب جاہ ١٦٨
محاسبۂ نفس ١٧٧
احیاء کے ناقد ١٨٢
امام غزالی اور علم کلام ١٨٣
تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام غزالی کی معذرت ١٨٧
بقیہ زندگی اور وفات ١٨٩
امام غزالی کی دو ممتاز خصوصیتیں ١٩٠
امام غزالی کا عالم اسلام پر اثر ١٩٣
عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت و شیخ عبدالقادر اور ابن جوزی کی ضرورت ١٩٤
داعی کی علمی صلاحیتیں ١٩٥
بغداد کے دو داعی ١٩٦

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ
١٩٧-٢٢٤

تعلیم و تکمیل ١٩٧
اصلاح و ارشاد اور رجوع عام ١٩٨
مجاہدہ و اخلاق ١٩٨
مردہ دلوں کی مسیحائی ٢٠١
تعلیمی مشاغل و خدمات ٢٠٢
استقامت و تحقیق ٢٠٣
تفویض و توحید ٢٠٤
خلق خدا پر شفقت ٢٠٥
حضرت شیخ کا عہد اور ماحول ٢٠٦
مواعظ و خطبات ٢٠٨
توحید خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی ٢٠٨
شکستہ دلوں کی تسکین ٢١٢
دنیا کی صحیح حیثیت ٢١٣
خلفاء اور حکام وقت پر تنقید ٢١٥
دین کے لئے دل سوزی اور فکر مندی ٢١٧
بیعت و تربیت ٢١٨
زمانہ پر اثر ٢٢١
وفات ٢٢١

علامہ ابن جوزیؒ
٢٢٥-٢٥١

ابتدائی حالات اور تحصیل علم ٢٢٥
کتابت حدیث میں انہماک ٢٢٦
ذوق مطالعہ ٢٢٦
تصنیف و تالیف اور تبحر علمی ٢٢٧
تقویٰ اور ذوق عبادت ٢٢٧

ظاہری محاسن و اوصاف ۲۲۵
بلند ہمتی اور جامعیت کا ثبوت ۲۲۵
مجالس وعظ و تذکیر ۲۳۲
ان کا انداز خطابت ۲۳۳
کتاب الموضوعات ۲۳۳
تلبیس ابلیس ۲۳۴
مختلف طبقات پر تنقید ۲۳۴
صید الخاطر ۲۳۹
عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج ۲۴۰
واقعات زندگی اور نفس سے مکالمہ ۲۴۳
سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت ۲۴۶
علمائے امت کی سیرت ۲۴۷
تاریخ کی اہمیت ۲۴۸
تاریخی تصنیفات ۲۴۹
ادبیت و خطابت ۲۵۰
وفات ۲۵۱

نور الدین زنگیؒ اور صلاح الدین ایوبیؒ
۲۵۳ — ۲۸۲

صلیبی حملے اور عالم اسلام کے لئے نیا خطرہ ۲۵۳
اتابک عماد الدین زنگی ۲۵۴
اتابک العادل نور الدین زنگی ۲۵۵
نور الدین کے مجاہدانہ صفات ۲۵۶
شوق جہاد اور ایمان و یقین ۲۵۹
سلطان صلاح الدین ایوبی ۲۶۱
زندگی میں تبدیلی ۲۶۲
جہاد کا عشق ۲۶۳
حطین کی فیصلہ کن جنگ ۲۶۴
سلطان کی دینی حمیت ۲۶۵
فتح بیت المقدس ۲۶۶
انسانی خلق کا مظاہرہ ۲۶۸
صلیبی سیلاب ۲۶۹
صلح اور سلطان کے کام کی تکمیل ۲۷۰
وفات ۲۷۲
درویشی بصورت سلطانی ۲۷۳
محاسن و فضائل ۲۷۷
مردانہ اوصاف ۲۷۹
علم و فضیلت ۲۸۱
فاطمی حکومت کا زوال اور سلطان صلاح الدین کا دوسرا کارنامہ ۲۸۲

شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلامؒ
۲۸۴ — ۳۰۲

علمی عظمت ۲۸۴
سلاطین کو اصلاح، حمیت اسلام اور سلطان کی غیرت ایمانی ۲۸۹
ارباب اقتدار کے مقابلہ میں جرأت و استقامت ۲۹۱
شیخ عز الدین مصر میں ۲۹۳
شیخ کی حق گوئی و بیباکی ۲۹۳
فرنگیوں سے جہاد ۲۹۵
مصارف جہاد کے لئے شیخ کا انتظام ۲۹۵
امرائے سلطنت کا نیلام ۲۹۶
شیخ عز الدین اور سلاطین مصر ۲۹۷
مکارم اخلاق ۲۹۸
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور شیخ کا مسلک ۲۹۹
شیخ کی تصنیفات ۳۰۱
شیخ کی وفات ۳۰۲

فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش ۳۰۳-۳۳۴

تاتاری حملے اور ان کے اسباب ۳۰۳

اسلام کے حریف تاتاریوں کی زد میں ۳۱۴
[illegible] ۳۱۷
تاتاریوں میں اسلام کی اشاعت ۳۲۲

مولانا جلال الدین رومیؒ

۳۲۵ ـ ۴۰۰

علم کلام و عقائد کا بحران ۳۲۵
صاحب دل متکلم کی ضرورت ۳۲۷
مختصر حالات ۳۲۷
خاندان اور والد ماجد ۳۲۸
مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم ۳۲۸
والد کی ہجرت ۳۲۹
مولانا قونیہ میں ۳۳۰
آپ کے تعلیمی سفر اور مشاغل ۳۳۱
انقلاب حال ۳۳۲
شمس تبریز ۳۳۳
مولانا کی ملاقات اور تغیر عظیم ۳۳۴
شورش عام ۳۳۶
شمس کی غیبت ۳۴۰
مولانا کی بیقراری اور شمس کی واپسی ۳۴۷
شمس کی دوبارہ غیبت ۳۴۸
مولانا کی بیتابی ۳۴۹
[illegible] ۳۵۱
شیخ صلاح الدین زرکوب ۳۵۱
شیخ حسام الدین چلپی ۳۵۲
مثنوی کی تحریک ۳۵۳
[illegible] کا منظر ۳۵۴
مولانا کی وفات ۳۵۵
اخلاق و خصوصیات ۳۵۶
ریاضت و مجاہدہ ۳۵۷
نماز کی کیفیت ۳۵۸
زہد و قناعت ۳۵۹
فیاضی و ایثار ۳۵۹
بے نفسی اور فنائیت ۳۵۹
کسب حلال ۳۶۰
اہل دنیا سے یکسوئی ۳۶۰
مثنوی معنوی اور اس کا علمی اور اصلاحی مقام و پیغام ۳۶۰
[illegible] ۳۶۰
عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید ۳۶۲
دعوت عشق ۳۶۸
جہان دل ۳۷۳
مقام انسانیت ۳۷۵
دعوت عمل ۳۷۹
عقائد و علم کلام ۳۸۲
[illegible] ۳۸۳
نبوت اور انبیاء ۳۸۶
معاد ۳۸۹
جبر و اختیار ۳۹۲
[illegible] ۳۹۳
مثنوی کا اثر ۳۹۰
[illegible] نفحات الانس جامی ۴۰۱

دیباچہ طبع دوم

"تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ اول کے دوسرے ایڈیشن پر ناچیز مصنف کتاب اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور میں بہ عجز از زبان ثنا خواں اور سپاس گذار ہے۔

اس حصہ کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت کئی سال کے وقفہ کے بعد آرہی ہے، لیکن اس کی وجہ کاتبوں کی نایابی، طباعت کی دشواریوں اور مصنف کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کے سوا کچھ نہیں، ورنہ یہ کتاب برصغیر ہند کے علمی و دینی حلقوں میں جس طرح مقبول ہوئی اور جس طرح اہل علم اور اہل قلوب نے اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا، اور اس کے پہلے ایڈیشن کے ختم میں جتنا طویل عرصہ گذر چکا ہے، اس سب کا قدرتی تقاضا تھا کہ اس وقت تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہوتے، لیکن اردو کتابوں کی طباعت میں اب جو دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں اور جن کا اندازہ کچھ مصنفین ہی کو ہے، انھوں نے اس کتاب کی اشاعت دوم میں غیر معمولی تاخیر پیدا کر دی، اس کے لیے مصنف کتاب متأسف بھی ہے، اور معذرت خواہ بھی۔

کتاب کے مضامین و مواد میں تعداد و عنوانات کے لحاظ سے کوئی بڑا اضافہ نہیں ہوا، لیکن جو کچھ ہوا وہ وقیع اور قابل لحاظ ہے، اور اس سے کتاب کی قیمت و افادیت میں ضرور اضافہ ہوتا ہے، ان میں دو اضافے ضرور قابل ذکر ہیں، ایک عنوان "فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش" کے تحت تاتاری حملہ اور اس کے اسباب کے مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے، اس میں (مصنف کی معلومات کی حد تک) اس وقت کے عالم اسلام کے اخلاقی سیاسی تر

دینی، روحانی اور سیاسی حالات کا بھی مرتب جائزہ دیا گیا ہے اور اس فتنۂ عالم آشوب اور طوفانِ بلاخیز کے باطنی اور خفی اسباب کو قرآن مجید کی مشعلِ ہدایت لے کر اور الٰہی قوانین اور تاریخ کی مدد سے معلوم کرنے اور ان کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مواد اور وقت دونوں کی کمی اور مصنف کی بعض مصروفیتوں کی بنا پر اس باب میں اضافہ اور ترقی کی بڑی گنجائش ہے، لیکن یہ ایک ابتدائی کوشش اور اس طرزِ فکر و نظر کا ایک نمونہ ہے جس کو بہت آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور یہ ہمارے موجودہ حالات میں بڑی عبرت و بصیرت اور درس و موعظت سے خالی نہیں،

دوسرا اضافہ مقدمۂ کتاب میں "دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی" کے زیرِ عنوان کیا گیا ہے جس میں مسیحیت اور بدھ مت کی اصلاح و تجدید کے سلسلہ میں کچھ نئے معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے، ان دو اضافوں کے علاوہ اس تیسرے ایڈیشن میں صرف پہلے ایڈیشن کے اغلاط کی تصحیح اور قلیل التعداد جزوی ترمیمات ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مصنف کی یہ سعی مقبول ہو، اس سلسلہ کی ترتیب میں جو حصے ابھی تک باقی ہیں اور جن کا تذکرہ "پیش لفظ" میں کیا گیا ہے ان کی تکمیل ہو۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی

[illegible]
[illegible] دوشنبہ

پیش لفظ

محرم ۱۳۷۴ھ میں لکھنؤ میں جماعت دعوت اصلاح و تبلیغ کی طرف سے انتظام کیا گیا کہ رفقاء کے سامنے ضروری عنوانات اور پہلوؤں پر تقریریں کی جائیں اور ان کی واقفیت اور ذہنی تربیت کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ ان تقریروں اور مضامین کا سلسلہ ایک ہفتہ جاری رہا۔ اس تربیتی ہفتہ میں ایک طویل اور مسلسل عنوان "اصلاح و تجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتیں" تھا۔ یہ عنوان راقم سطور کے حصہ میں آیا تھا اور تقریباً ایک ہفتہ اس موضوع پر بیان کیا جاتا رہا۔ اس وقت صرف ایک مختصر یادداشت سامنے ہوتی تھی جس میں کچھ عنوانات اور اشارے ہوتے تھے۔ احباب اس کا خلاصہ اپنے طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔

بعد میں اشاعت کی نیت سے جب اس پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ یہ کام بڑی توجہ اور اطمینان سے کرنے کا ہے اور یہ ایک اہم تاریخی موضوع ہے جس پر (ہمارے محدود علم کے مطابق) کوئی مفصل اور مکمل چیز موجود نہیں، اور یہ تاریخ اسلام اور ادبیات اسلامیہ کا ایک بڑا خلا ہے جس کو جلد پر ہونا چاہیے۔ اس خلا کے موجود ہونے کی وجہ سے اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہو چکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلا ہیں، جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کئی کئی سو برس کے بعد چند شخصیتیں ابھر آتی ہیں، جنھوں نے حالات سے کشمکش کی اور جو فکری اور عملی حیثیت سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں، ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، جو عصری اور دینی

حقیقت سے عہد انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے اور جن کے علمی و عملی کارناموں میں کوئی ندرت اور جدت نہیں پائی جاتی صرف چند گنی چنی شخصیتیں (جن کی تعداد ۱۰۰ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ بات دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دور رس ہیں، یہ اسلام کی اندرونی طاقت و صلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور مایوسی ہے، جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آدمی اور اہل دعوت و عزیمت کو پیدا کرتی رہی ہے اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی، یہ ایک احساس کمتری اور ذہنی شکست خوردگی ہے جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

لیکن یہ نتیجہ بے سبب نہیں، بدقسمتی سے تاریخ اسلام کے وسیع ذخیرہ میں یا تو وہ کتابیں ملتی ہیں، جن کو واقعات کی فہرست کہنا صحیح ہے اور جن کی مرکزی شخصیت بادشاہوں کی ذات ہے یا چند نمایاں شخصیتوں کی سوانح (تراجم و تذکرے) مگر اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مسلسل فکری اور اصلاحی تاریخ نہیں جس میں ان تمام شخصیتوں کی تحریکوں کا تعارف ہو جنھوں نے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اسلام کی بروقت حفاظت یا تجدید و تقویت کی خدمت انجام دی ہے، غلط رجحانات کی اصلاح اور فتنوں کا سد باب کیا ہے اور اسلام کے فکری اور علمی ذخیرہ میں کوئی قابل قدر اضافہ کیا ہے، درحقیقت اسلام کے سلسلۂ دعوت و اصلاح میں خلا نہیں، تاریخ اسلام کی ترتیب و تالیف میں خلا ہے، اس خلا کا پر کرنا وقت کا ایک ضروری کام اور ایک اہم دینی و علمی خدمت ہے۔

اس کام کی تکمیل سے نہ صرف اصلاح و دعوت کی تاریخ مرتب ہو جائے گی، بلکہ ضمناً مسلمانوں کی فکری و علمی انحطاط و ارتقاء کی تاریخ بھی وجود میں آجائے گی۔

لیکن جب اس موضوع پر قلم اٹھایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک مقالہ یا رسالہ کا مضمون نہیں ہے، یہ ایک اہم اور ضخیم تصنیف کا موضوع ہے، اس کے لئے تاریخ کو دوبارہ پڑھنا ہوگا، اور اس کو ایک خاص انداز سے مرتب کرنا ہوگا، اس کے لئے صرف تاریخ عام کا جائزہ لینا کافی نہ ہوگا، بلکہ مذاہب و فرق، علوم و فنون کی تاریخ اور تراجم و تذکرے کی کتابوں کو اس نظر سے دیکھنا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون جس سکون و اطمینان اور فرصت کا طالب ہے وہ اس

پریشان اوقات کی زندگی میں بہت کمیاب ہے، پھر بھی ضرورت کے احساس نے اس موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور طبیعت کی افتاد سرسری طور پر گذر نے سے مانع ہوئی۔

یہ بات ناظرین کرام کے پیش نظر رہے کہ اس کتاب میں ہمیں اصطلاحی تجدید سے بحث کرنا نہیں ہے، نہ ان اشخاص کا تعین کرنا ہے جو اس منصب کے اہل ہو سکتے ہیں، اور جن کی واحد ذات نے دینی انقلاب برپا کر دیا اور تجدید کے شرائط پورے کئے، یہاں ہمیں اسلام کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں اصلاح و انقلاب حال کی کوششوں کے تسلسل کو دکھانا ہے اور ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشان دہی کرنی ہے جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیاء اور تجدید اور اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے کام میں حصہ لیا ہے اور جن کی مجموعی کوششوں سے اسلام زندہ اور محفوظ شکل میں اس وقت موجود ہے اور مسلمان ہر وقت ایک ممتاز امت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، اس مضمون میں متعدد ایسے اشخاص کا تذکرہ آئے گا جو انفرادی طور پر تو مجدد نہیں کہے جا سکتے، مگر دین کی تجدید احیاء اور اصلاح و انقلاب کے مجموعہ میں ان کا ضرور حصہ ہے اور مسلمان ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے:۔

(۱) کسی دعوت یا شخصیت کے حالات و مقاصد معلوم کرنے کے لئے عموماً خود اس کی تصنیفات، تحریروں اور اقوال سے مدد لی گئی ہے، اگر اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی اور ضرورت ہوئی تو اس کے رفقاء و تلامذہ اور معاصرین کی تصنیفات و بیانات کو ترجیح دی گئی ہے، آخری صورت میں بعد کے مستند ماخذوں پر اعتماد کیا گیا ہے، اس بارے میں کسی زبان یا زمانہ کی تخصیص نہیں، جہاں کہیں کام کی بات ملی اس کو اخذ کر لیا گیا اور اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

(۲) شخصیتوں کی سیرت اور تذکرہ کے سلسلہ میں ان کے گرد و پیش، اس زمانہ کی علمی و فکری سطح اور کام کے میدان کی دشواریوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ ان شخصیتوں کی صحیح عظمت اور ان کی کامیابی کی مقدار کا تعین ہو سکے، اور اس دور اور ماحول کی کامیابی کے امکانات کا صحیح اندازہ کرکے ان کو تاریخ میں صحیح مقام دیا جا سکے، کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر اپنے ماحول میں لا کر اپنے زمانہ کے پیمانوں اور تقاضوں اور اپنے

ذاتی رجحانات اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے جس سے کتاب سطحی النظر لوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیع بن جاتی ہے لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی ناانصافی اور کوتاہ نظری ہے، اس لئے کہ آدمی اپنے زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں اور اس عہد کے میدان عمل کے حدود کے لحاظ سے کامیاب و ناکامیاب کہا جا سکتا ہے ورنہ ہر عظیم سے عظیم شخصیت دوسرے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اور مورخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت ناکام ثابت کی جا سکتی ہے اور نہ صرف اسلامی تاریخ، بلکہ انسانی تاریخ کی بھی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جا سکتی۔

(۳) کسی صاحب دعوت یا مصنف اور مفکر کی کتابوں کے چند مختصر اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا نہیں کی گئی کہ اس سے اس کے مقاصد، اس کے علمی مرتبہ اور اس کے ذہن کا اندازہ صحیح طور پر نہیں ہو سکتا، اور قارئین اس کا لطف صحبت اور شرف ملازمت حاصل نہیں کر سکتے، اس کتاب میں ممتاز صاحب دعوت، مصلحین، مصنفین اور اصحاب فکر کی تصنیفات و خطابات کے اتنے مختلف اور مبسوط اقتباسات دیئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا کچھ وقت ان کی صحبت میں گزرا، اور اس کو اطمینان کے ساتھ "دید و شنید" کا موقع ملا ہے، اس کے لئے خود مؤلف کتاب نے اپنے وقت کا ایک معتد بہ حصہ ان حضرات کی تصنیفات و مواعظ اور ان کے علمی و فکری آثار کے ماحول میں گزارا اور کوشش کی ہے کہ ان کا تذکرہ اور تعارف کرانے کے زمانہ میں وہ اپنا وقت خالص اسی ماحول میں گزارے اور ان اثرات و کیفیات کو اپنے اوپر طاری ہونے کا موقع دے جو ان کے معاصرین اور ہمنشینوں پر طاری ہوتی تھیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ قارئین مختلف شخصیتوں کے بارے میں مؤلف کتاب کا قلبی رجحان صاف معلوم کر سکیں گے اور ان کو زبان میں بھی تغیر اور صاحب ترجمہ کی زبان و ادب سے مناسبت نظر آئے گی، یہ بات اگر کسی نقاد کی نگاہ میں قابل اعتراض اور کتاب کی کمزوری شمار کئے جانے کے قابل ہے، اور اس کے نزدیک مورخ کو اپنے قلم کی طرح "چوب خشک" اور ناقل بے ضمیر ہونا چاہئے تو مصنف اس کمزوری کا اعتراف کرتا ہے اور اس کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا

(۴) تاریخی شخصیتوں کے صرف علمی کمالات، تحقیقات اور تصنیفات کے اقتباسات پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ ان کی زندگی کے باطنی پہلو، تعلق مع اللہ اور اخلاقی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے کہ اولاً تو یہ متقدمین اہلِ دعوت و اہلِ فکر کی مشترک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات اور علمی انہماک کے ساتھ عبادت و انابت الی اللہ کا ذوقِ خاص رکھتے تھے، اور ان کی کامیابی و مقبولیت میں اس کو خاص دخل ہے، اور اس کے تذکرہ کے بغیر ان کا تذکرہ نامکمل رہتا ہے، دوسرے اس ضخیم تصنیف اور تاریخ کے اس وسیع دفتر کے پڑھنے والے کا یہ حق اور اس کی محنت اور وقت کا یہ خاموش مطالبہ ہے کہ وہ اس سے صرف تاریخی معلومات ہی اخذ نہ کرے، بلکہ قلب و روح کی تازگی اور ذوقِ عمل کا حصہ بھی پائے۔

(۵) کسی شخصیت کے تعارف کے سلسلہ میں صرف اس کے فضائل و کمالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اگر اس کے منصف و محتاط معاصرین یا صاحبِ نظر متاخرین نے اس پر یا اس کی تصنیفات و افکار پر تنقید کی ہے تو اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے اور اگر اس کا جواب دیا گیا ہے اور اس کی طرف سے دفاع کیا گیا ہے تو اس کو بھی پیش کر دیا گیا ہے، لیکن تاریخ کو ناقدانہ تالیف ثابت کرنے کے لیے بے ضرورت تنقید نقل کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

یہ کتاب کی پہلی جلد ہے، پہلے خیال تھا کہ یہ جلد شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر تمام ہوگی، اس طرح اس حصہ میں پہلی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کی تاریخِ دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کی روداد آ جاتی لیکن ابن تیمیہ کا تذکرہ (ان کے زمانہ کی اہمیت اور ان کے کام کی وسعت کی بنا پر) اتنا مبسوط ہو گیا کہ اس کو کتاب کا ایک مستقل حصہ بنانا پڑا، جو اس سلسلہ کی دوسری جلد ہوگی، کتاب کا تیسرا حصہ (اور شاید چوتھا بھی) ہندوستان کے اہلِ دعوت و عزیمت کے ساتھ مخصوص ہوگا، جو پچھلی صدیوں میں عالم اسلام میں اصلاح و تجدید کے علمبردار اور فکر و تحقیق کا منبع و سرچشمہ تھے۔

آخر میں مؤلف کو صاف اعتراف ہے کہ اس کتاب کے لیے جتنی طویل مدتِ تصنیف، جیسا سکونِ خاطر،

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلی

[illegible] ربیع الاول [illegible]

مقدمہ

اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل

زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے اور اعلان کیا جا چکا ہے کہ

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ	آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا
نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا	اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت
(المائدہ ۳)	سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کر چکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہے۔ ع

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سدا جوان زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا ہے اس کی بنیاد اگرچہ ابدی عقائد و حقائق پر ہے مگر وہ زندگی سے پر ہے اور حرکت اس کی رگ و پے میں بھری ہوئی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت بھی رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے اور کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا نقش قدیم نہیں جو اس دور کی یادگار ہونے کے ناطے محفوظ ہو اور اپنی زندگی کھو چکا ہو بلکہ ایک زندہ دین ہے جو علیم و حکیم صانع کی صنعت کا

بہترین نمونہ ہے۔

ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۱) — یہ اندازہ ہے غالب اور علم رکھنے والے کا۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ — کاریگری اللہ کی جس نے ہر چیز کو محکم کیا

امت اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پر از تغیرات ہے

چونکہ یہ آخری اور عالمگیر دین ہے اور یہ امت آخری اور عالمگیر امت ہے، اس لئے یہ بالکل فطری بات تھی کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ پڑے گا اور جتنی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا وہ کسی دوسری امت کو دنیا میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ پر از تغیرات اور پر از انقلابات ہے اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

اسلام کے بقا اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور زمان و مکان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکمل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو ہر شکست اور ہر تبدیلی کا کامیاب مقابلہ کر سکتی ہیں اور جن میں ہر زمانے کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے اور اس امت کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ وہ اس دین کو ہمیشہ زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے اور جو ہمیشہ اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، یہ [illegible] جاہلیت کے پیدا کردہ [illegible] کا [illegible] سے مقابلہ کریں گے [illegible] اور یہ امت [illegible] میں [illegible] انقلابات [illegible]

پیدا اتنی مقدار و تعداد میں کئے کہ جس دور میں جس صلاحیت و قوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور جس مرض کا جو تریاق کی حاجت تھی وہ اس امت کو عطا ہوا۔

۱۔ اسلام کے قالب و جگر پر حملے

تاریخ میں اسلام کے قالب و جگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرا مذہب ان کی تاب نہ لاسکتا۔ دنیا کے دوسرے مذاہب جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کرلی تھی اس سے کم درجہ کے حملوں کو برداشت نہ کرسکے اور انھوں نے اپنی ہستی کو گم کردیا لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی اور اپنی اصلی شکل میں زندہ رہا۔ ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں اسلامی روح اور اس کے نظام عقائد کے لئے سخت خطرہ تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لئے صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا، اگر کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھو دیتا اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا، لیکن اسلام ان سب داخلی و خارجی حملوں کو برداشت کر گیا اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں۔ تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات، مشرکانہ اعمال و رسوم، مادیت، نفس پرستی، تعیشات، الحاد و لادینیت اور عقلیت پرستی کا اسلام پر بارہا حملہ ہوا اور کبھی کبھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لاسکے اور ان کے سامنے سپر ڈال دے لیکن امت مسلمہ کے ضمیر نے صلح کرنے سے انکار کردیا اور اسلام کی روح نے شکست نہیں کھائی، ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنھوں نے تحریفات و تاویلات کا پردہ چاک کردیا اور حقیقت اسلام اور "دین خالص" کو آشکارا کیا۔ بدعات و عجمی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پرزور حمایت کی، عقائد باطلہ کی بے باکانہ تردید اور مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگائی، تعیشات اور اپنے زمانہ کے "مترفین"[1] کی مذمت کی اور جابر سلاطین کے سامنے

---

[1] پر تکبر دولت مندوں اور متعیش امیروں اور بے فکر لا ابالی لوگوں کو قرآن مجید مترفین کے لفظ سے یاد کرتا ہے

نعرۂ حق بلند کیا، عقلیت پرستی کا طلسم توڑا اور اسلام میں نئی قوت و حرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کر دی۔ یہ افراد دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے اور طاقتور اور دلآویز شخصیتوں کے مالک تھے۔ جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لئے ان کے پاس کوئی نہ کوئی "ید بیضا" تھا جس سے انھوں نے تاریکی کا پردہ چاک کر دیا اور حق روشن ہو گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہے اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امت سے لینا ہے اور جو کام وہ پہلے تازہ نبوت اور انبیاء سے لیتا تھا، اب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نائبین اور امت کے مجددین و مصلحین سے لے گا۔

دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی

اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہے جو ان مذاہب میں نئی روح اور ان کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کر دیں۔ ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں جن میں اس دین کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا، جو اس دین کو تحریفات و بدعات کے نرغہ سے نکالے، اس کی حقیقت واضح کرے، اصل دین اور حقیقتِ ایمان کی طرف پوری قوت سے دعوت دے، رسوم کے خلاف پُرزور صدائے احتجاج بلند کرے، مادیت و نفس پرستی کی تحریک و رجحانات کے خلاف جہاد کرنے کے لئے کمربستہ ہو کر میدان میں آجائے اور اپنے یقین، سچی روحانیت اور قربانیوں سے اس مذہب کے پیروؤں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دے۔

اس کی سب سے بڑی مثال مسیحیت ہے، وہ اپنے عہد کے آغاز یعنی پہلی صدی مسیحی کے نصف ہی میں ایسی تحریف کا شکار ہوئی جس کی نظیر اس دور کی تاریخ مذاہب میں کہیں نہیں ملتی۔ وہ ایک صاف اور سادہ توحیدی مذہب سے ایک ایسے مشرکانہ مذہب میں تبدیل ہو گئی جس کو یونانی اور بودھ افکار و خیالات کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سب سے بڑے داعی اور پیرو سینٹ پال (۱۰-۶۵ء) کے ہاتھوں ہوا۔ یہ تبدیلی دراصل ایک روح سے دوسری روح، ایک شکل سے دوسری شکل اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف ایک ایسی جست یا چھلانگ کے مرادف تھی جس میں

اپنی اصلی شکل سے صرف نام اور بعض رسوم کا اشتراک باقی رہ گیا تھا۔ ایک جرمن فاضل (ERNEST DE BUNSEN) اس تغیر و انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> مسیحی عقیدہ اور نظام کا جو ذکر انجیلوں میں ملتا ہے اس کی بابت حضرت مسیح نے اپنے قول و عمل سے کبھی بیان نہیں کی
> اس وقت غیر یہودی اور یہودی عیسائیوں کے درمیان جو نزاع قائم تھا اس کی ذمہ داری حضرت مسیح کے سر نہیں ہے
> بلکہ سینٹ پال یا یہودی عیسائی جو سینٹ پال کا کرشمہ ہے نیز مسیحی عقیدہ کی تشکیل قدیم کے طریقہ پر تقریباً دو صدیوں میں
> مجوسیوں اور بت پرستوں سے حضرت مسیح کا مقصد تھا پال نے اسٹیفن (STEPHEN) کو ختم کر کے جو مذہب پیدا کیا (ESSENIANS)
> کا اصول ہے حضرت مسیح کے ساتھ بہت سی بدعات و رسوم وابستہ کر دی گئیں انجیل میں جو تضاد و مناقشات اور واقعات ملتے
> ہیں اور جو حضرت مسیح کو ان کے مرتبہ سے بہت زیادہ شکل میں پیش کرتے ہیں وہ سب پال کے مسیح کے ہوتے ہیں حضرت
> مسیح کے نہیں بلکہ پال اور ان کے بعد آنے والے یہودی مذہب اور نے اس سارے عقیدہ و نظام کو مرتب کیا ہے
> جس کو آج پوری مسیحی دنیا نے اٹھارہ صدیوں سے اپنے عقیدہ کی اساس قرار دے رکھا ہے۔[1]

مسیحیت نے طویل صدیوں تک اور آج بھی پال کی اس روح اور اس کے ورثہ کو سینے سے لگائے رکھا اور اس پوری مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا جو مسیحیت کے اس بیرونی مستعار اور غیر منطقی نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور اس نقطہ کی طرف واپسی کی کوشش کرے جس نقطہ پر حضرت مسیح اور ان کے مخلص خلفاء اور متبعین چھوڑ کر گئے تھے صدیوں پر صدیاں بیت گئیں اور کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا جو مسیحیت کے ان نئے اور بیرونی اجزاء کو علیحدہ کر سکے آخر کار سولہویں صدی عیسوی میں مارٹن لوتھر (MARTIN LUTHER) جرمنی میں پیدا ہوا اور اس نے بعض جزئی مسائل میں کچھ محدود قسم کی اصلاح کی یہ کوئی جوہری یا اصولی اصلاح نہ تھی اور نہ مسیحیت کے نظام اور اس کے انحرافات کے خلاف کوئی بغاوت گویا مسیحیت کی تاریخ تقریباً بیس صدیاں انقلاب انگیز بنیادی اور کامیاب اصلاح مذہب کی تحریکوں سے خالی رہی اور اس بارے میں کوئی کوشش بھی پورے طور پر بار آور اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی

---

[1] ISLAM OR TRUE CHRISTIANITY P. 128

فضلاء کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس طویل مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی شخصیت یا تحریک رونما نہیں ہوئی جو مسیحیت کی اصلاح یا تجدید میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار (J. BASSMULLINGER) لکھتا ہے:۔

"اگر ہم اس کے اسباب تلاش کریں کہ سولھویں صدی سے قبل اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی کوششوں میں جزوی کامیابی بھی کیوں نہ ہوئی تو بلا کسی دشواری کے کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑا سبب قرون وسطیٰ کے ذہن کی اصلی کمزوریوں کی غلامی تھی۔"[1]

دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"چرچ کی اصلاحات کی کوئی جماعت خواہ کتنا زور لگاتی رہی ان کی مسلسل کوششوں کی ناکامی یورپین تاریخ کی ایک بدیہی حقیقت ہے۔"[2]

یہی مقالہ نگار آگے لکھتا ہے:۔

"سولھویں صدی سے قبل اصلاح مذہب کی چند نہیں متعدد اور بعض بہت پائدار قسم کی کوششیں کی جا چکی تھیں لیکن بلا استثناء سب کو کلیسا کی لعنت و ملامت کا شکار ہو جانا پڑا تھا۔"[3]

اس کے بعد کوئی دوسرا شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو کلیسا کے خرافات و اوہام اور اس کی زبردستیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا، اور کم از کم اتنا ہی کرتا جتنا لوتھر نے (اپنے مخصوص دائرۂ عمل اور کمزوری کے باوجود) کیا تھا۔

غرض اس طرح مسیحیت اس راستہ پر مسلسل چلتی رہی جس کو اس نے اپنے لئے انتخاب کیا تھا، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کے سر تھوپ دیا گیا تھا کلیسا کا اثر کم پڑ گیا، اور بعد میں اس کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا، یورپ میں مادیت کی حکومت قائم ہوئی، اور اس نے اس اصل مذہب کی جگہ لے لی، اور محرف مذہب کو اس نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا، اور مسیحیت میں کوئی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا جو اس مادیت کا مقابلہ کرتا، اور اس کو اپنے صحیح مرکز پر واپس لاتا یا

---

[1] ENC. BRITTANICA-ED XI VOL. XX P.338
ARTICLE BY J.B. MULLINGER.

[2] ایضاً ص ۳۳۹ [3] ایضاً ص ۳۳۹

عیسائیوں میں اپنے مذہب پر اعتماد کو بحال کرتا، ان سب میں وہ روحانی و اخلاقی قوت پیدا کرتا جو ان کو مادیت کے ان زبردست تھپیڑوں اور ایمان سوز ترغیبات کے سامنے ثابت قدم رکھ سکے، اور ان کو ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کر سکے جو علم و اخلاق اور صحیح عیسائی تعلیم پر قائم ہو اور جہاں تک زندگی کے سوالات اور عصر جدید کے مسائل کا حل اس کی روشنی میں ممکن ہو، اس کے برعکس یہ ہوا کہ عیسائی مفکرین و مصنفین مسیحیت کے مستقبل سے مایوس ہو گئے، اور لادینی و مادیت کے مقابلہ میں ان کے اندر احساس کمتری پیدا ہو گیا۔

یہی قصہ مشرق کے مذاہب کے ساتھ بھی پیش آیا، ہندو مذہب بھی اپنی اصل راہ سے بالکل ہٹ گیا، اس نے اپنی سادگی اور عالم کائنات سے براہ راست روحانی نسبت بالکل کھو دی، اخلاقی قوت بھی مفقود ہو گئی اور اپنی پیچیدگی کی وجہ سے وہ محض ایک دقیق اور ناقابل عمل فلسفہ بن کر رہ گیا، اور رفتہ رفتہ عقائد میں توحید خالص، و معاملات میں مساوات دونوں اہم چیزوں کا سررشتہ اس کے ہاتھ سے بالکل چھوٹ گیا، اور یہی وہ دو اہم بنیادیں تھیں جن پر کوئی ایسا مذہب قائم ہو سکتا ہے جس کی جڑیں باطن میں مضبوط ہوں اور شاخیں ظاہر میں پھیلی ہوئی ہوں۔

اپنشد کے مصنفین نے بہت کوشش کی کہ اس فساد کا تدارک کریں، چنانچہ انھوں نے ان رسوم کو جو ہندو مذہب اور ہندو سماج پر پوری طرح چھا گئی تھیں مسترد کر دیا اور اس کی جگہ ایک ایسے فلسفیانہ اور تصوفانہ نظام کو پیش کیا جو کثرت میں وحدت کے نظریہ پر قائم تھا، یہ نئی تصویر ہندو مذہب کے علمی حلقوں میں تو ضرور پسند کی گئی اس لئے کہ ان کا رجحان شروع ہی سے وحدۃ الوجود ہمہ اوست کی طرف تھا، لیکن عوام نے جن کی فکری سطح پست تھی اور جو عملی نظام اور عملی تعلیمات کے خواہشمند تھے، اس بات کو قبول نہ کیا، اور اس طرح ہندو مذہب رفتہ رفتہ اپنی قوت و تاثیر کھوتا گیا، اس کی طرف سے بے اطمینانی اور بے اعتقادی روز بروز بڑھنے لگی، ہندو ذہن کی یہی بے اطمینانی اور بے چینی تھی جس نے آگے چل کر بدھ کی شخصیت میں جنم لیا، یہ مرحلہ چھٹی صدی قبل مسیح میں سامنے آیا۔

بدھ نے ایک نیا فکر یا ایک نیا مذہب (اگر اس موقع پر لفظ مذہب کا استعمال درست ہو) پیش کیا جو ترک دنیا، تہذیب نفس، خواہشات سے مقابلہ، رحمدلی و ہمدردی، خدمت، عمل اور رسوم و عبادات و طبقاتی تقسیم

کی تردید و مخالفت پر قائم تھا جو ہندو سماج میں آخر زمانہ میں بہت نمایاں ہو گئی تھی، یہ فکر یا یہ مذہب[1] بہت سرعت کے ساتھ پھیلا، اور ایشیا کے جنوبی اور مشرقی حصہ پر جو چین، تبت اور جزائر انڈونیشیا کے درمیان واقع ہے اس کا تسلط قائم ہو گیا۔

لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ زبردست مذہبی تحریک بھی اپنے راستہ سے ہٹ گئی اور تحریف کا شکار ہو گئی، مورتیاں اور رسوم وغیرہ جن کے خلاف اس مذہب نے علم بغاوت بلند کیا تھا اس پر پھر سے حملہ آور ہوئے یہاں تک کہ اس کے آخر دور میں وہ بھی شرک اور مورتی پوجا کا مذہب بن کر رہ گیا جیسا کہ پیشرو ہندو مذہب، مورتیوں کی اقسام اور ان کی تعداد کے سوا کسی اور چیز میں مختلف اور ممتاز نہ تھا، اس کی اخلاقیات کو بھی زوال ہوا، افکار و خیالات میں پیچیدگی بڑھ گئی، نئے نئے فرقے اور مذہبی گروہ قائم ہو گئے، پروفیسر ایشوری ٹوپا اپنی کتاب "ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں:-

> "بدھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قائم ہوئی جس میں اوتاروں کی بھرمار اور مورتی پوجا کا دور دورہ تھا، اعلیٰ بے لگام بھکشوؤں کی فضا بن رہی تھی، اس میں بدعتیں اور جوگیوں کے سوا کچھ فرق نہیں۔"[2]

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "تلاش ہند" (DISCOVERY OF INDIA) میں بدھ مت کے بگاڑ اور تدریجی زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "برہمنیت نے بدھ کو اوتار بنا لیا اور بدھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ بہت دولت مند ہو گئے اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے، ان میں ضبط و نظم باقی نہیں رہا، عبادت کے طریقوں میں جادو اور وہم داخل ہو گئے اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ زندہ رہنے کے بعد بدھ مت کا تنزل شروع ہو گیا، اس عہد میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی، (MRS RHYS DAVIDS) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:-
>
> "ان مریضانہ خیالات کے گہرے سایہ میں گوتم کی اخلاقی تعلیم نظروں سے اوجھل ہو گئی، ایک نظریہ پیدا ہوا اور اس نے ترقی پائی، اس کی جگہ دوسرے نے لی اور ہر ایک نظریہ پہلے سے بڑھ کر بناوٹی تھا، یہاں تک کہ ساری فضا

---

[1] بدھ مت کے لئے لفظ مذہب کے استعمال میں مجھے تردد اس لئے ہے کہ اس میں خدا و معبود کا کوئی تصور نہیں ملتا اور اکثر مستشرقین و محققین کی یہی رائے ہے کہ بدھ نے خدا کا انکار کیا تھا (BUDDHA).

[2] ہندوستانی تمدن اردو ایڈیشن ٹوپا.

ذہن کی ان پُر فریب تخلیقوں سے گھٹاٹوپ اندھیرا چھا گیا اور بانیٔ مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان الہیاتی موشگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے۔[1]

عمومی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں میں گراوٹ پیدا ہوگئی اور ان میں اکثر جاہلانہ رسوم داخل ہوگئیں اور دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا، اس وسیع بودھ دنیا میں اور اس کی حکمرانی کی اس طویل مدت میں کوئی ایسا مصلح سامنے نہ آیا، جو حقیقی بودھ مت کی طرف دعوت دے اور اس جدید اور محرّف مذہب کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے اور اس کا گذشتہ دورِ شباب اور اس کی گم شدہ سادگی اور صفائی پھر سے واپس لے آئے۔[2]

غرض قدیم ہندو مذہب بودھ مت کے سامنے بالکل پنپ نہ سکا، یہاں تک کہ آٹھویں صدی مسیحی میں شنکر آچاریہ[3] نے بودھ مت کی مخالفت اور قدیم ہندو مذہب کی اشاعت کا علم بلند کیا، اور آخر کار اس کو اس ملک سے تقریباً باہر ہی کر دیا، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حیثیت ہندوستان کے بہت سے مذاہب میں ایک قدیم رو بزوال اور محدود مذہب کی رہ گئی، شنکر آچاریہ نے اپنی ذہانت، مذہبی جرأت اور جوشِ عمل سے یہ تو کیا کہ بودھ مت کو بالکل زندگی سے بے دخل کر دیا، لیکن وہ اس باب میں کامیاب نہ ہوئے (بلکہ شاید اس کا انھوں نے سرے سے ارادہ ہی نہیں کیا تھا) کہ قدیم ہندو مذہب کو اس کی پہلی اور حقیقی شکل پر واپس لے آئیں، اس میں توحید کا عقیدہ، خالقِ کائنات سے براہِ راست اتصال، بندہ اور خدا کے درمیان واسطوں کی نفی، اجتماعی انصاف اور طبقاتی مساوات کی روح پیدا کریں، چنانچہ آج تک یہ دونوں ہندوستانی مذاہب اپنی بدلی ہوئی ہیئت پر قائم ہیں اور دورِ انحطاط کی میراث رسوم و عادات اور مورتیوں کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہیں، مذاہب و اخلاق کے انسائیکلوپیڈیا (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS) کے مقالہ نگار (V.S. GHATE) جو الفنسٹن کالج بمبئی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے اور ہندوستان کے قدیم مذاہب و فلسفوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، شنکر آچاریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اس نظام مذہب اور فلسفہ کا زندہ کرنا تھا جس کی اوپنشد میں تعلیم دی گئی ہے"

---

[1] ثقافۃ الہند ص ۲۰۱، ۲۰۲ [2] ایضاً ص ۲۰۲، ۲۰۳ [3] شنکر آچاریہ آٹھویں صدی کے نصف آخر میں گزرا ہے، ۳۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا

اس نے مطلق وحدۃ الوجود کے فلسفہ کو رائج کر دیا، اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ وہ یہ بتائے کہ اوپنشد اور بھگوت گیتا میں تناقض نہیں ہے، بلکہ محض وحدۃ الوجود کی تعلیم ہے۔ شنکر آچاریہ نے بت پرستی کی مخالفت کی اور نہ مذمت کی، اس کے نزدیک بت ایک رمز اور مظہر ہیں۔ شنکر آچاریہ نے رسمیت (RITUALISM) اور کرم کانڈ کی مذمت کی لیکن مقبول عام دیوتاؤں کی پرستش کی طرف سے مدافعت کی، اپنے نشوونما کی ایک خاص منزل میں یہ ہماری فطرت کی ایک ضرورت ہے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے تو پھر بت پرستی کی ضرورت نہیں رہتی، تو علامات اور رموز کو ترک کر دینا چاہیے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے، شنکر دیوتاؤں کی عبادت کو روحانیت کی ایک علامت کے ان لوگوں کے لیے جو ایسے ہیں جنھوں نے مرتبہ کمال نہیں پہنچ سکے جو صفات سے آزاد اور ناقابل بیان ہے[1]

بہر حال وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں جو شنکر آچاریہ سے لے کر دیانند سرسوتی اور ’’آریہ سماج‘‘ تک کی گئیں، اور جن کا مقصد اس مذہب کا اس کی ان صحیح بنیادوں پر احیا تھا جو نبوت کی دعوت انسان کی فطرت سلیم اور تغیر پذیر عہد کے ساتھ ہم آہنگ ہو، ان دونوں مذاہب نے آخر کار مادیت و لادینیت کے سامنے بالکل سپر ڈال دی ہے اور زندگی سے کنارہ کش ہو کر عبادت گاہوں اور تیرتھ گاہوں میں پناہ لی ہے اور رسوم و عادات اور ظاہری اشکال میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہندوستان میں اس وقت کوئی ایسی طاقتور دعوت نہیں جس کا نعرہ اور جس کا شعور یہ ہو (لادینیت سے مذہب کی طرف آؤ) اس کے برعکس ایسی تحریکیں بہت بیدار اور طاقتور ہیں جن کا نعرہ اور اصول یہ ہے کہ اپنی پرانی تہذیب کو زندہ کرو، اور ہندوستان کی قدیم تاریخی زبان ’’سنسکرت‘‘ کو پھر سے ملک میں رائج کرو۔

مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت

دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں

---

[1] ماخوذ از مقالہ شنکر آچاریہ باختصار و انتخاب ملاحظہ ہو۔
ENC. OF RELIGION AND ETHICS—FOURTH EDITION, 1959
ARTICLE SANKARACHARYA.

زندہ رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا، جب تک وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوتِ عمل پیدا کر دیں، زندگی کے تقاضے ہر وقت جواں ہیں، مادیت کا درخت سدا بہار ہے، نفس پرستی کی تحریک اور اس کے مذہب کو حقیقتاً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں، پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پُرجوش داعیوں اور کامیاب مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی، جنھوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔ ع

اگرچہ پیر ہے مومن جواں ہیں لات و منات

اس کا مقابل جب ایک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا، اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی رہے گی، تازہ دم مادیت کے مقابلہ میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

ہر نئے فتنہ اور نئے خطرے کے لئے نئی شخصیت و طاقت

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کے اس طویل اور پُرآشوب تاریخ میں کوئی قلیل سے قلیل مدت ایسی نہیں پائی جاتی جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہو گئی ہو، حقیقتِ اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو، امتِ اسلامیہ کا ضمیر بالکل بے حس ہو گیا ہو اور تمام عالم اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لئے کوئی فتنہ نمودار ہوا، اس کی تحریف اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی، یا اس کو غلط طریقہ پر پیش کیا گیا، مادیت کا کوئی سخت حملہ ہوا، کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آ گئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور اس کو میدان سے ہٹا دیا، بہت سی، قومیں اور تحریکیں ایسی ہیں جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں، لیکن آج ان کا وجود صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، ان کی حقیقت کا سمجھنا بھی آج مشکل ہے کتنے آدمی ہیں جو قدریہ، جہمیت، اعتزال، خلق قرآن

وحدۃ الوجود اور اکبر کے دین الٰہی کی حقیقت اور تفصیلات سے واقف ہیں، حالانکہ یہ اپنے اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد و مذاہب تھے، ان میں سے بعض کی پشت پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں اور اپنے زمانہ کے بعض بڑے ذہین اور لائق اشخاص ان کے داعی اور علمبردار تھے، لیکن بالآخر حقیقتِ اسلام نے ان پر فتح پائی اور کچھ عرصہ کے بعد یہ زندہ تحریکیں اور سرکاری مذہب علمی مباحث بن کر رہ گئے، جو صرف علم کلام اور تاریخ عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں، دین کی حفاظت کی یہ جد و جہد، تجدید و انقلاب کی کوشش اور دعوت و اصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی اسلام کی تاریخ اور ایسا ہی مسلسل ہے جیسی مسلمانوں کی زندگی۔

تاریخ کے گم شدہ مآخذ

لیکن اس کی ذمہ داری صرف مورخین پر عائد نہیں ہوتی اس کے ذمہ دار وہ تمام لوگ ہیں، جو تاریخ کی اصطلاحی اور سرکاری حیثیت کے سوا کوئی اور حیثیت ماننے پر تیار نہیں، اور کسی ایسی کتاب کو لائق اعتبار نہیں سمجھتے جو کسی کتب خانہ میں تاریخ کی الماری کے اندر نہ ہو یا فن تاریخ کے تحت درج نہ ہو، حالانکہ ایسی بہت سی کتابیں اپنے اندر تاریخ کا بہت قیمتی ذخیرہ رکھتی ہیں اور ان کو بہت اہم مآخذ قرار دیا جاسکتا ہے، یہ وہ ادبی اور دینی کتابیں ہیں، جن میں ان داعیوں اور مصلحین امت نے اپنی دلی احساسات و کیفیات کو بے نقاب کیا ہے اور اپنی زندگی کے اہم واقعات اور تجربے درج کئے ہیں، یہ وہ کتابیں ہیں جن میں شاگردوں اور مریدوں نے اپنے اساتذہ و شیوخ کے نصائح و ملفوظات اور حقائق و معارف قلم بند کئے ہیں اور ان کی پُراثر اور بابرکت مجلسوں کی روداد پیش کی ہے، یہ مکتوبات اور مواعظ کے وہ مجموعے ہیں جن سے ان کے خیالات و افکار اور جذبات و کیفیات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، یا وہ کتابیں ہیں جو اخلاقِ سوسائٹی پر تنقید اور بدعات و منکرات کے رد و ابطال میں لکھی گئی ہیں، اگر ہمارا مطالعہ اپنی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ کر ان اہم اور گم شدہ تاریخی مآخذ تک وسیع ہوسکتا اور کوئی وسیع النظر نکتہ رس اور باہمت محقق اس موضوع پر جم کر کام کرسکتا تو ایک مربوط و مکمل تاریخ اصلاح و تجدید پیش کرنے میں کامیاب ہوجاتا، اور ہمیں صاف نظر آتا کہ

دعوت و عزیمت دونوں ہی چیزیں ہمیشہ اس امت کے ہمراہ رہیں، ہر دور میں اس کا ساتھ دیتی رہیں اور انھوں نے کبھی اس کو [illegible] محروم نہیں کیا۔

اسلام کی میراث

یہ میراث جو ہم سے [illegible] اور جس کو ہم میراث کے معنی میں تعبیر [illegible] کو مطلوب ہے [illegible] وہ میراث ہے کہ وہ دولت اور ثروت [illegible] ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہماری طرف منتقل ہوئی ہے، عظیم [illegible] و عقائد و افکار، کتاب و سنت، صحیح اخلاق عالیہ، تعلیم و تربیت اور [illegible] اسلامی روح کی ثروت [illegible] میراث میں ہر اس فرد کا پورا حصہ ہے جس نے اسلام کے کسی دور میں بھی [illegible] حکومت کا [illegible] جاہلیت اور بدعت کا مقابلہ کیا [illegible] دعوت دی، اسلام کے خلاف [illegible] ان کا مقابلہ کیا، امت میں ایمانی روح پیدا کی [illegible] زوال [illegible] [illegible] کا [illegible] اس کے [illegible] اور اس کی میراث [illegible] سنبھال لیا، اسلام کی حقیقی روح کی حفاظت کی اور امت [illegible] امت کے لئے [illegible] دین اور [illegible] دین کی حفاظت کی [illegible] کا کام [illegible] دروازہ کھولا اور امت [illegible] کا [illegible] کا منظم [illegible] قرآن [illegible] اور [illegible] روح پیدا کی [illegible] اسلام کی [illegible] دین میں [illegible] شبہات کے دور میں اضطراب عقائد کے زمانہ میں علمی طور پر استدلال [illegible] کرنے کی کوشش کی [illegible] دعوت و تذکیر [illegible] علم و [illegible] کی نیابت کی [illegible] [illegible] اس کی [illegible] اور [illegible]

سے محفوظ رکھا، جس نے اس امت کی سیاسی قوت کی حفاظت کی اور اس کو پے در پے تاتاری [illegible] سہارا دینے کی قوت عطا کی، جس نے اپنی شاندار دعوت اور اپنے دام محبت سے اس وحشی کو شکار کیا جو زور شمشیر اور ملک گیری سے بھی زیر نہ ہو سکتا تھا، اور جس نے عالم اسلام کو اس سرے سے اس سرے تک زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا، جس نے اپنے [illegible] اور اپنی روحانی قوت سے ایسے وحشیوں کو حلقۂ اسلام میں داخل کیا اور محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی کا خرقہ پہنایا، جس نے اپنے طاقتور ادب اور دل آویز و بلیغ اشعار سے ان ذہنوں کو اسیر و رام کیا جو علمی مباحث اور مذہبی فلسفوں سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے، یہ بڑا ایک سلسلہ ہے اور ان میں ہر شخصیت کا ایک خاص حصہ اور مرتبہ ہے، تاریخ دعوت و اصلاح امانت کی ادائیگی اور حق شناسی اور اعتراف حقیقت کا تقاضا ہے کہ ہم [illegible] کی کسی نہ کسی سرحد کا محافظ اور اسلام کے ترکے کا ایک قیمتی ذخیرہ تھا، اگر ان لوگوں کی خدمات اور شخصیتیں نہ ہوتیں جن کو آج ہم تاریخ کی دوربین سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں تو آج تک یہ عظیم مذہب پہنچ پاتا، نہ ہمارے لئے عزت، عبرت اور عظمت کا وافر سامان موجود ہے اور جس کی موجودگی میں ہم اقوام عالم کے سامنے فخر کے طور پر اپنا سر بلند رکھ سکتے ہیں۔

اس سلسلہ [illegible] ان خطوط پر جو صدی کے نزدیک [illegible] سلسلہ ہے [illegible] یہاں ان اہم شخصیتوں کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جنہوں نے دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کے میدان میں کوئی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ وباللہ التوفیق

پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں

اور

عمر بن عبدالعزیزؒ

عہد اموی میں جاہلی رجحانات و اثرات

خلافتِ راشدہ کے اختتام اور بنی امیہ کی حکومت کے آغاز نے (جو اسلامی سے زیادہ عربی تھی) ایک جدید انقلاب کی فوری ضرورت پیدا کر دی، قدیم جاہلی رجحانات جو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی صحبت و تربیت اور خلافتِ راشدہ کے اثر سے دب گئے تھے، نیم تربیت یافتہ نسلوں اور نئی عربی نسل میں ابھر آئے، حکومت کا محور جس پر اس کا پورا نظام گردش کرتا تھا، کتاب و سنت نہیں رہ گئی بلکہ عربی سیاست اور مصالح ملکی بن گیا تھا، عربی عصبیت کی وہ روح جس کو اسلام نے زیر پا کر دیا تھا، پھر بیدار ہو گئی، عرب میں پرانی قبائلی چودھراہٹ آ گئی، قبائلی غرور، خاندانی عصبیت، دولت، جاہ پروری جو خلافتِ راشدہ میں عیب اور معصیت شمار ہوتی تھی، ہنر اور محاسن بن گئے، اعلانِ فسق، منکرات کا ارتکاب جرأت سے، جاہلی شاعری، مدح و تعریف اور تفاخر عام ہو گئے۔

---

[1] اس عصر کی جاہلیت کا [illegible]

[illegible]

بیت المال (جو مسلمانوں کے پیسہ پیسہ سے جمع ہوتا تھا) خلیفہ کی ذاتی ملکیت اور خاندانی جاگیر بن گیا تھا، پیشہ ور شعراء خوشامدی درباریوں اور آبرو باختہ مصاحبین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا جس پر مسلمانوں کی دولت بے دریغ صرف ہوتی تھی اور ملک کی بے عنوانیوں سے چشم پوشی کی جاتی تھی[1] گانا سننے کا ذوق اور موسیقی کا شوق عام ہو چکا تھا[2] حکومت کی غلط روی اور اہلِ حکومت کی بے دینی زندگی سے پوری اسلامی سوسائٹی متاثر ہو رہی تھی[3] اور مترفین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کے اخلاق قدیم مترفین سے ملتے جلتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھر عصبیت جاہلیت اپنے فاتح حریف سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے اور چالیس برس کا حساب ایک دن میں پورا کر لینا چاہتی ہے۔

عہدِ اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر

خلافتِ امویہ کے اس مادی اقتدار اور اس کے تمدنی اثرات کے باوجود اس عہد تک دین کا وقار اور اس کا اخلاقی اثر کسی حد تک مسلمانوں کی زندگی میں قائم تھا، یہ دینی وقار اور اخلاقی اثر ان اشخاص کی بدولت تھا جو دینی و علمی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے اور اپنی للہیت، اخلاص، بے نفسی اور علم و تقویٰ میں مشہور و معروف تھے، حکومت و سیاست کے دائرہ سے باہر ان حضرات کا اثر و اقتدار عام تھا، اسی اثر اور قلبی احترام کی وجہ سے مسلمان بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے اور مادیت کے سیلاب میں بالکل بہہ جانے سے رکے ہوئے تھے، ان دینی شخصیتوں میں سب سے بااثر اور محبوب شخصیت حضرت علی بن الحسین (زین العابدین علیہ وعلیٰ آبائہ السلام) کی تھی جو عبادت و تقویٰ اور زہد و ورع میں اپنی نظیر نہیں

---

[1] [illegible] یہ ہوا تھا کہ [illegible] اس کو بڑی مشکل سے نکالا گیا [illegible] شہرت ہوئی [illegible] اس [illegible] کے مقابلہ میں [illegible] حاصل کی [illegible] تعلیم کروایا (از [illegible])

[2] مدینہ کا مشہور مغنی [illegible] (م ۱۰۵ھ) خلیفہ عبدالملک بن مروان کی مجلس میں اس شان سے آیا کہ [illegible] داڑھی میں [illegible] شراب کے قطرے ٹپک رہے تھے [illegible] (الاغانی ج ۸ ص ۹۹)

[3] اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک مرتبہ [illegible] کا مشہور مغنی حنین اپنے [illegible] کی دعوت [illegible] مجلس میں اس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا، سننے والوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ چھت بیٹھ گئی اور حنین دب کر مر گیا۔

(الاغانی ج ۲ ص ۱۲۲، ۱۲۳)

رکھتے تھے مسلمانوں کو ان کے ساتھ جو تعلق تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں طواف کے لئے آیا، کثرت ہجوم کی وجہ سے وہ حجر اسود تک نہیں پہونچ سکا، اور اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ مجمع کچھ کم ہو تو وہ استلام کرے[1] اس درمیان میں حضرت علی بن الحسین آئے ان کا آنا تھا کہ مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا اور انھوں نے بآسانی طواف و استلام کیا، وہ جدھر سے گزرتے، لوگ ادھر راستہ چھوڑ دیتے تھے ہشام نے انجان بن کر پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ عہد اموی کے مشہور شاعر فرزدق نے برجستہ اشعار میں اس کے تجاہل عارفانہ کا جواب دیا، اور ان کا شایان شان تعارف کرایا[2]۔

اسی طرح دوسرے فضلاء اہل بیت حضرت حسن المثنیٰ اور ان کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ المحض نیز دوسرے فضلائے تابعین حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؓ، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ، حضرت سعید بن المسیب حضرت عروۃ بن الزبیر[3] مسلمانوں کے لئے دینی نمونہ (آئیڈیل) تھے انھوں نے اپنی خودداری، حکومت سے بے تعلقی حق گوئی اور بے باکی، علمی انہماک اور بے غرض خدمت دین سے اپنی اخلاقی برتری کا نقش قائم کر دیا تھا، حکومت کے بڑھتے ہوئے ہمہ گیر اثرات کے مقابلہ میں یہ اخلاقی اثر اگرچہ کافی نہ تھا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے قیمت اور بے نتیجہ نہ تھا، اس سے مسلمانوں کی زندگی میں کسی حد تک اعتدال و توازن اور دین کا احترام قائم تھا، اور کبھی کبھی عین دنیا داری انہماک میں بھی اصلاح حال کا جذبہ ابھر آتا تھا۔

انقلاب حکومت کی ضرورت اس کی مشکلات

رفتہ رفتہ سیاسی انقلاب کے اثرات وسیع اور گہرے ہوتے چلے گئے، ان دینی شخصیتوں میں بھی کمی آنے لگی جو اسلام

---

[1] حجر اسود کو بوسہ دینا یا ہاتھ سے چھونا [2] یہ قصیدہ ادبیات عربی اور ادب میں یادگار ہے اس کا مطلع ہے۔

هذا الذی تعرف البطحاء وطأته　　والبيت يعرفه والحل والحرم

محققین کا خیال ہے کہ اس قصیدہ میں بہت سے اشعار بعد میں اضافہ ہو گئے ہیں۔

[3] تفصیلی حالات و تراجم کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ لذہبی، صفوۃ الصفوۃ لابن الجوزی اور تاریخ ابن خلکان۔

کے اصلی اخلاق و اوصاف کی نمائندگی اور ترجمانی کرتی ہوں، گو تھیں، حکومت کا دائرہ وسیع اور مستحکم ہو گیا۔ اب اخلاقی و دینی انقلاب اس کے بغیر مشکل تھا کہ خود حکومت میں کوئی خوشگوار انقلاب ہو۔

اموی حکومت ایسی مستحکم فوجی بنیادوں پر قائم تھی کہ آسانی سے ہلائی نہیں جا سکتی تھی، اس وقت کوئی بیرونی یا اندرونی طاقت ایسی نہ تھی جو اس کو میدانِ جنگ میں شکست دے سکے، ماضی قریب میں دو بڑی کوششیں ایک سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مخلصانہ و سرفروشانہ اقدام، دوسرے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کا دلیرانہ و منظم مقابلہ ناکام ہو چکا تھا، کسی فوجی انقلاب کی کامیابی کے قریبی امکانات و آثار نہ تھے، شخصی و موروثی حکومت نے اصلاح و تبدیلی کے دروازے بند کر دیئے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کے لئے مسلمانوں کی قسمت پر مہر لگ چکی ہے، اس وقت اسلام کو غالب ہونے اور حالات کو بدل دینے کے لئے ایک معجزہ کی ضرورت تھی، اور وہ معجزہ ظاہر ہوا۔

عمر بن عبد العزیزؒ کی جانشینی

یہ معجزہ حضرت سیدنا عمرؒ بن عبد العزیز کی ذات ہے جو خود بنی امیہ خاندان (مروان) کے پوتے اور ان کی ماں (ام عاصم) فاروق اعظمؓ کی پوتی تھیں، فاروقیت اور امویت کا یہ سنگم اسی لئے ہوا تھا کہ بنی امیہ کے خاندان میں ایک خلیفۂ راشد پیدا ہو، جو حالات میں انقلاب برپا کرے۔

عمر بن عبد العزیزؒ سنہ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے، وہ خلیفۂ وقت سلیمان بن عبد الملک کے چچا زاد بھائی تھے، اور اس کے پیشرو ولید بن عبد الملک کے اور اس کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے حاکم (گورنر) تھے۔[1] ان کی جوانی اور امارت و ثروت کی حالت

---

[1] لہ ابن جوزی کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے منادی کرا دی تھی کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے، اسی زمانہ میں ایک رات وہ گشت پر تھے کہ ایک گھر سے آواز آئی کہ ایک عورت کہہ رہی ہے کہ بیٹی اٹھو اور دودھ میں پانی ملا دو، لڑکی نے جواب دیا کہ اماں آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المؤمنین نے اس کی ممانعت کی ہے، عورت نے کہا کہ امیر المؤمنین اس وقت کہاں بیٹھے ہیں، ان کو کیا خبر، لڑکی نے جواب دیا کہ اگر امیر المؤمنین کو خبر نہیں تو خدا تو دیکھتا ہے، حضرت عمرؓ نے اس گھر کو ذہن میں رکھ لیا اور پوچھا تو عاصم سے کہا کہ تم اس سے نکاح کر لو، مجھے امید ہے کہ اس کے بطن سے عرب کا شہسوار پیدا ہوگا، چنانچہ حضرت عاصم نے اس سے نکاح کیا، انہی کی نسل میں عمر بن عبد العزیزؒ ہیں۔ (سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۱۰ ۱۱)

کے بعد کی زندگی سے کوئی مناسبت نہیں، وہ ایک صاحب ذوق، امیرانہ مزاج اور نفیس طبع نوجوان تھے، وہ جس راستہ سے گزرتے تھے دیر تک اس کی مہک پھیلی رہتی تھی، کہ ادھر سے عمر گزرے ہیں، ان کی چال مشہور اور نوجوانوں کا فیشن تھی، سوائے طبیعت کی سلامتی، حق پسندی اور فطری نیکی کے ان میں کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے ثابت ہو کہ وہ تاریخ اسلام میں اتنا اہم کام انجام دینے والے ہیں۔

لیکن ان کی ذات سراپا اسلام کا اعجاز تھی، اور وہ جس طرح منصب خلافت پر آئے وہ بھی خدا کی قدرت کی ایک نشانی تھی، موروثی نظام حکومت میں ان کی خلافت کا کوئی موقع نہ تھا، اگر حالات اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہتے تو امارت سے زیادہ ان کا کوئی حصہ نہ تھا، مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا، سلیمان بن عبدالملک بیمار ہوا، اس کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے، اس نے ان کو اونی ٹوپی قبائیں پہنائیں اور ہتھیار باندھے کہ وہ بڑے معلوم ہوں، مگر وہ اتنے ننھے منے تھے، اس نے بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھا اور کہا کہ وہ بڑا خوش قسمت ہے جس کے لڑکے بڑے بڑے ہوں، رجاء بن حیوہ نے جو بڑے استاد تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی جانشینی کا مشورہ دیا، جو منظور ہوا، رجاء کا یہ کارنامہ (جو دینی انقلاب کا ذریعہ بنا) بڑے بڑے مجاہدات اور سالہا سال کی عبادت پر بھاری ہے۔

خلافت کے بعد ان کی زندگی

عمر بن عبدالعزیزؒ نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلا تاخیر ان چند عمال حکومت کو معزول کیا، جو سخت ظالم اور ناہموار تھے، ان کے سامنے شاہی تزک و احتشام اور جانشینی کا جو سامان پیش کیا گیا، اس کو بیت المال میں داخل کیا، اور اس گھڑی سے ان کی سیرت یکسر بدل گئی، اب وہ سلیمان کے جانشین نہ تھے، بلکہ امیرالمومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے جانشین تھے، جاگیروں اور جائدادوں کی تحقیق کے بعد ان کے مالکوں اور حقداروں کو واپس کر دیا، مظالم کا تصفیہ کیا اور اپنی مجلس کو جس نے کسریٰ و قیصر کے دربار کی حیثیت اختیار کر لی تھی، سنت اور خلافت راشدہ کے نمونہ پر سادہ اور مطابق سنت بنا دیا، اپنی جاگیر مسلمانوں کو واپس کر دی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا، انھوں نے اپنی ذاتی

زندگی اختیار کی جس کی نظیر بادشاہوں میں تو کیا مل سکتی ہے، درویشوں اور فقراء میں بھی ملنی مشکل ہے [illegible] کی کہ بعض اوقات کرتا سوکھنے کے انتظار میں جمعہ میں تاخیر ہو جاتی۔ بنی امیہ جو ساری سلطنت کو اپنی جاگیر اور بیت المال کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے [illegible] ان کے گھر کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے تو دیکھا بچیاں ان سے بات کرتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہیں، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان بچیوں نے آج صرف دال اور پیاز کھائی ہے، رو کر فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم انواع و اقسام کے کھانے کھاؤ اور تمہارا باپ جہنم میں جائے، یہ سن کر بچیاں بھی رو پڑیں۔ اس وقت جبکہ وہ روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمران تھے ان کی ذاتی ملکیت کا یہ حال تھا کہ باوجود شوق کے حج کا خرچ ان کے پاس نہ تھا، مزاحم سے جو ان کا رفیق تھا پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ ہے جو اس نے کہا کہ دس دینار ہیں، فرمایا کہ اس میں حج کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد ایک بڑی رقم مال فئی آئی تو خادم نے مبارک باد دی اور کہا کہ حج کا سامان ہو گیا، فرمایا ہم نے اس مال سے بہت دنوں فائدہ اٹھایا ہے اب یہ مسلمانوں کا حق ہے یہ کہہ کر سب کو بیت المال میں داخل کر دیا۔

ان کے دو وقت کھانے کا حساب دو درہم یومیہ سے زیادہ نہ تھا۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ سرکاری شمع جل رہی ہوتی اور کوئی ان کی خیریت دریافت کرنے لگتا یا ذاتی بات چیت شروع کر دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے اور اپنی ذاتی شمع منگوا لیتے، بیت المال کے [illegible] ناک بند کر لیتے [illegible] بیت المال کے [illegible] گوارا نہ تھا۔

ان کی احتیاط صرف اپنی ذات تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ اپنے عمال حکومت کو بھی احتیاط کا سبق دیتے تھے اور ان سے توقع کرتے تھے کہ وہ بھی حکومت کے مال میں اسی قدر محتاط ہوں۔ مدینہ کے والی ابوبکر بن حزم نے سلیمان بن عبد الملک کو درخواست دی تھی کہ حسب دستور سابق ان کو [illegible] موم بتیاں [illegible] ملتی رہیں، سلیمان کے انتقال کے بعد یہ درخواست عمر بن عبد العزیز کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے لکھا کہ [illegible] مجھے وہ [illegible] یاد ہے جب تم [illegible] جاتے [illegible]

[illegible]

اور تعلیم کافی نہیں، اتنا ہے جس سے ہم لوگوں کا مہینہ جاتا ہے۔[1] اسی طرح کی ایک درخواست پر جس میں سرکاری کام کے لئے کاغذ طلب کیا گیا تھا، لکھا کہ:

"قلم باریک کرو اور سطریں ملا کر لکھا کرو اور ایک پرچہ میں بہت سی ضرورتیں لکھ دیا کرو، اس لئے کہ مسلمانوں کو ایسی زائد بات کی ضرورت نہیں جس سے ان کے بیت المال پر بار پڑے۔"[2]

ان کی انقلابی اصلاحات

اسی زاہدانہ زندگی اور تقویٰ و احتیاط کے ماسوا انھوں نے حکومت کی روح ہی بدل دی تھی اور سب سے بڑا دینی انقلاب یہ تھا کہ انھوں نے حکومت کا نقطۂ نظر بدلا، اس وقت تک حکومت محاصل و خراج وصول کرنے اور صرف کرنے کا ایک انتظامی ادارہ تھا جس کو رعیت کے اخلاق و عقائد، سیرت و تربیت اور ضلالت و ہدایت سے کچھ بحث نہ تھی، اسی نقطہ کے گرد اس کا سارا انتظام گردش کرتا تھا، انھوں نے اپنے اس مختصر و تاریخی فقرے سے کہ:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے"[3]

حکومت کا مزاج اور نقطۂ نظر ہی تبدیل کر دیا، اور اس کو دنیوی حکومت کے بجائے خلافت نبوت بنا دیا، ان کی ساری مدت خلافت اسی ایک جملہ کی عملی تفسیر تھی، انھوں نے ملکی مصالح و سیاست کے مقابلہ میں ہمیشہ دین و اصول و اخلاق کو ترجیح دی اور دینی نفع کے مقابلہ میں حکومت کے مالی نقصان کی کبھی پروا نہیں کی، ان کے زمانۂ خلافت میں اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندے (ذمی) بڑی تعداد میں مسلمان ہو رہے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جزیہ کی رقم جو حکومت کی آمدنی کا ایک اہم عنصر تھی روز بروز کم ہوتی جاتی تھی اور حکومت کے مالی توازن پر اس کا زبردست اثر پڑ رہا تھا، ارکان سلطنت نے ان کو اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی اور تشویش کا اظہار کیا، انھوں نے فرمایا کہ یہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا عین مقصد ہے، ایک دوسرے عہدہ دار کو لکھا کہ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور جزیہ کی

---

[1] سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۶۶ [2] ابن سعد ص ۲۸۳ [3] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۸۰

آمدنی بند ہو جانے کی رو سے؟ اور تم دونوں کا حصہ ذکر کے اہل علاقہ کو جا بجا ہے[1] یمن میں خراج کی ایک متعین مقدار مقرر تھی خواہ فصل اچھی ہو یا بری، وہ کامل لی جاتی تھی، آپ نے فرمایا کہ فصل کے مطابق رقم وصول ہونی چاہیے خواہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ سارے یمن سے ایک مٹھی غلہ وصول ہو، میں اس پر راضی ہوں، چنگی[2] ساری مملکت سے معاف کر دی اور عمال کو لکھا کہ وہ بخس ہے اس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (ھود ۸۵) — اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم مت دو اور زمین میں فساد مت مچاؤ۔

لوگوں نے اس کا نام بدل کر اس کو مکس بنا لیا ہے[3] ان چند شرعی محاصل کے علاوہ ہر طرح کے ناجائز محاصل اور سینکڑوں ٹیکس جو سابق فرمانرواؤں اور عمال حکومت نے ایجاد کئے تھے یکسر معاف کر دیئے[4] خشکی اور سمندر کے راستوں کو کھول دینے کی ہدایت کی اور ہر طرح کی پابندیاں اٹھا دیں[5]۔

مملکت میں ایسی اصلاحات کیں جن کے نتائج بہت دور رس تھے، ساری مملکت کے لئے یکساں پیمانے مقرر کئے جن میں فرق نہیں ہو سکتا تھا[6]، حکام و عمال سلطنت کو تجارت کی ممانعت کی، بیگار کو قانوناً ممنوع قرار دیا[7]، سلطنت کی زمین کا جو حصہ امراء اور شاہی خاندان کے افراد و حکام نے اپنی شکارگاہ یا چراگاہ کے لئے گھیر کر بیکار بنا رکھا تھا، حکم دیا کہ وہ عوام کی ملکیت ہے[8]، عمال کو تحفہ تحائف قبول کرنے کی ممانعت کی اور فرمایا کہ اگر وہ کبھی ہدیہ تھا تو اب رشوت کے سوا کچھ نہیں[9]، حکام کو ہدایت کی کہ لوگوں کو اپنے تک پہنچنے اور شکایات پہنچانے کے پورے مواقع اور سہولتیں مہیا کریں، حج کے موقع پر اعلان ہوتا تھا کہ جو کسی ظلم کی علامت یا کوئی نیک مشورہ دے گا اس کو سو سے لے کر تین سو دینار تک انعام ملے گا[10]۔

اعمال و اخلاق کی طرف توجہ

اس وقت تک خلیفہ صرف حاکم و فرمانروا ہوتا تھا، وہ لوگوں کے اعمال و اخلاق کی طرف توجہ کرنے کی

---

[1] مناقب عمر بن عبد العزیز لابن جوزی ص [illegible] [2] سیرت عمر بن عبد العزیز ابن عبد الحکم ص [illegible] [3] [illegible] [4] ایضاً ص [illegible] [5] ایضاً ص [illegible]

[6] ایضاً ص [illegible] [7] ایضاً ص [illegible] [8] ایضاً ص [illegible] [9] ایضاً ص [illegible]

نہ فرصت تھی نہ اہلیت، نہ اس کا یہ منصب سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کی دینی خصوصیت سے ان کے اخلاق و روحانیات کی نگرانی کرے اور وعظ و نصیحت کا منصب اختیار کرے، یہ کام علماء و محدثین کا سمجھا جاتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس دوئی کو مٹایا اور اپنے کو حقیقی معنی میں خلیفہ ثابت کیا۔ انھوں نے زمام خلافت ہاتھ میں لیتے ہی عمال حکومت اور امراء اجناد (فوجی افسروں) کو طویل طویل خط اور فرامین لکھے جو انتظامی سے زیادہ دینی و اخلاقی ہیں اور ان میں حکومت کی روح سے زیادہ دعوت و نصیحت کی روح ہے۔ ایک خط میں انھوں نے سابق اسلامی زندگی (عہد نبوت و خلافت) کا اور اس وقت کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے اور اسلامی نظام مالیات اور طرز حکومت کی تشریح کی ہے۔ بعض خطوط میں وہ امراء اجناد (فوجی افسروں) کو وقت پر نمازیں پڑھنے اور ان کے اہتمام اور علم کی نشر و اشاعت کی تاکید کرتے ہیں،[1] عمال کو تقویٰ و اتباع شریعت کی وصیت فرماتے ہیں،[2] اپنے علاقہ اور حلقہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کی ترغیب دیتے ہیں اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا مقصد بتلاتے ہیں،[3] امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اہتمام کی تاکید کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اس فریضہ کے ترک ہو جانے کے کیا نقصانات ہیں اور اس کا کیا وبال پڑتا ہے،[4] عمال سلطنت کو سزا و عقوبت میں اعتدال و احتیاط سے کام لینے کی تاکید فرماتے ہیں اور اسلام کے قانون تعزیرات کی تشریح کرتے ہیں،[5] پھر سلطنت کی عمومی شہری خرابیوں اور بداخلاقیوں کی طرف توجہ کرتے ہیں، نوحہ گری اور جنازہ میں عورتوں کے ساتھ جانے کو بند کرتے ہیں، پردہ کی تاکید کرتے ہیں،[6] قبائلی عصبیت کی مذمت اور اس کی ممانعت کرتے ہیں،[7] نبیذ کے استعمال میں بڑی بے احتیاطی شروع ہو گئی تھی اور لوگ اس کے ذریعہ نشہ اور خمر تک پہنچ گئے تھے جس سے مختلف قسم کی بداخلاقیاں پیدا ہو رہی تھیں، اس کی تحدید و تشریح کرتے ہیں۔[8]

تدوین علوم اور احیائے سنن

اس کے ساتھ انھوں نے دینی علوم کی تدوین اور سنتوں کے احیاء کی طرف بھی توجہ کی۔ ابوبکر بن حزم جو ایک

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ابن عبدالحکم [illegible] [2] [illegible] [3] [illegible] [4] [illegible] [5] [illegible] [6] [illegible] [7] [illegible]
[8] [illegible]

بڑے عالم تھے ان کو حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور لکھا:

انظر ما كان من حديث رسول الله	آنحضرت ﷺ کی جو حدیثیں ملیں [illegible]
صلى الله عليه وسلم فاكتبه فاني خفت	ان کو لکھ لو کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ
دروس العلم وذهاب العلماء.	علماء رخصت ہو جائیں گے اور علم مٹ جائے گا۔

انہوں نے تعیین کے ساتھ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر کے ذخیرۂ روایات کی طرف توجہ دلائی کہ اسے قلم بند کر لیا جائے۔ پھر حضرت ابوبکر بن حزم ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنی مملکت اور تمام عمال کو بھی اسی ضرورت کی طرف متوجہ کیا اور گشتی فرمان جاری کیا کہ:

انظروا الى حديث رسول الله صلى الله	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ڈھونڈ ڈھونڈ کر
عليه وسلم فاجمعوه.	جمع کرو۔

اس کے ساتھ علماء کے [illegible] کہ وہ یکسوئی اور انہماک کے ساتھ علم کی اشاعت اور تعلیم کا کام کریں۔ وہ خود بڑے عالم تھے۔ انہوں نے بنفس نفیس فرائض و سنن کی تشریح کی طرف توجہ کی، خلافت کے ابتدائی دنوں میں ایک گشتی فرمان جاری کیا جس میں فرماتے ہیں کہ:

> [illegible]

چند خطوط و فرامین

سیدنا عمر بن عبدالعزیز کے تمام [illegible]

[illegible] سیرت عمر بن عبدالعزیز [illegible] صحیح بخاری کتاب العلم [illegible]

(نظامِ سلطنت میں جلوہ گر ہوئی) اس کا صحیح اندازہ ان کے خطوط اور سرکاری فرامین سے ہوتا ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً سلطنت کے کارپردازوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کو لکھے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا خالص اسلامی ذہن و دماغ بخشا تھا، جس پر جاہلیت کی کوئی پرچھائیں اور خارجی و آبائیت کے اخلاق و افکار کا کوئی سایہ بھی نہیں پڑا تھا، یہاں چند خطوط پیش کئے جاتے ہیں۔

ان کو ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ بعض قبائلی سردار اور عہدہ دار امراء کے نو دولت "جاہلیت کی رسم عصبیت و حمایت" کو زندہ کرنا چاہتے ہیں اور جنگ و مقابلہ کے موقع پر "یا لبنی فلاں" "یا للمضر" (فلاں قبیلہ کی دہائی ہے، اے اہل مضر اپنے حلیف کی مدد کرو) کا جاہلی نعرہ لگانے لگے ہیں، یہ اسلام کے رشتہ اخوت اور نظام اجتماعی کے متوازی ایک جاہلی نظام اور جاہلی رسم کا احیاء تھا اور بہت سے فتنوں کا پیش خیمہ، سابق فرمانروا شاید اس کو بعض مصالح سے نظر انداز کرتے یا کم از کم اہمیت نہ دیتے، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور اس کے بارے میں مستقل فرمان صادر کیا، اپنے ایک بڑے عہدہ دار ضحاک ابن عبدالرحمن کو لکھتے ہیں:۔

"حمد و صلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس اسلام کے علاوہ کسی دین کو اپنے لئے اور اپنے بندگان خاص کے لئے پسند نہیں فرمایا اور کسی دین کو قبول نہیں فرمائے گا، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی اس کتاب سے عزت بخشی اور اسی کے ذریعہ اسلام اور غیر اسلام میں تفریق کردی ہے، ارشاد فرمایا۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ	تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی اور ایک
يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ	کتاب واضح کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو
سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى	رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو
النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ	اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں اور
(المائدہ۔ ۱۵،۱۶)	ان کو راہ راست پر قائم رکھتے ہیں۔

---

(۱) جاہلیت میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اور ایک شخص دوسرے شخص کا حلیف ہوا کرتا تھا، پھر وہ جہاں اس کو پکارا جاتا اس کی مدد کرتا تھا اور حق و باطل میں اس کا ساتھ دیتا تھا۔

نیز ارشاد ہے:۔

وَبِالْحَقِّ أَنزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۗ وَمَا	اور ہم نے اس قرآن کو راستی ہی کے ساتھ نازل کیا اور
أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝	وہ راستی ہی کے ساتھ نازل ہو گیا اور ہم نے آپ کو
(الاسراء ۱۰۵)	صرف خوشی سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی اس وقت تمام اہلے عرب (جیسا کہ تم کو معلوم ہے) ضلالت و جہالت میں مبتلا تھے اور بت پرستی و انتشار میں پڑے ہوئے تھے قبائلی عداوتیں عام تھیں لوگ ظلم کرتے تھے اور لوگوں کے پاس جو تھوڑا سا دین باقی تھا اسے بھی محرف کر دیا تھا اس کے بعض لوگوں کی گمراہی میں یہ بات کہ گمراہی ایسی نہیں تھی جیسا کہ تم خیال کرتے ہو بلکہ ان میں سے ہر ایک جدا تھا وہ جہالت و گمراہی کے ساتھ رہتا تھا اور تم پر ہر طرح تھا اس کا انجام بہت برا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن ان بڑی بڑی بتوں کی پرستش جنگ و جدال منافرت اور تعلقات کی خرابی سے محفوظ کیا پھر قرآن سے انکار کرنے والوں نے انکار کیا اور تم میں سے تکذیب کرنے والے نے تکذیب کی اور اللہ کے پیغمبر اللہ کی کتاب اور اسلام کی دعوت دیتا رہا جو لوگ بہت کمزور اور تھوڑے تھے اس پر ایمان لائے ان کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ لوگ انہیں اچک نہ لیں تو اللہ نے ان کو پناہ دی اور اپنی مدد سے ان کی تائید کی اور ان کو وہ لوگ عطا فرمائے جن کا اسلام لانا اس کو منظور تھا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف لے جانے والے تھے اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول سے جس وعدہ کو پورا کرنا تھا جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں اس وعدہ کو پورا کرنے کے بعد اور کے علاوہ جو ظالم لوگوں نے جیسا کہا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَ	وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا
دِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ	دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب
الْمُشْرِكُونَ ۝ (الصف ۹)	کر دے گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

جن آیتوں میں یہ فرمایا ہے کہ خود مومنین سے وعدہ کیا ہے ارشاد فرماتا ہے کہ۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا — تم میں جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کریں ان سے
الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا — اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت
اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ — عطا فرمائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی
لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ — تھی اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے
مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ — لئے قوت دے گا اور ان کے خوف کے بعد ان کو تبدیل
لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (نور ۵۵) — بامن کرے گا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں میرے
ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور مسلمانوں سے آپ کے لئے جو وعدہ کیا ہے پورا کر دیا اے اہل اسلام! ہم کو تم کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اسی اسلام کے صدقہ میں دیا ہے جس کا یہ مقصد ہے کہ تم اپنے آخرت پر پہنچ جاتے ہو اور جس کی وجہ سے تم قیامت کے دن گرفتار ہوگے تو نجات نہ دنیا و آخرت میں اس کے علاوہ نجات نہیں ہے اور نہ کوئی حمیت کا کوئی بچاؤ ہے اور نہ کوئی حفاظت کا سامان اور طاقت جب اللہ تعالیٰ تم کو وہ بہتری و دین نصیب کرے گا جس کا قرآن سے وعدہ کیا گیا ہے آخرت کے بیان کے ثواب کی امید ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وہ۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ — یہ عالم آخرت ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں
لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا — جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور نیک نتیجہ
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (سورۃ القصص ۸۳) — متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

میرے دوستو! کیا اس قرآن اور اس پر عمل نہ کرنے کے نتائج بعد میں آگاہ ہوں اس لئے کہ میں چاہتا ہوں کہ تم میں جو دو قسمیں ابھی تک ہیں یہ سب ہی جو دو تمام جو نہ دیا ہو جو بے فائدگی اور اختلاف رہ رہا ہے وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے اب بھی جرأت نہ کرے تم کو اس کتاب پر ہی کیا ہے اس سے رک جاؤ کیونکہ فرمانے کی امید ہے

[illegible] واقف [illegible] نہیں ہے ....

[illegible] مجھے اس خط کے لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ سب یہی ہے جو بیان کیا [illegible]

[illegible] لوگوں کی بات [illegible] اور [illegible] جاہل قسم کے لوگ

ہیں [illegible] ان کو علم نہیں [illegible] اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ جو معاملہ

رہا ہے [illegible] بھول گئے ہیں اور [illegible] کہ انھوں نے ناشکری اور ناقدری کی ہے

[illegible] ان میں صلاحیت [illegible] بتا گیا ہے کہ ان میں سے کچھ [illegible] جنگ میں [illegible] اور بعض

[illegible] ایمان کا [illegible] دوسرے کے مقابلہ میں ان کے [illegible]

[illegible] میں ان کو [illegible] وقت [illegible] کا کیا [illegible] دیکھئے

جس کو انھوں نے اپنے [illegible] کیا کہ اس [illegible] سے اپنے کو محروم کیا اور کسی گروہ سے اپنا

تعلق [illegible] مجھے معلوم [illegible] نہیں [illegible] گئی ہے

کیا ان لوگوں نے کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ کلام نہیں سنا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ	مسلمان تو سب بھائی بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں
أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ	کے درمیان صلح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے
(الحجرات ۱۰)	رہا کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

کیا انھوں نے یہ آیت بھی نہیں سنی؟:۔

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ	آج کے دن تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور
نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا	میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام
(المائدہ ۳)	کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا

[illegible] بات [illegible] کی دعوت دیتے ہیں [illegible] آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے شروط معاہدات کے معاہدہ سے منع فرمایا ہے اور ارشاد ہے "لا حلف فی الاسلام" (یعنی اسلام میں حلف و دوستیاں اور معاہدہ نہیں ہے) جاہلیت میں ہر حلیف دوسرے حلیف سے اس کی توقع رکھتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ اور مخالف کا حق ادا کرے گا اور اس کو پورا کرے گا خواہ وہ بالکل ظالمانہ اور جابرانہ ہو اور اس میں صریحی اللہ اور رسول کی نافرمانی ہوتی ہو ....

میں ڈراتا ہوں ہر اس شخص کو جو میرا یہ خط پڑھے اور جس کو یہ خط پہنچے اس بات سے کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی حلف کو اختیار کرے اور اللہ اور رسول اور مومنین کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا دوست بنائے یہ سخت ڈر کی بات ہے اور بار بار اس سے آگاہ اور متنبہ کرتا ہوں اور میں ان لوگوں پر اس ذات کو گواہ بناتا ہوں جس کی قدرت اور تصرف میں تمام جان داریں اور جو ہر شخص کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے۔[1]

انھوں نے اپنے ایک فوجی افسر کو جنگ پر روانہ ہونے کے وقت جو ہدایت نامہ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن قرآن کے سانچے میں کس طرح ڈھل گیا تھا اور ان کا نقطۂ نظر اور طرز فکر دنیادار بادشاہوں اور سیاسی حکمرانوں سے کس قدر مختلف تھا۔

منصور بن غالب کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں۔

اللہ کے بندے امیر المومنین عمر کا۔ یہ ہدایت نامہ منصور بن غالب کے نام جب کہ امیر المومنین نے ان کو اہل حرب کے اور ان قبائل سے جو متصل ہیں جنگ کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ امیر المومنین نے ان کو حکم دیا ہے کہ ہر حال میں تقویٰ اختیار کریں کیونکہ اللہ کا تقویٰ بہترین سامان، مؤثر تدبیر اور حقیقی طاقت ہے امیر المومنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے دشمن سے زیادہ اللہ کی معصیت سے بچیں کیونکہ گناہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لئے خطرناک ہے ہم اپنے دشمنوں سے جنگ

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ابن عبد الحکم ص ۸۳ ترجمہ مولوی [illegible] صاحب ندوی۔

لڑنے میں اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم ان پر غالب آجاتے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں ہو تو واقعی درحقیقت ہم کو مقابلہ کی قوت نہیں ہے کیونکہ نہ تو ہماری تعداد ان کی تعداد کے برابر ہے اور نہ ہمارا سامان ان کے سامان کے برابر ہے۔ اگر ہم اور وہ دونوں معصیت میں برابر ہو جائیں تو وہ قوت اور تعداد میں ہم سے بڑھ کر غالب ہوں گے یاد رکھو اگر ہم اپنی اطاعت کی وجہ سے مدد نہ پا سکیں گے تو اپنی قوت کی وجہ سے کبھی ان پر غالب نہ آسکیں گے اور اپنے گناہوں سے زیادہ کسی دشمن سے خوفزدہ نہ ہوں جتنا کہ لیکن اپنے گناہوں سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہ کریں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تم پر محافظ مقرر کئے گئے ہیں جو تمہارے سفر و حضر کے افعال کو جانتے ہیں پس ان سے شرم کرو اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ حسن سلوک کرو اور ان کو اللہ کی نافرمانی کرکے برباد نہ ہونے دو خصوصاً ایسی حالت میں کہ تم اور یہ کہ تم راہ خدا میں نکلے ہوئے ہو اور یہ مت سمجھو کہ ہمارے دشمن ہم سے کمتر ہیں اس لئے گو ہم گناہگار ہیں لیکن وہ ہم پر غالب نہیں آسکتے کیونکہ بہت سی ایسی قومیں ہیں جن پر ان کے گناہوں کی وجہ سے ان سے بدتر لوگوں کو مسلط کر دیا گیا۔ پس اللہ تعالیٰ سے اپنے نفسوں کے مقابلہ میں مدد چاہو جیسا کہ تم خدا سے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد چاہتے ہو میں بھی اپنے لئے اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں اور امیر المومنین منصور بن غالب کو حکم دیتے ہیں کہ سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں، اور اپنے ساتھیوں کو ایسی طویل مسافت پر مجبور نہ کریں جو تھکن میں مبتلا کر دے اور سفر میں کسی ایسی منزل پر پڑاؤ ڈالنے سے گریز کریں جس سے ان کو آرام ملتا ہو۔ یہاں تک کہ ان کا دشمن اسی حالت میں سامنا ہو کہ سفر کی تکان نے ان کی قوتوں کو گھٹا دیا ہو، وہ اپنے دشمن کے پاس جاتے ہیں تو اپنے گھروں میں رہا ان کا سامان اور سواریاں سست اور کمزور نہیں ہوں گے اگر سفر میں اپنی سواریوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ نہ کریں گے تو ان کے دشمنوں کو ان پر زیادہ قوت حاصل ہوگی کیونکہ دشمن اپنے گھروں میں بیٹھا ہے، اس کے آدمی اور سواریاں تو آرام کئے ہوئے ہیں اور ان کی تازگی سے ہر دو چیزیں باقی ہے۔

اور امیر المومنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ ہر جمعہ ایک رات اور دن سفر نہ کریں اور آرام کریں تاکہ خود کو اور جانوروں کو آرام پہونچائیں اور اپنے سامان اور ہتھیاروں کی مرمت کریں اور امیر المومنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ اپنا قیام صلح کی بستیوں سے الگ رکھیں اور امان والی بستیوں میں ان کے ساتھیوں میں سے کوئی نہ جائے نہ ان کے بازاروں میں نہ ان کی مجلسوں میں ہاں وہ شخص جا سکتا ہے جس کو اپنے دین اور امانت پر پورا بھروسہ ہو اور نہ ان بستی والوں پر ظلم کریں اور نہ وہاں سے اپنے لئے کچھ جمع کریں اور نہ ان کو کچھ اذیت پہونچائیں سوائے اس کے کہ شرعی مطالبہ یا واجبی حق ہو کیونکہ ان کا حق اور ان کی ذمہ داری ہے جس کے پورا کرنے کا تم کو اسی طرح ذمہ دار بنایا گیا ہے جس طرح کہ وہ لوگ حقوق و ذمہ کی پابندی کے مکلف ہیں یہی جب تک وہ لوگ اپنے حقوق کی ادائیگی پر ثابت قدم رہیں تم لوگ بھی ان کے حقوق ادا کرتے رہو اور صلح والوں پر ظلم کر کے جنگ والے ملکوں پر فتح حاصل کرو قسم اللہ کی تمہیں ان لوگوں کے مالوں سے احتراز چاہئے جن سے آپ کے کتاب عہد کا تعلق ثابت ہے ضرور ہم نے تمہارے سامان میں کمال کرتا ہی بھی نہیں کی ہے اور نہ تمہاری قوت میں کوئی ضعف پیدا ہونے دیا ہے اور تمہارے لئے سامان اچھی طرح جمع ہو گیا ہے تمہیں ایک منتخب فوج دی گئی ہے اور جنگ والے ملکوں کی طرف تم کو مشغول کر کے صلح والوں کی طرف سے تمہاری توجہ ہٹا لی ہے اور ایک جماعت کے بعد جماعت مدد بھیجت کر سکتا تھا اس سے بہتر تمہارے لئے کر دیا ہم نے تمہارے لئے قوت کی بہم رسانی میں کوئی کمی نہیں کی بامجبوری اور اللہ ہی پر بھروسہ ہے "وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" اور امیر المومنین کی درخواست ہے کہ ان کے جاسوس عرب اور وہاں کے ملک میں سے وہ لوگ ہوں جن کے اخلاص اور صدق پر ان کو اطمینان ہو کیونکہ دروغ گو کی اطلاع سے نفع نہیں پہونچتا اگرچہ اس کی کوئی بات صحیح بھی ہو فریب دہندہ دراصل تمہارے دشمن کا جاسوس ہے تمہارا جاسوس نہیں۔ والسلام علیکم[۲]

---

[۱] حزب و قرات وغیرہ [۲] سیرت عمر بن عبدالعزیز [illegible] ترجمہ مولوی عبدالسلام صاحب ندوی۔

ایک عمومی خط میں عمال سلطنت کو تحریر فرماتے ہیں:-

"اما بعد، چونکہ یہ ذمہ داری جو اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد فرمائی ہے اگرچہ میں نے اس کو قبول کیا ہے کہ اس سے میرا مقصد کوئی مال اسباب، سواری، پوشاکیں یا جمع اموال ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے پہلے بھی یہ چیزیں بہت دے رکھی تھیں جو مشکل سے لوگوں کو میسر ہوتی ہیں لیکن میں نے اس ذمہ داری کو بہت ڈرتے ڈرتے قبول کیا ہے مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ یہ عظیم الشان ذمہ داری ہے اس کی بازپرس بڑی سخت ہے جس وقت زمین اور مدعی خیانت کے روبرو پیش ہوں گے تو اس کے سامنے بڑی سخت جرح ہوگی ہاں اگر اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور نظر انداز فرمائے اور رحم فرمائے تو الگ بات ہے۔

میں نے تم کو حکومت کا جو کام سپرد کیا ہے اور جو اختیارات تفویض کئے ہیں ان میں سے تم کو اتقاء اللہ خدا کے خوف کی ہدایت کرتا ہوں، فرض داریوں کی ادائیگی اور اللہ تعالیٰ کے اوامر کے اتباع اور اس کے نواہی سے اجتناب کی تاکید کرتا ہوں جو چیزیں اس کے خلاف ہوں ان کی طرف بالکل توجہ کی ضرورت نہیں تمہاری تفریح اور سیر اور اپنے عمل پر بھی اور ان چیزوں کی طرف ہو جو تمہارے رب تک پہنچا دیں اور جو تم اپنے اور اپنی رعیت کے درمیان کرتے ہو وہ تمہارے لئے تفریح ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ حفظ و نجات اسی میں منحصر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں منزل مقصود تک پہنچ جاؤ اس لئے یوم موعود کے لئے وہی چیز تیار رکھو جو خدا کے ہاں کام آنے والی ہو اور دوسروں کے واقعات میں تم نے ایسی عبرتیں دیکھی ہیں جن کے برابر کوئی وعظ و نصیحت موثر نہیں ہو سکتی۔ والسلام[1]"

تبلیغ و اشاعت اسلام کی طرف توجہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے صرف مسلمانوں کی اصلاح اور ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ پر

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۲۳-۲۴ ترجمہ مولوی ابوالعرفان صاحب ندوی۔

اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت کی طرف بھی خصوصی توجہ کی اور اسباب ان کو اپنے صدق و اخلاص کی برکت، دینی زندگی و عمل سے اسلام کی صحیح اور موثر نمائندگی کی وجہ سے بہت کامیابی حاصل ہوئی ——— بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے۔

"عمر بن عبدالعزیز نے ہندوستان کے راجاؤں کو بھی خطوط لکھے اور ان کو اسلام اور اطاعت کی دعوت دی اور یہ بھی لکھا کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ان کو اپنی سلطنتوں پر باقی رکھا جائے گا اور ان کے حقوق و فرائض وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔

ان کو ان کے اخلاق و کردار کی خبریں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں اس لئے انھوں نے اسلام قبول کیا اور اپنے نام عربوں کے نام پر رکھے۔[1]

جب اسمٰعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر مولیٰ بنی مخزوم شمالی مغرب کے والی بنائے گئے تو انھوں نے وہاں اچھے کردار و اخلاق کا بہت اچھا مظاہرہ کیا۔ وہاں بربروں کو اسلام کی دعوت دی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان لوگوں کو ایک خط بھیجا اور ان کو اسلام کی دعوت دی یہ خط اسمٰعیل نے مجمعوں میں پڑھ کر سنایا اور اسلام بالآخر وہاں غالب آگیا۔[2] اپنی خلافت کے بعد انھوں نے ماوراء النہر کے سلاطین کو اسلام کی دعوت کے خطوط لکھے اور خراسان کے جو لوگ اسلام لائے ان سے خراج معاف کر دیا لیکن جو لوگ مسلمان ہوئے اور مسافر تھے انھوں نے سرائیں تعمیر کیں، ان کے لئے اطعام و وظیفہ مقرر کیا۔[3]

ان کی اصلاحات کے اثرات اور ان کا ردعمل

عمر بن عبدالعزیز کی مالی اصلاحات اور بندشوں اور نظام حکومت میں شرعی و اخلاقی پابندیوں سے بجائے اس کے کہ حکومت کو مالی خسارہ اور شہریوں کو نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا، ملک میں خوشحالی عام ہوئی

---

[1] فتوح البلدان، ص۴۴۶، ۴۴۷ [2] ایضاً ص۳۳۹ [3] ایضاً ص۴۲۲

اور دولت کی وہ فراوانی ہوئی کہ زکوٰۃ قبول کرنے والا ڈھونڈھے سے نہیں ملتا تھا۔

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ مجھے عمر بن عبدالعزیزؒ نے افریقہ میں زکوٰۃ کی تحصیل و وصول پر مقرر کیا۔ میں نے زکوٰۃ وصول کی، جب میں نے اس کے مستحق تلاش کئے جن کو وہ تقسیم کی جائے تو مجھے ایک بھی محتاج نہیں ملا، اور ایک شخص بھی ایسا دستیاب نہیں ہوا جس کو زکوٰۃ دی جا سکے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے سب کو غنی بنا دیا، آخر میں نے کچھ غلام خرید کر آزاد کئے اور ان کے حقوق کا مالک مسلمانوں کو بنا دیا۔[1]

ایک دوسرے قریشی کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی مختصر مدت خلافت میں یہ حال ہو گیا تھا کہ لوگ بڑی بڑی رقمیں زکوٰۃ کی لے کر آتے تھے کہ جس کو مناسب سمجھا جائے دے دیا جائے، لیکن مجبوراً واپس کرنی پڑتی تھیں کہ کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔ عمرؒ کے زمانہ میں سب مسلمان غنی ہو گئے، اور زکوٰۃ کا کوئی مستحق نہیں رہا۔[2]

ان ظاہری برکات کے علاوہ جو کسی اسلامی حکومت کا لازمی نتیجہ ہیں، بڑا انقلاب یہ ہوا کہ لوگوں کے خیالات بدلنے لگے، اور قوم کے مزاج و مذاق میں تبدیلی ہونے لگی۔ ان کے معاصر کہتے ہیں کہ ہم جب ولید کے زمانہ میں جمع ہوتے تھے تو عمارتوں اور طرزِ تعمیر کی بات چیت کرتے تھے، اس لئے کہ ولید کا یہی اصل ذوق تھا اور اس کا تمام اہل مملکت پر اثر پڑا تھا۔ سلیمان کھانوں اور عورتوں کا بڑا شائق تھا، اس کے زمانہ میں مجلسوں کا موضوع گفتگو یہی تھا۔ لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں نوافل و طاعات کا تذکرہ گفتگو اور مجلسوں کا موضوع بن گیا۔ جہاں چند آدمی جمع ہوتے تو ایک دوسرے سے پوچھتے کہ رات کو تمہارا کیا پڑھنے کا معمول ہے؟ تم نے کتنا قرآن یاد کیا ہے؟ تم قرآن کب ختم کرو گے اور کب ختم کیا تھا؟ مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہو؟[3]

ان کی زندگی کا جوہر

عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی کا جوہر ایمان، ان کی تمام سرگرمیوں اور جدوجہد کی روح اور قوت محرکہ

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۲۹ [2] ایضاً [3] تاریخ طبری [illegible]

ان کا قوی ایمان، آخرت کا یقین اور جنت کا شوق ہے، انھوں نے جو کچھ کیا خدا کے خوف اور اس کی رضا کے شوق میں کیا، اور یہی وہ طاقت تھی جو اپنے وقت کے اس سب سے بڑے طاقتور حکمراں کو روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کی ترغیبات اور وسائل کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھتی تھی، ان کو کوئی اگر ان کے طرزِ عمل کے خلاف نصیحت کرتا اور تمتع و لطف اندوزی کی ترغیب دیتا تو ہمیشہ یہ آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔

إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (الانعام ۱۵)

اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔

انھوں نے ایک موقع پر اپنے خادم سے کہا تھا، اور یہ ان کی صحیح تعریف تھی کہ اللہ نے مجھے بڑی حوصلہ مند طبیعت دی ہے، جو مرتبہ بھی مجھے حاصل ہوا میں نے اس سے بلند تر مرتبہ کی تمنا کی، اور اب میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ کوئی مرتبہ باقی نہیں رہا، اب میری حوصلہ مند طبیعت جنت کی مشتاق ہو گئی ہے۔[1]

ان کی رقت و خشیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص سے انھوں نے نصیحت کی فرمائش کی، اس نے کہا کہ اگر خدا نے تم کو جہنم میں ڈال دیا اور ساری دنیا جنت میں چلی گئی تو تمہیں کیا فائدہ ہوا، اور اگر ساری دنیا جہنم میں چلی گئی اور تمہیں اللہ نے جنت نصیب کی تو تمہارا کیا نقصان ہوا، یہ سن کر وہ اس قدر روئے کہ ان کے سامنے جو انگیٹھی رکھی تھی وہ بجھ گئی۔[2] یزید بن حوشب کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ جنت و دوزخ صرف عمر بن عبدالعزیزؒ اور حسن بصریؒ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔[3]

عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات

اگر اللہ کو منظور ہوتا اور عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنے کسی پیش رو کی مدت خلافت مل جاتی تو پوری اسلامی مملکت میں گہرا اور دیرپا انقلاب ہو جاتا اور مسلمانوں کی تاریخ آج دوسری ہوتی، لیکن بنی امیہ جن کو اپنے

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۲۱ [2] ایضاً ص ۴۵ [3] صفۃ الصفوۃ لابن جوزی ج ۲ ص ۱۲۶

اس خود خاندان کی خلافت میں سب سے بڑی قربانی کرنی پڑی تھی، اور جو اپنی بے تکلف مجلسوں میں حضرت عمرؓ کے گھرانے میں رشتہ کرنے پر بہت پچھتاتے رہتے تھے، زیادہ دن تک اس مجاہدہ کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے جلد ان سے خلاصی حاصل کر کے مسلمانوں کو اس عطیۂ خداوندی سے محروم کر دیا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کل دو سال پانچ مہینے خلافت کر کے ۱۰۱ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے[1]۔ اس بات کے آثار و قرائن موجود ہیں کہ ان کے خاندان نے ان کو زہر دیا۔

* * *

---

[1] ابن سعد، ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ۔

دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں

اور

حضرت حسن بصریؒ

امت میں اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد حکومت کا دھارا اسی طرح بہنے لگا جیسے کہ ان سے پہلے بہتا تھا، جاہلیت نے اپنے پچھلے نقصانوں کے ساتھ گاڑے، ان کے جانشین نے (جس کو سلیمان ان کے بعد خلیفہ بنا گیا تھا) اور اس کے جانشینوں نے اس مختصر وقفہ کی تلافی کی پوری کوشش کی اور حکومت کو اسی ڈول پر لے آئے جس پر وہ سلیمان کے زمانہ تک تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ شخصی و موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت و کامیابی کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں "نفاق" کے جراثیم اور "مترفین منعمین" (گذشتہ امتوں کے دولت مندوں اور عیش پسندوں) کے اخلاق و اعمال پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، سوسائٹی میں تعیش کا عمومی رجحان پیدا ہو گیا تھا، ایمان و عمل صالح کی زندگی جو اس امت کا قیمتی سرمایہ، اس کی قوت کا راز اور نبوت کا ایک بیش قیمت ترکہ تھا اس وقت خطرہ میں تھی، اندیشہ تھا کہ یہ امت اخلاقی حیثیت سے دنیا پرست اور روحانی حیثیت سے کھوکھلی نہ ہو جائے، قلوب میں سردی و افسردگی، ایمان میں کمزوری اور تعلق باللہ میں اضمحلال بڑی شدت و سرعت سے پیدا ہو رہا تھا اور یہ بڑی تشویش کی بات تھی، حکومت اس جوہر کی حفاظت اور پرورش سے نہ صرف غافل و بے تعلق تھی بلکہ اس کا وجود اور اس کے نمایندے اس مقصد کے لئے حقیقی خطرہ

بیٹھے ہوئے تھے اور اپنی ذاتی سیرت و کردار سے وہ اس اخلاقی انحطاط کے محرک و داعی تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں ایمان، اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندہ تعلق اور انابت و عبودیت کی جو کیفیات پیدا کی تھیں اور جو ایک نبی ہی پیدا کر سکتا ہے وہ روبہ تنزل تھیں، یہ وہ کمی تھی جو حکومت کے رقبہ کی توسیع اور بڑی سے بڑی فتوحات سے پوری نہیں کی جا سکتی تھی اور جو ایک مرتبہ زائل ہونے کے بعد (پچھلی امتوں کی تاریخ اس کی شاہد ہے) بڑی مشکل سے واپس لائی جا سکتی ہیں۔

اگر اس سرمایہ کی حفاظت نہ کی جاتی اور زمانہ کے اثرات اور اخلاقی و سیاسی عوامل کو آزادی کے ساتھ اپنا عمل کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو یہ امت بھی سابقہ امتوں کی طرح ایک نفس پرور، آخرت فراموش، مادہ پرست قوم بن کر رہ جاتی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری ایام میں سب سے زیادہ خطرہ اسی بات کا تھا کہ یہ دنیا مسلمانوں کو ہضم نہ کر لے اور وہ اگلی امتوں کی طرح اس کے دھارے میں پڑ کر ضائع نہ ہو جائیں۔ آپ نے وفات سے چند دن پہلے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس میں صاف صاف کہا تھا۔

ما الفقر اخشیٰ علیکم ولکن اخشیٰ علیکم ان تبسط الدنیا علیکم کما بسطت علی من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا فتھلککم کما اھلکتھم۔	مجھے تمہارے بارے میں فقر و افلاس کا خطرہ نہیں مجھے جو کچھ خطرہ ہے وہ اس بات کا کہ دنیا تم پر اتنی کشادہ و فراخ ہو جیسی کہ تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی اور تم بھی اس میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرو اور وہ تم کو بھی وہ اسی طرح ہلاک کر دے جیسے اگلوں کو ہلاک کیا۔

تابعین کی دعوتِ ایمانی

یہ خطرہ جس کا زبانِ نبوت نے اظہار کیا تھا جلد ہی پیش آگیا، لیکن اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے

اللہ کے کچھ مخلص و سرفروش بندے میدان میں آئے جنھوں نے اپنی قوت ایمانی، سوز دروں، محبت و تربیت، وعظ و نصیحت اور دعوت و تلقین سے لاکھوں آدمیوں کو دین کے اس طوفان میں تنکے کی طرح بہنے سے بچایا، اور خود اس سیلاب کی رفتار کو سست کر دیا۔ انھوں نے امت کے ایمانی و روحانی تسلسل کو قائم رکھا جو اس کے نسلی و سیاسی تسلسل سے زیادہ ضروری تھا اور اس کی زندگی میں وہ خلا نہیں آنے دیا جس میں وہ محض ایک بے روح اور بے یقین قوم بن کر رہ جائے۔ اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے فضلائے تابعین کی ایک سربرآوردہ جماعت تھی جن میں سعید بن جبیرؒ، محمد بن سیرینؒ اور شعبیؒ خاص طور سے ممتاز تھے۔

حسن بصریؒ

لیکن اس خطرہ کے اصل حریف اور ایمانی دعوت کے علمبردار حضرت حسن بصریؒ ہیں، جو ۲۱ھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد یسار مشہور صحابی حضرت زید بن ثابتؓ کے آزاد کردہ غلام تھے اور خود انھوں نے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

حسن بصریؒ کی شخصیت ان کی داعیانہ صلاحیتیں

حضرت حسن بصریؒ میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام صلاحیتیں جمع فرمادی تھیں، جو اس دور کے مخصوص حالات میں دین کا وقار بڑھانے اور دینی دعوت کو مؤثر بنانے کے لئے درکار تھیں، ان کی شخصیت بڑی جامعیت، دل آویزی اور کشش کی تھی، ایک طرف وہ دین میں پورا تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے، بلند پایہ مفسر اور مستند محدث تھے جس کے بغیر اس وقت کوئی اصلاحی کوشش انجام نہیں پاسکتی تھی، صحابۂ کرامؓ کا انھوں نے اچھا خاصا زمانہ پایا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے غور سے ان کا مطالعہ کیا تھا، مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی معاشرہ میں جو تغیرات پیش آئے تھے ان پر گہری نظر رکھتے تھے، اپنے زمانہ کی سوسائٹی، ہر طبقہ کی زندگی اور معاشرہ

سے وہ پورے طور پر باخبر تھے اور اس کی خصوصیات اور اس کی بیماریوں سے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح واقف تھے وہ بڑے فصیح و بلیغ اور شیریں زبان تھے وہ جب گفتگو کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے جب آخرت کا بیان کرتے تھے یا صحابہ کرام کے دور کی تصویر کھینچتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں حجاج بن یوسف کا سا زبان آور اور قادر الکلام اس اخیر دور میں نہیں گذرا، لوگ حسن بصری اور حجاج کو فصاحت میں ہم پایہ سمجھتے تھے مشہور امام لغت ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں کہ میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف سے بڑھ کر فصیح نہیں دیکھا اور حسن حجاج سے زیادہ فصیح تھے۔[1] وسعت علم کا یہ حال تھا کہ ربیع بن انس کہتے ہیں کہ میں دس برس تک حسن بصری کے پاس آتا جاتا رہا، ہر روز ان سے کوئی ایسی بات سنتا تھا جو اس سے پہلے نہیں سنی۔[2] ایک شخص نے ان کی اس جامعیت کو اس طرح بیان کیا۔

كان من دون البرايا اجمع علما وتقوى	وہ اپنے علم و تقویٰ، زہد و ورع، و استغنا، و معرفت
وزهدا وورعا وعفة ورقة وفقها	لطافت، تفقہ اور علم کے اعتبار سے ایک درخشاں
ومعرفة يجمع مجلسه ضروبا من الناس	ستارہ تھے، ان کی مجلس میں ہر قسم کے لوگ بیٹھتے
هذا يأخذ عنه الحديث وهذا يلقن	تھے اور ہر ایک فیض پاتا تھا ایک شخص حدیث
منه التأويل وهذا يسمع منه الحلال	حاصل کرتا ہے، ایک تفسیر پر استفادہ کرتا ہے، ایک
والحرام وهذا يحكي له الفتيا وهذا	فقہ کا درس لے رہا ہے اور ایک فتویٰ پوچھ رہا ہے
يتعلم الحكم والقضاء وهذا يسمع الوعظ	کوئی مقدمات فیصل کرنے اور قضا کے قواعد سیکھ رہا
وهو في جميع ذلك كالبحر العجاج تدفقا	ہے کوئی وعظ سن رہا ہے اور وہ ایک بحر ذخار ہیں یا
وكالسراج الوهاج تألقا ولا تنس مواقفه	تو ہیں جو رواں ہے اور ایک روشن چراغ ہیں، ان کی مجلس کو
ومشاهده في الامر بالمعروف والنهي	بھلا کرنا، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے

---

[1] دائرۃ المعارف بستانی ج ۶، ص ۷۴۴   [2] ایضاً۔

[illegible] بالكلام الفصل واللفظ الجزل۔؎1

[illegible] بڑی فصاحت اور شستہ الفاظ میں بیان کرتے
واقعات جاہلیت کی خبر نہیں۔

اس سب کے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر ان کی تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محض صاحب قال اور صاحب کمال نہ تھے بلکہ صاحب دل اور صاحب حال بھی تھے، وہ جو کچھ کہتے تھے ان کے دل سے نکلتا تھا اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، جس وقت وہ تقریر کرتے تھے سراپا درد و اثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ گو بصرہ و کوفہ میں بڑے بڑے صاحب علم اور صاحب درس تھے مگر ان کے حلقۂ درس میں مقناطیس کی کشش تھی، ان کے مواعظ و بیانات کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو کلام نبوت سے بڑی مناسبت تھی۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ اس پر اتفاق ہے کہ حسن بصریؒ کا کلام انبیاء علیہم السلام کے طرز کلام سے بڑی مناسبت رکھتا ہے، ایسی مناسبت و روحانیت ان کے کلام میں [illegible] دیکھی گئی، اسی طرح ان کا طرز زندگی صحابہ کرامؓ کے طرز زندگی سے بہت مشابہ تھا۔؎2

ان کی ان خصوصیات و جامعیت کا یہ اثر تھا کہ لوگ ان کی شخصیت سے مسحور تھے اور ان کو امت محمدی کے ممتاز ترین افراد میں شمار کرتے تھے، تیسری صدی کے ایک غیر مسلم فلسفی ثابت بن قرہ کا مقولہ ہے کہ امت محمدیہ کی جن چند ممتاز ترین شخصیتوں پر دوسری امتوں کو رشک آنا چاہئے ان میں حسن بصریؒ بھی ہیں، مکہ معظمہ ہمیشہ سے عالم اسلام کا مرکز ہے، وہاں ہر فن کے صاحب کمال آتے رہتے ہیں، لیکن اہل مکہ حسن بصریؒ کا علم دیکھ کر ان کی تقریریں سن کر ششدر رہ گئے کہ ہم نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا۔؎3

حسن البصریؒ کے مواعظ

حسن بصریؒ کے مواعظ دور صحابہ کی قوت و صداقت کا نمونہ ہیں، ان میں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی

؎1 البیان والتبیین [illegible] نقل کیا ہے ؎2 احیاء العلوم [illegible] ؎3 [illegible]

زندگی کی بے وفائی، اور آخرت کی اہمیت کا مضمون، ایمان و عمل کی تلقین، تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی تعلیم طولِ امل اور فریبِ نفس کی مذمت ملتی ہے، اور اس دور میں جب یہ بیماریاں اور غفلت کا سخت زور ہو رہا تھا اور عوام اور بہت سے خواص دولت اور عیش و عشرت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جا رہے تھے ان ہی مضامین کی ضرورت تھی۔ انہوں نے چونکہ صحابہ کرامؓ کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور ان کی صحبت کا فیض اٹھایا تھا اب حکومتِ امویہ کا شباب دیکھ رہے تھے، اس لئے وہ اپنے مواعظ میں اکثر بڑے درد و جوش کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی ایمانی کیفیات اور ان کی اخلاقی و عملی خصوصیات بیان کرنے لگتے ہیں، اور جب وہ ان دونوں زمانوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس عظیم انقلاب کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں جو ان کو دیکھتے دیکھتے ایمان و عمل اور اخلاق و عادات میں رونما ہوا تھا تو ان کا درد اور جوش بہت بڑھ جاتا ہے اور ان کے مواعظ تیر و نشتر بن جاتے ہیں، اور ان کے مواعظ اپنی دل آویزی اور دل نشینی کے علاوہ اس دور کی فصیح و بلیغ زبان اور اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں، ایک موقع پر اہلِ زمانہ پر تبصرہ، صحابہ کرامؓ کا تذکرہ اور اسلامی اخلاق کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

حبال حبال اهلك الناس الاماني	اے افسوس! لوگوں کو امیدوں اور خیالی منصوبوں نے
قول بلا عمل ومعرفة بغير صبر وايمان	غارت کیا، زبانی باتیں ہیں عمل کا نام و نشان نہیں، علم ہے
بلا يقين ما لي ارى رجالا ولا ارى	مگر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے صبر نہیں، ایمان ہے
عقولا واسمع حسيسا ولا ارى انيسا	مگر یقین سے خالی، آدمی بہت نظر آتے ہیں مگر عقلمند نہیں آتا
دخل القوم والله ثم خرجوا وعرفوا	آنے جانے والوں کا شور ہے مگر ایک بھی مونس نظر
ثم انكروا وحرموا ثم استحلوا انما دين	نہیں آتا جس سے دل لگے، لوگ داخل ہوئے اور پھر
احدكم لعقة على لسانه اذا سئل امؤمن	نکل گئے، انہوں نے سب کچھ جان لیا پھر مکر گئے، حرام
انت بيوم الحساب؟ قال نعم كذب	سمجھا پھر اسی کو حلال کر لیا، تمہارا دین بس یہ ہے
ومالك يوم الدين انه من اخلاق	زبان کا ایک چٹخارہ ہے، اگر پوچھا جائے کیا تم روزِ جزا

المؤمنين قوة في دين وايماناً في يقين	پر یقین رکھتے ہو اور جواب ملتا ہے کہ اس زبان تم
وعلماً في حلم وحلماً بعلم وكيساً في	ہے روز جزا کے مالک کی عطا کر۔ مومن کی نشانیاں
رفق وتجملاً في فاقة وقصداً في غنى	یہ ہیں کہ وہ قوی فی الدین ہو، صاحب ایمان و یقین
وشفقة في نفقة ورحمة للمجهود وعطاءً	ہو، اس کے حلم کے ساتھ علم ہو، اس کے علم کے ساتھ حلم
في الحقوق وانصافاً في استقامة لا يحيف	زیرک ہو، عقلمند ہو لیکن نرم خو ہو، اس کی تونگری
على من يبغض ولا يأثم في مساعدة من	اور ضبط اس کے فقر و افلاس میں بھی پردہ داری کرے
يحب ولا يهمز ولا يغمز ولا يلمز ولا يلغو	دولت ہو تو اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے
ولا يلهو ولا يلعب ولا يمشي بالنميمة	پائے، خرچ کرنے میں شفیق، خستہ حالوں کے حق میں
ولا يتبع ما ليس له ولا يجحد الحق الذي	رحیم و کریم، حقوق کی ادائیگی میں کشادہ دست، فراخ دل
عليه ولا يتجاوز في العذر ولا يشمت	انصاف میں سرگرم، ثابت قدم، کسی سے نفرت ہو تو اس کے
بالمصيبة ان حلت بغيره ولا يسر	حق میں ظلم نہ کرے، اپنے کسی سے محبت ہو تو اس کی
بالمعصية اذا نزلت بسواه المؤمن	مدد میں حد سے تجاوز نہ کرے، نہ عیب جوئی کرتا ہو
في الصلوة خاشع والى الركوع سارع	نہ طنز و اشارہ، نہ طعن و تشنیع، نہ لایعنی سے اس کو کام
قوله شفاء وصبره تقى وسكوته فكرة	ہو، نہ لہو و لعب میں مشغول، نہ چغلی کرتا ہو، جو اس کا حق
ونظره عبرة يخالط العلماء ليعلم	نہیں اس کے پیچھے نہیں پڑتا، جو اس پر واجب ہے
ويسكت بينهم ليسلم ويتكلم ليغنم	اس کا انکار نہیں کرتا، معذرت میں حد سے نہیں بڑھتا
ان احسن استبشر وان أساء استغفر	دوسرے کی مصیبت پر خوش نہیں ہوتا، دوسرے کی
واذا عتب استعتب وان سفه عليه	معصیت پر اس کو مسرت نہیں ہوتی، مومن کی نماز
حلم وان ظلم صبر وان جير عليه	میں خشوع ہے، رکوع کی جانب لپکتا ہے، اس کا کلام

عدل ولا يتعوذ بضمانته ولا يستعين
الا بالله وقور في الملاء شكور في الخلاء
قانع بالرزق حامد على الرخاء صابر
على البلاء ان جلس مع الغافلين كتب
من الذاكرين وان جلس مع الذاكرين
كتب من المستغفرين هكذا كان
اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم
الاول فالاول حتى لحقوا بالله عزوجل
وهكذا كان المسلمون من سلفنا الصالح
وانما غيروا لما غيروا ان الله لا يغير
ما بقوم حتى يغيروا ما بانفسهم واذا
اراد الله بقوم سوء فلا مرد له وما لهم
من دونه من وال [1]

شعار کا بیان ہے اس کا صبر تھوڑی اس کی سکوت سراسر
غور و فکر اس کی نظر سراپا عبرت اس کی صحبت
اختیار کرنا ہے علم کی خاطر اور خاموش رہتا ہے تو اس لیے کہ گناہ
سے محفوظ رہے بولتا ہے تو اس لیے کہ ثواب لے سکے
[illegible]
سوال ہو تو سمجھنا کی خاطر [illegible]
دل میں کسی کی طرف [illegible]
[illegible]
کیا جاتا ہے تو وہ صبر کرتا [illegible]
کے تو وہ ایسا [illegible]
[illegible]
[illegible]
کے ذریعہ [illegible] مصیبت [illegible]
غافلوں میں ذاکر [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

---

[1] الحسن البصری لابن الجوزی ص [illegible]

ایک دوسرے موقع پر صحابہ کرام کو یاد کرتے ہوئے اور سورۃ الفرقان کی ان آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے جن میں مومنین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں فرمایا۔

ان المؤمنين لما جاءتهم هذه الدعوة	مومنین (اولین) کے کان میں جب خدا کی پکار
من الله صدقوا بها وافضى يقينها الى	پہنچی تو انھوں نے اسی وقت اس کی تصدیق کی اور
قلوبهم فخشعت لله قلوبهم وابدانهم	اس کا یقین ان کے دلوں کی گہرائی میں
وابصارهم كنت والله اذا رأيتهم	اتر گیا ان کے دل ان کے بدن اور ان کی نگاہیں خدا کی
رأيت قوما كأنهم رأي عين والله	عظمت اور ہیبت میں جھک گئیں بخدا میں جب ان کو
ما كانوا باهل جدل ولا باطل ولكنهم	دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ حق تعالیٰ اور غیب کی باتیں
جاءهم امر من الله فصدقوا به فنعتهم	گویا ان کی آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں ان کو بحث و مباحثہ
الله في القرآن احسن نعت فقال وعباد	اور فضول باتوں سے کچھ کام نہ تھا حق تعالیٰ کا امر آتا وہ یقین کر لیتے
الرحمن الذين يمشون على الارض	چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف قرآن مجید
هونا والهون في كلام العرب اللين و	میں بہترین پیرایہ میں کی ہے حق تعالیٰ فرماتا ہے
السكينة والوقار واذا خاطبهم الجاهلون	رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ
قالوا سلاما حلماء لا يجهلون وان	چلتے ہیں آیت میں ہونًا کا لفظ آیا ہے ہون
جهل عليهم حلموا يصاحبون	کے معنی کلام عرب میں نرمی اور تسکین اور وقار کے ہیں اور
عباد الله نهارهم بما يسمعون	فرمایا اور جب ان سے جاہل لوگ بات کریں تو کہتے ہیں سلام
ثم ذكر ليلهم خير ليل فقال والذين	یعنی وہ بردبار و حلیم ہیں جہالت نہیں برتتے اور
يبيتون لربهم سجدا وقياما ينتصبون	اگر کوئی دوسرا جہالت برتے تو ان کے حلم و وقار میں
لله على اقدامهم ويفترشون وجوههم	فرق نہیں آتا یہ لوگ اللہ کے بندوں کے ساتھ دن کو

تجري دموعهم على
خدودهم فرقا من ربهم لامر ما
سهروا ليلهم ولامر ما خشعوا نهارهم
قال الذين يقولون ربنا اصرف
عنا عذاب جهنم ان عذابها كان
غراما " وكل شيء يصيب ابن آدم ثم
يزول عنه فليس بغرام انما الغرام
اللازم له ما دامت السموات والارض
صدق الحسن والله الذي لا اله الا هو
[illegible] فيا ايها المرء [illegible]
[illegible] الله [illegible]
[illegible] في الدنيا والآخرة ۔ له

بات سے کہ ڈر [illegible] آنسو چہروں پر بہتے
رہتے تھے [illegible]
وہ لوگ اپنے رب کے سامنے [illegible] رات
گزارتے ہیں [illegible]
[illegible] کو ہم سے [illegible] کیونکہ اس کا عذاب [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اس کا عذاب [illegible] جائے [illegible]
کا معنا یہ ہے جو مصیبت انسان کو [illegible]
اس کو [illegible] وہ مصیبت ہے جو باقی
[illegible]
[illegible] کے بندے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سے کہیں بہتر ہے [illegible] دنیا و آخرت [illegible] عطا فرمائی

له قیام اللیل ص ۲۰ ۔ مصنفہ محمد بن نصر مروزی تلمیذ امام احمد بن حنبل

اس تقریر کے آخر میں فرمایا، اور اکثر مواعظ کے بعد فرماتے کہ اس وعظ و نصیحت میں تو کوئی کمی نہیں، لیکن دلوں میں زندگی بھی تو ہو۔

ان کی حق گوئی و بیباکی

ان کے کمالات فصاحت و بلاغت، تبحر علمی اور تقریر و تاثیر ہی تک محدود نہ تھے بلکہ وہ اپنے زمانہ میں حق گوئی و بیباکی، اخلاقی جرأت و شجاعت میں بھی ممتاز تھے، انھوں نے خلیفۂ وقت یزید بن عبدالملک پر برملا تنقید کی۔ ایک موقع پر درس میں کسی شخص نے سوال کیا کہ اس زمانہ کے فتن (یزید ابن المہلب اور ابن الاشعث کی شورش) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ نہ اس کا ساتھ دو، نہ اس کا ساتھ دو، ایک شامی نے کہا اور نہ امیر المومنین کا؟ یہ سن کر آپ کو غصہ آگیا، پھر ہاتھ اٹھا کر کہا ہاں نہ امیر المومنین کا، ہاں نہ امیر المومنین کا[1] حجاج کی تلوار اور سفاکی مشہور ہے مگر حسن کی زبان اس کے زمانہ میں بھی اظہار حق سے باز نہ آئی اور اس کے متعلق بھی انھوں نے اپنے ضمیر و عقیدہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔

اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین

اسلام کے سیاسی و مادی اثر و اقتدار سے اسلامی مملکت میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے اسلام کو قبول تو کر لیا تھا مگر اس کے اخلاق و معاملات اور قلب و دماغ پوری طرح اسلام سے متاثر نہیں ہو سکے تھے اور ان میں حقیقی ایمان و اخلاص نہ تھا، "ادخلوا فی السلم کافۃ" (اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کی شان پیدا نہیں ہوئی تھی، تو مسلمانوں کی نئی نسل میں جس کی پوری اسلامی تربیت نہیں ہو سکی تھی، بکثرت ایسے افراد تھے جو جاہلی اثرات سے پاک نہیں ہوئے تھے اور اسلام سے ان کو گہرا تعلق اور زندگی میں احکام الٰہی کے سامنے

---

[1] طبقات ابن سعد [illegible]

انقیاد و تسلیم کی نوبت نہیں پیدا ہوئی تھی، ان میں خاصی تعداد میں تھے، بالخصوص حکومت کے عہدیدار اور افسر زیادہ تر ایسے ہی لوگ تھے جن میں قدیم منافقین کے اخلاق و خصائل اور ان کی ذہنیت و عادات کا پورا نظر آتا تھا، یہی لوگ عموماً زندگی پر چھائے تھے، درباروں میں، حکومت میں کلیدی جگہوں پر قبضہ میں بادشاہوں میں انہی کو غلبہ تھا، انہی کا طرز زندگی سوسائٹی میں فیشن کی حیثیت رکھتا تھا۔

بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ نفاق ایک وقتی و مقامی بیماری تھی جو عہد رسالت میں مدینہ طیبہ کے مخصوص حالات کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی، اسلام کے غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کے بعد وہ ختم ہو گئی، اس لئے کہ دو قوتوں کی کشمکش جاتی رہی اور صرف اسلام باقی رہ گیا، اس لئے قدرتی طور پر کسی ایسے گروہ کے پیدا ہونے کا موقع نہیں رہا جو ان دونوں کے درمیان متردد و مذبذب ہو، اور کسی ایک کا وفادار اور مخلص رفیق نہ بن سکے، اب یا تو کھلا ہوا کفر ہے یا غلبۂ اسلام، ان دونوں کے درمیان تذبذب کی کوئی وجہ نہیں، تفسیر و تاریخ میں اس خیال کے اثرات ملتے ہیں۔

ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ نفاق فطرت انسانی کی ایک کمزوری اور بیماری ہے جو اسی کی طرح پرانی اور عام ہے، اس بیماری کے پیدا ہونے کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسلام و کفر کی دو متقابل طاقتیں میدان میں ضرور ہوں اور ان میں کشمکش جاری ہو، خالص اسلام کے غلبہ و اقتدار کی حالت میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو کسی وجہ سے اسلام کو ہضم نہیں کر پاتا، اور وہ اس کے دل و دماغ میں گھر نہیں کر سکتا، لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کا انکار اور اس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے یا اس کے مصالح اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان فوائد سے دست بردار ہو جائے جو اسلام کے انتساب سے اس کو کسی اسلامی سلطنت یا مسلمان سوسائٹی میں حاصل ہیں، اس لئے یہ ساری عمر اس دو عملی اور تذبذب کی حالت میں رہتا ہے، اس کی نفسی کیفیات، اس کے اعمال و اخلاق، اس کی اخلاقی کمزوری، اس کی مصلحت شناسی، موقع پرستی، زندگی سے تمتع و لطف اندوزی کا جذبہ، دنیا پرستی، بیباکی، آخرت فراموشی، اہل اقتدار کے سامنے روباہ مزاجی اور کمزوروں اور غریبوں پر دست درازی منافقین اولین کی یاد تازہ کرتی ہے۔

"نفاق" و "منافقین" کی تاریخ

حضرت حسن بصریؒ کی یہ بہت بڑی دینی ذہانت تھی کہ انھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ نفاق موجود اور زندہ ہے اور منافقین نہ صرف موجود ہیں بلکہ زندگی پر اثرانداز اور سلطنت میں دخیل ہیں، اور انہی سے شہروں کی چہل پہل ہے۔ کسی نے ان سے کہا کہ اس زمانہ میں بھی "نفاق" پایا جاتا ہے؟ فرمایا۔

لو خرجوا من البصرة لاستوحشتم فیھا۔[1] — اگر منافقین بصرہ کی گلیوں سے نکل جائیں تو تمہارا شہر میں جی لگنا مشکل ہو جائے۔

یعنی شہر کی آبادی میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام سے برائے نام تعلق ہے اور اسلام [illegible] دل سے [illegible] نہیں یا وہ اپنے اعمال و اخلاق کے لحاظ سے اسلامی سیرت سے آراستہ نہیں۔ ایک دوسرے موقع پر انھوں نے فرمایا۔

یا صاحبی [illegible] — [illegible] ہے اس است پر [illegible]

منافق قهرها واستأثر علیها۔[2] — غالب آگئے ہیں اور سے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔

---

[1] متاخرین میں سے شاہ ولی اللہ صاحب بھی اسی کے قائل ہیں کہ نفاق ہر زمانہ میں موجود اور زندہ ہے اور منافقین کا وجود کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں [illegible] نفاق اعتقادی اور نفاق عملی [illegible] نفاق اعتقادی کا قطعی علم تو زمانہ رسالت کے بعد انقطاع وحی کی وجہ سے مفقود ہے لیکن نفاق عملی اور نفاق اخلاق [illegible] کے متعلق [illegible] کہ اب وقت نفاق بکثرت موجود ہے [illegible] [illegible] و صاحبان [illegible] را بعضی شارع نسبت کردہ اند و نفاق [illegible] فرق نیست درمیان آنکہ کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے واسطہ شنید نفاق [illegible] [illegible] [illegible]

[2] صفۃ النفاق و ذم المنافقین للحافظ محدث ابو بکر فریابی ص۵۳   [3] ایضا ص۵۴

یعنی حکومت میں وہ عنصر موجود ہے جو اسلام اور مسلمانوں کا مخلص نہیں اور جس کو صرف اپنے اغراض و منافع سے دلچسپی ہے۔

حسن بصریؒ کی دعوت و اصلاح کی طاقت و تاثیر میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ انھوں نے زندگی کا ایک سرا پکڑ لیا اور سوسائٹی کی اصل بیماری کی طرف توجہ کی، ان کے زمانہ میں بہت سے واعظ اور داعی تھے لیکن اس زمانہ کے معاشرہ نے کسی کے وجود اور کسی کی دعوت کو اس طرح محسوس نہیں کیا جس طرح حسن بصریؒ کے وجود اور ان کی دعوت کو محسوس کیا، اس لیے کہ ان کی تقریروں اور ان کے درد و کرب میں بگڑے ہوئے معاشرہ پر زد پڑتی تھی، وہ نفاق کی حقیقت بیان کرتے تھے اور نفاق ایک مرض تھا جو اس سوسائٹی میں پھیل رہا تھا، وہ منافقین کے اوصاف و اخلاق بیان کرتے تھے اور یہ اوصاف و اخلاق بہت سے لوگوں میں پائے جاتے تھے جو حکومت و ثروت اور تجارت میں پیش پیش تھے اور زندگی میں نمایاں تھے، وہ آخرت فراموشی اور دنیا پرستی کے بحران کی مذمت کرتے تھے اور بکثرت لوگ اس دنیا کا شکار تھے، وہ موت اور آخرت کی تصویر کھینچتے تھے، وہ ان حقیقتوں کو مستحضر کراتے تھے اور حریصین و غافلین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کی زندگی ان چیزوں کے بھلا دینے پر مبنی تھی۔

غرض ان کی دعوت ان کے مواعظ اور ان کی مجالس درس اس زمانہ کی خواہشات و اغراض سے اس طرح متصادم تھے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کے لیے ان سے بے تعلق رہنا مشکل ہو گیا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت لوگ ان کی تقریروں اور مجلسوں سے چوٹ کھا کر پچھلی زندگی سے تائب ہوتے تھے اور نئی زندگی اختیار کرتے تھے، وہ اپنی تقریروں اور مجلسوں سے دین و ایمان کی دعوت بھی دیتے تھے اور اپنی صحبت و دل سے نفوس کی تربیت اور تزکیہ بھی کرتے تھے، ساٹھ سال کی طویل مدت انھوں نے اسی دعوت و اصلاح میں گذاری، کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ کتنے نفوس کو ان کی وجہ سے حلاوت ایمان اور حقیقت اسلام نصیب ہوئی، عوام بن حوشب کہتے ہیں کہ حسن نے ساٹھ برس تک اپنی قوم میں وہ کام کیا جو انبیاء کرام (ختم نبوت سے پہلے) اپنی امتوں میں کرتے تھے[1]

---

[1] [illegible]

حسن بصریؒ کی وفات اور ان کی مقبولیت

اس خلوص، دینی انہماک اور علمی و روحانی کمالات کا یہ اثر تھا کہ سارا بصرہ ان کا گرویدہ تھا، ۱۱۰ھ میں ان کا جب انتقال ہوا تو سارے شہر نے ان کے جنازہ کی مشایعت کی اور بصرہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ پوری آبادی کے قبرستان چلے جانے کی وجہ سے اس دن شہر کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہیں ہو سکی۔

حسن بصریؒ کے بعد ان کے روحانی و علمی جانشینوں نے اور اپنے اپنے زمانہ کے داعیوں نے دعوت الی اللہ، دعوتِ آخرت اور دعوتِ ایمان و عمل کے تسلسل کو جاری رکھا اور درمیان میں کوئی خلا واقع نہیں ہونے دیا۔ حسن بصریؒ کی وفات کے بائیس برس بعد خلافتِ امویہ کا خاتمہ اور خلافتِ عباسیہ کا آغاز ہوا، اور دمشق کے بجائے بغداد دار الخلافت اور پورے مشرق کا مرکزِ توجہ بن گیا۔

انقلابِ حکومت کی کوششیں

ان اصلاحی کوششوں اور دعوت و تذکیر کے تسلسل کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس کی کوشش بھی جاری رہی کہ خلافت کو اس کے صحیح مرکز پر قائم کیا جائے اور اس اجارہ داری کو ختم کر دیا جائے جو امویوں اور ان کے بعد عباسیوں نے قائم کر رکھی تھی، خلافت غلطی سے ایسی قومی و نسلی بنیادوں پر قائم ہو گئی تھی کہ اس کے مقابلہ میں کوئی آواز اور کوئی تحریک اس وقت تک مؤثر نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ اس کو شرافتِ نسب اور علوِ خاندان کی سند حاصل نہ ہو اور اس کی پشت پر خاندانی طاقت و عصبیت نہ ہو، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے خلافتِ امویہ اور خلافتِ عباسیہ کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا ان کا تعلق اہلِ بیت سے تھا کہ ان کی کامیابی کا زیادہ امکان تھا، لیکن وہ امت کے دینی رجحان کے نمائندے بھی تھے اور ان کو مسلمانوں کے دینی عنصر اور اصلاح پسند جماعتوں کی ہمدردی اور تائید حاصل تھی۔

عہ بصرہ کی مرکزیت اول کا سبب یہ تھا کہ وہ مرکزِ خلافت کے پایۂ تخت دمشق کے بعد اسلامی ملک میں دوسرے مرتبہ کا شہر شمار ہوتا تھا۔
(ماخوذ از ابن خلکان و حسن بصری)

واقعۂ کربلا کے بعد بھی خاندانِ نبوت کے متعدد افراد نے انقلاب کی کوشش کی۔ سیدنا حسین علیہ السلام کے بعد ان کے پوتے زید بن علی بن الحسین نے ہشام بن عبد الملک کے مقابلہ میں علم جہاد بلند کیا اور ۱۲۲ھ میں شہید مصلوب ہوئے۔ امام ابوحنیفہ نے ان کی خدمت میں دس ہزار درہم بھیجے اور حاضر نہ ہو سکنے پر معذرت[1] کی۔ ان کے بعد بنی حسن میں سے حضرت محمد ذوالنفس الزکیہ بن عبداللہ المحض ابن الحسن المثنیٰ بن سیدنا حسن بن علیؓ نے مدینہ طیبہ اور ان کے مشورہ سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے کوفہ میں منصور کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک[2] ان کی تائید و حمایت میں تھے۔ امام ابوحنیفہ نے برملا ان کی تائید کی اور کچھ رقم بھی ان کی خدمت میں بھیجی۔ منصور کے فوجی افسر حسن بن قحطبہ کو ابراہیم کا مقابلہ کرنے سے باز رکھا اور اس نے خلیفہ سے معذرت کر دی[3]۔ اول الذکر رمضان ۱۴۵ھ میں مدینہ طیبہ میں اور آخر الذکر ذوالقعدہ ۱۴۵ھ میں کوفہ میں شہید ہوئے۔ بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کے استحکام اور وسیع انتظامات کی وجہ سے اگرچہ یہ سب کوششیں ناکام رہیں لیکن انہوں نے امت میں غلط اقتدار کے خلاف جدوجہد اور اعلان حق کی ایک نظیر قائم کر دی، اگرچہ ظاہراً وہ کامیاب نہیں ہو سکے لیکن ان کی کوششوں کا یہ دینی اثر قربانی اور جدوجہد کا یہ تسلسل کچھ کم نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ کی آبرو انہیں جواں مردوں سے قائم ہے جنھوں نے غلط اقتدار اور دوسری ترغیبات کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور صحیح مقصد کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیا۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ

---

[1] مناقب ابی حنیفہ بزازی۔ ج ۱ ص ۵۵

[2] امام مالک نے اہل مدینہ کو محمد ذوالنفس الزکیہ کی رفاقت و حمایت کا فتویٰ دیا اگرچہ وہ منصور کی بیعت کر چکے ہوں (ابن اثیر الکامل ج ۵ ص ۲۰۰)

[3] بعض مورخین کا خیال ہے کہ ابوحنیفہ کی قید اور منصور کی بد سلوکی کی اصل وجہ ان کا عہدۂ قضا سے انکار نہ تھا بلکہ در اصل محمد و ابراہیم کی حمایت تھی جس کا منصور کو علم تھا۔ اس باب کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔

خلافتِ عباسیہ اور دینی دعوت و تذکیر

خلافتِ عباسیہ اور اس کے اثرات

خلافتِ عباسیہ، خلافتِ امویہ کی پوری پوری جانشین تھی، وہی دنیاداری کی روح، وہی شخصی و موروثی سلطنت کا نظام و آئین اور وہی اس کی خرابیاں اور بُرے نتائج، وہی بیت المال میں آزادانہ تصرف، وہی عیش و عشرت کی گرم بازاری، فرق اتنا تھا کہ امویوں کی سلطنت میں اور ان کے زمانہ کی سوسائٹی میں عربی روح کارفرما تھی اس کی خرابیاں اور بے اعتدالیاں بھی اسی نوع کی تھیں، عباسی سلطنت کے جسم میں عجمی روح داخل ہو گئی تھی اور عجمی قوموں اور تہذیبوں کے امراض و عیوب اپنے ساتھ لائی تھی، سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ابر کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر فخر سے اطمینان سے کہا۔

امطری حیث شئت فسیاتینی   جہاں تیرا جی چاہے جا کر برس، بالآخر پیداوار
خراجک۔   کا خراج بہرحال میرے ہی پاس آئے گا۔

ابن خلدون کے اندازہ کے مطابق سلطنتِ عباسیہ کی سالانہ آمدنی ہارون رشید کے زمانہ میں سات ہزار پانچ سو قنطار (سات کروڑ ڈیڑھ لاکھ دینار) سے زیادہ تھی یعنی اکتیس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ (۳۱۵......) سالانہ سے زائد[1] جو اس زمانہ کے اعتبار سے بہت بڑی مالیت تھی، ہارون کے زمانہ میں ایک

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۵۱

کافی اضافہ ہوا۔ اس کثیر آبادی میں سب سے بڑی سلطنت کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے ساری دنیا کا سامانِ عیش و عشرت اور ساری دنیا کے اہلِ کمال، حسنا، ذوقین، علماء، ندیمان، مصاحب، شعراء اور خوش باش و خوش فکر سمٹ کر بغداد میں آگئے تھے۔ دولت کی فراوانی، عجمیوں کے اختلاط سے تمدن کی مادی خرابیاں اور تمدن و زندگی کی ساری بے اعتدالیاں دار السلام، مرکزِ اسلام میں شروع ہو گئی تھیں۔[1] دولت کی بہتات، مال کی بے وقعتی اور اس وقت تنعم و تعیش کا اندازہ کرنے کے لئے تاریخ میں مامون کی شادی کا حال پڑھ لینا کافی ہے۔ مورخ لکھتا ہے:-

> مامون نے فم الصلح میں تمام ارکان دولت، کل فوج و تمام افسران ملک و خدام حسن بن سہل وزیر اعظم جس کی لڑکی سے مامون کی شادی ہو رہی تھی، کا مہمان ہوا اور [illegible] عظیم الشان دعوت کی ایسی فیاضانہ حوصلہ سے مہمانداری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی ۱۹ روز تک نہایت امیرانہ زندگی بسر کی۔ شادی کے وقت [illegible] ارکانِ سلطنت پر مشک و عنبر کی ہزاروں گولیاں تقسیم کی گئیں جن پر کاغذ لپٹے ہوئے تھے، اور ہر کاغذ پر کسی قطعۂ زمین یا غلام یا خلعت یا اسپ خاصہ وغیرہ کی ایک خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، تقسیم کے عام وقت میں یہ باضابطہ لکھا تھا جس کے حصہ میں جو گولی آئے اس پر جو کچھ لکھا ہوا ہو اسی وقت وکیل الخزانہ سے دلوا دیا جائے۔ عام آدمیوں پر چاندی، [illegible] اور درہم و دینار نثار کئے گئے۔ مامون کے لئے ایک نہایت مکلف فرش بچھایا گیا جو سونے کے تاروں سے بنا گیا تھا اور گوہر و یاقوت سے مرصع تھا۔ مامون جب اس پر جلوہ فرما ہوا تو بیش قیمت موتی اس کے قدموں پر نثار کئے گئے، جو زریں فرش پر بکھر کر نہایت دل آویز سماں پیدا کرتے تھے۔[2]

بغداد کے داعی الی اللہ

لیکن اسی عیش و عشرت کے بغداد میں کچھ نفوس قدسیہ تھے جو دعوت الی اللہ، تزکیۂ نفوس [illegible]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو [illegible]

[2] [illegible] ابن خلدون [illegible] ابن الاثیر [illegible]

کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلم میں ہمہ تن مشغول تھے، انھوں نے شہر کے ہنگاموں اور زندگی کی مادی دلچسپیوں سے اپنے کو علیحدہ کر لیا تھا اور اس امت کی روحانی و باطنی ثروت کے سرمایہ اور اسلامی تمدن کے گنجینہ (قرآن و حدیث) کی حفاظت میں مصروف تھے، حکومت ان کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکتی تھی، اور دنیا کی کوئی ترغیب ان کو اپنے کام سے ہٹا نہیں سکتی، آرائش کے اس پرتکلف تمدن میں وہ انسانی حریت کے نمائندے تھے، یہاں امت نے پناہ لی تھی، انھوں نے بغداد میں مادی و پرعشرت زندگی کے پہلو بہ پہلو ایک خالص ایمانی اور روحانی زندگی قائم کر رکھی تھی جو اپنی طاقت اور وسعت میں مادی و سیاسی زندگی سے کم نہ تھی، اگر خلفا اور امرا و وزرا کا قبضہ جسموں پر تھا تو ان کی حکومت لوگوں کے دلوں اور روحوں پر تھی، اور جب کبھی ان دونوں میں مقابلہ پیش آیا تو اکثر اوقات انہی کی فتح ثابت ہوئی، سلطان وقت ہارون رشید شام اور ترکی کی سرحد پر واقع ایک شہر رقہ میں مقیم تھا کہ مشہور امام حدیث اور مرد صالح حضرت عبداللہ بن مبارک کی آمد ہوئی، شہر کی ساری آبادی ان کے استقبال کے لئے نکل پڑی، خلیفہ تنہا رہ گیا اور ہجوم کا یہ حال تھا کہ جوتیاں ٹوٹ گئیں، ہارون کی ایک کنیز بالاخانہ سے دیکھ رہی تھی، پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ خراسان کے ایک عالم آئے ہیں جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے، اس نے کہا واللہ بادشاہی یہ ہے، ہارون کی بادشاہی کیا ہے کہ بغیر پولیس اور ہرکاروں کے مجمع ہی نہیں ہوتے۔

دینی اور علمی زندگی بغداد میں صاف نمایاں تھی، بغداد جس طرح عیش و عشرت اور مال و دولت کا گہوارہ تھا اور اس کے طالب دنیا کے گوشہ گوشہ سے سمٹ کر یہاں جمع ہو گئے تھے، اسی طرح علم و عمل، صلاح و تقویٰ اور دعوت و اصلاح کا بھی سب سے بڑا مرکز تھا، جہاں ہر فن کے امام اور اس فن کے طالب دنیائے اسلام سے آکر جمع ہو گئے تھے، طبقات و تراجم کی کتابیں دیکھنے سے تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ بغداد میں صلحا اور علما کے علاوہ اور کوئی بستا ہی نہ تھا، اور قال اللہ و قال الرسول کے سوا کوئی صدا بلند نہیں ہوتی تھی، یہ دینی رونق اور علمی مرکزیت حکومت میں دین و اصلاح کی یہ دعوت ان باہمت بندوں کے دم سے تھی جنھوں نے اسی کام کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیا تھا، اسی سلسلہ میں سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، جنید بغدادی

معروف کرخیؒ اور بشر حافیؒ کو ہم دیکھو کہ سب سے زیادہ نمایاں اور روشن مثالیں ہیں حضرات صوفیہ کا و اخلاق کی بلندی [illegible] زہد و قناعت کی زندگی مخلوق سے استغنا اپنا رویہ بنایا نفس [illegible] خدمت خلق روا رکھی کیفیت [illegible] پر اتنا اثر [illegible] کثرت سے [illegible] اخلاقی روحانی مقام تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی تقریریں سن کر اور ان کے اعمال و اخلاق دیکھ کر بکثرت لوگوں کی روحانی زندگی اور صحابہ کی [illegible] ہو گئے۔

* * *

تدوینِ حدیث و فقہ

امت کی دو فوری ضرورتیں

امت کی روح اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے ساتھ (جس کا سلسلہ برابر جاری تھا) امت کی اجتماعی زندگی و معاشرت اور سلطنت و سیاست کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی اور اس بات کی ضمانت کی کہ وہ آئندہ بھی اسلام کے اصول و آئین کے مطابق چلتی رہے گی، اس وقت دو براعظم (ایشیا و افریقہ) اور براعظم یورپ کا ایک حصہ (اسپین) اسلام کی نگرانی و تولیت میں تھے، اسلامی سلطنت روئے زمین کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ طویل و عریض سلطنت تھی جو دنیا کے متمدن ترین ممالک پر مشتمل تھی، نئے حالات و مسائل سے مسلمانوں کا سابقہ تھا، تجارت و زراعت، جزیہ و خراج، محکومین، مفتوحہ ممالک کے نئے نئے مسائل در پیش تھے، قدیم عادات و رواج کا بہت بڑا ذخیرہ اور نئی نئی ضروریات تھیں جو مسلمانوں کی توجہ، فیصلہ اور اسلامی احکام کی منتظر تھیں، ان میں سے نہ کسی ضرورت کو ٹالا جا سکتا تھا، نہ سرسری طور پر ان سے گذر جا سکتا تھا، ایک مفصل و مکمل آئین و قانون سلطنت کی طلب تھی، حکومت کی انتظامی مشین کو روکا نہیں جا سکتا تھا، اگر قانون اسلامی کی ترتیب میں تاخیر ہوتی تو وہ رومی یا ایرانی قانون کو اختیار کرنے پر مجبور تھی جس کا نتیجہ وہ ہوتا جو اس وقت کی نام نہاد اسلامی سلطنتوں کا ہو رہا ہے، علمائے دین اسلامی نظامات اور حامیان سنت کی [illegible] اور دین پسندی اس امت کو ہزاروں برس کے لئے اسلامی معاشرت اور اس کے اجتماعی قوانین کی برکت سے محروم کر دیتی

ع یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اس وقت دو مسئلوں کی طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی، ایک تو یہ کہ حدیث و سنت کے سرمایہ کو محفوظ و مدون کر دیا جائے جو محدثین کے سینوں اور منتشر صحیفوں میں تھا[1]، یہ نئے مسائل کے استنباط کا بہت بڑا ذریعہ اور فقہ اسلامی کا ایک بہت بڑا ماخذ تھا، اس کے ساتھ وہ امت کے اسلامی مزاج اور زندگی کے اسلامی سانچہ کی حفاظت کا بھی ذریعہ تھا، حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مفصل اور مستند سیرت ہے، وہ زمانۂ نبوت کے تیئیس برسوں کا ایک طرح کا روزنامچہ ہے، جو کسی پیغمبر کی امت کو حاصل نہیں، اس کا ضائع ہو جانا بہت بڑا علمی و دینی سانحہ تھا، علاوہ بریں اس میں امت کی اخلاقی اصلاح، اعتدال ایمانی، روحانیت، زہد و تقویٰ اور تغیر و انقلاب پر ابھارنے والی زبردست طاقت ہے، جس کے اثر سے ہر زمانہ میں اہل دعوت و اہل عزیمت پیدا ہوتے رہیں گے اور ہر زمانہ کی مسلمان سوسائٹی کا شرعی و اخلاقی احتساب ہو سکے گا، اور ہر زمانہ اور ہر طبقہ کی بدعات کا مقابلہ کیا جا سکے گا۔

دوسری ضرورت فقہ کی تدوین اور استنباط و اجتہاد کی تھی، قرآن و حدیث میں اگرچہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے اصول و کلیات موجود ہیں، اور ان سے باہر کہیں جانے کی ضرورت نہیں، مگر زندگی متغیر ہے اور انسان کے حالات و ضروریات غیر محدود اور بے حد متنوع، ان اصول و کلیات کو زندگی کے ان تغیرات و تنوعات پر حاوی بنانے کے لئے اور ہر نئی حالت اور نئی ضرورت کے لئے ان کی ترجمانی و تشریح کے لئے اجتہاد و استنباط کی ضرورت تھی۔

---

[1] حدیث کے جمع و تدوین کا کام عہد تابعین سے شروع ہو چکا تھا، اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی توجہ و دلچسپی کا حال گذر چکا ہے، دوسری ہی صدی میں حدیث کے مختلف مجموعے تیار ہو چکے تھے جن میں سے ابن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) ابن جریج مکی (م ۱۵۰ھ) ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ) سعید بن ابی عروبہ (م ۱۵۶ھ) معمر یمنی (م ۱۵۳ھ) ربیع بن صبیح (م ۱۶۰ھ) وغیرہ کے مجموعے خاص طور پر مشہور ہیں، لیکن ضرورت تھی کہ اس کو زیادہ علمی و ترقی یافتہ شکل میں انجام دیا جائے

تدوینِ حدیث

پہلی ضرورت کے لئے قدرتی طور پر یہ انتظام ہوا کہ ظہورِ اسلام کے لئے اس ملک اور قوم کا انتخاب ہوا، جو اپنی راست گفتاری، امانت اور قوتِ حفظ میں دنیا میں ممتاز تھی، صحابۂ کرامؓ نے جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا اس کو محفوظ کر لیا اور بے کم و کاست دوسری نسل کو پہنچا دیا، دوسری قوموں نے اپنے اپنے پیغمبروں کے بُت تراشے اور ان کی تصویریں بنائیں، اسلام میں بُت تراشی اور صورت گری حرام ہے مگر صحابۂ کرامؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے شمائل و عادات کا ایسا جیتا جاگتا مرقع پیش کر دیا جس کی موجودگی میں کسی تصویر کی ضرورت نہیں، اور جو تصویر کے تمام مفاسد سے پاک ہے۔

محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی

پھر ان روایات کی حفاظت و اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے صدہا کی تعداد میں ایسے بلند حوصلہ، تازہ دم، پُرجوش طالبِ علم مہیا کر دیئے، جو قوتِ حافظہ و ذکاوت میں بے نظیر تھے، ان کا سیلاب عجم کے ملکوں سے امنڈ آیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حدیث کا ایسا عشق بھر دیا کہ ان کے لئے چین سے بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا، ان کو ہر جگہ سے اس علم کو حاصل کرنے اور اپنے سینہ اور سفینہ میں محفوظ کرنے کی دھن تھی، عموم کی تاریخ اور تجربہ کی داستانوں میں اس عشق اور دھن اور پھر اس احتیاط و امانت کی مثال نہیں ملتی، انھوں نے ان احادیث کو جمع کرنے اور ان روایات کو ان کے راویوں سے سننے کے لئے اسلامی دنیا کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا، اس بادیہ پیمائی کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امام بخاریؒ نے ۱۶ برس کے سِن میں یہ سیاحت شروع کر دی تھی، بخارا سے لے کر مصر تک سارے ممالک محروسہ کو کھنگال ڈالا، امام ابو حاتم رازیؒ کہتے ہیں کہ میں نے تین ہزار فرسخ (نو ہزار میل) سے زیادہ کا سفر پیادہ پا طے کیا، پھر میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا، محدثِ اندلس ابن حیان نے حدیث اندلس، عراق، حجاز،

اندلس کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کیا۔ طنجہ سے کاشغر تک سارا برِ اعظم افریقہ اور پھر عراق آکر ختم کیا، بہت سے محدثین کا سفرنامہ تین براعظموں ایشیا، افریقہ، یورپ (اسپین) پر مشتمل تھا، اس وقت کی متمدن و معروف دنیا کے مغرب بعید (اندلس) سے مشرق بعید (خراسان) تک سفر کرنا اور شہر شہر پھرنا معمولی بات تھی۔

فن اسماء الرجال

ان مخلصین نے صرف حدیث و روایات کے جمع و تدوین پر اکتفا نہیں کی بلکہ درمیانی واسطوں کی بھی تحقیق کی اور ان تمام راویوں کے نام و نشان و تاریخ زندگی اور اخلاق و عادات کو محفوظ کر دیا جن کے واسطہ سے یہ روایات ان کو پہونچی تھیں، اس طرح جس ذات گرامی کے متعلق "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" کا وعدہ اور اطلاع تھی، اس کی بدولت لاکھوں اشخاص کی زندگی روشنی میں آگئی، ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی اہمیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس ذات کے اقوال و اعمال و احوال میں سے کسی جزء کے راوی اور اس سلسلہ روایت کے ایک ناقل تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث و روایات کی تدوین کے ساتھ ساتھ ایک نیا علم "اسماء الرجال"[1] کا وجود میں آگیا، یہ علم محدثین کی عالی ہمتی، علمی شغف، تحقیقی ذوق اور احساس ذمہ داری کی روشن مثال ہے، اس امت کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے، ڈاکٹر اسپرنگر نے "الاصابہ فی احوال الصحابہ" (مصنفہ حافظ ابن حجرؒ) کے انگریزی مقدمہ[2] میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

"کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح "اسماء الرجال" کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔"[3]

---

[1] یہ مثالیں "حیات سلف" از مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم سے ماخوذ ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب کا عنوان سفر

[2] مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۳ء تا ۱۸۶۴ء [3] خطبات مدراس از مولانا سید سلیمان ندوی۔

محدثین کی احتیاط و امانت

محدثین نے نہ صرف رجال حدیث کے حالات جمع و محفوظ کر دیئے بلکہ صحیح حالات لکھنے کی پابندی کی اور ان کے اخلاق و عادات، قوت و ضعف، احتیاط و بے احتیاطی، دیانت و تقویٰ، علم و حافظے کے متعلق ان کے معاصرین کے بیانات اور ہر قسم کی معلومات جمع کر لیے، اور ان کے بارہ میں کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا خواہ اپنے زمانہ میں حاکم ہوں یا اپنے وقت کے بڑے زاہد ہوں۔

> "راویوں کی چھان بین اور تحقیق میں اس درجہ دیانتداری اور بے لاگی سے کام لیا گیا کہ وہ واقعۃً آج اسلام کے مفاخر میں ہے۔ راویوں میں بڑے بڑے خلفاء اور امراء بھی تھے جن کی تلواروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی مگر محدثین نے ذرہ برابر کسی کی پروا نہیں کی، اور ان کو وہی درجہ دیا جو حقیقت میں ان کو ملنا تھا۔ امام وکیع جیسے محدث تھے لیکن ان کے باپ سرکاری خزانچی بھی تھے اس بنا پر وہ خود ان سے جب روایت کرتے تو ان کو تنہا نہیں، کسی دوسرے کو ملا لیتے اور تنہا اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس احتیاط اور حق پسندی کی کوئی حد ہے۔"[1]

مسعودی ایک محدث ہیں ۱۵۴ھ میں ایک امام معاذ بن معاذ نے ان کو دیکھا کہ ان کو اپنی تحریری یادداشت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انھوں نے فوراً ان کے حافظے سے اپنی بے اعتباری ظاہر کر دی[2]۔ یہی امام معاذ وہ بزرگ ہیں کہ ان کو ایک شخص نے دس ہزار دینار جس کی قیمت آج دس ہزار گنی سے زیادہ ہے صرف اس معاوضہ میں پیش کرنا چاہا کہ وہ ایک شخص کو معتبر و عادل یا غیر معتبر کچھ نہ کہیں یعنی اس کے متعلق خاموش رہیں تو انھوں نے اشرفیوں کے اس توڑے کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا، اور فرمایا کہ میں کسی حق کو چھپا نہیں سکتا[3]۔ کیا تاریخ اس سے زیادہ احتیاط اور اس سے زیادہ دیانتداری کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟[4]

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۱۳ [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۱۱ [3] ایضاً ج ۱۰ ص ۱۹۴ [4] خطبات مدراس ص ۶۴-۶۳

قوتِ حافظہ اور استحضار

محدثین کی یہ جماعت ایران و ترکستان کا بہترین دماغی جوہر تھا، وہ نسلاً بعد نسلٍ تندرست، توانا، جفاکش، عالی حوصلہ علم کے حریص اور حافظے کے نہایت قوی تھے، حافظہ پر اعتماد اور اس سے کام لینے کی وجہ سے (تمام انسانی اعضاء کی طرح جو پرورش اور ورزش سے غیر معمولی طور پر طاقتور ہو جاتے ہیں) ان کا حافظہ اپنی قوتِ حفظ کے محیر العقول نمونے پیش کرتا تھا، جو ضعف و کمزوری کے اس خاص کتابی دور میں بعض اوقات ناقابلِ یقین معلوم ہوتے ہیں لیکن تاریخ ان کے وقوع کی متواتر شہادتیں بہم پہنچاتی ہے اور تجربات ان کے امکان کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کی علمی توجیہ بالکل مشکل نہیں، کثرتِ کار، مناسبت، مہارت اور اپنے موضوع سے عشق و شغف ایک ملکہ پیدا کر دیتا ہے اور استغراق و یکسوئی کے ایسے نمونے ظاہر ہوتے ہیں جو غیر متعلق اشخاص کے لئے حیرت انگیز ہوتے ہیں۔

امام بخاریؒ جب بغداد آئے تو علماء بغداد نے ان کے امتحان کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ سو حدیثوں کی سند اور متن (مضمونِ حدیث) کو الٹ پلٹ دیا، ایک حدیث کی سند دوسرے متن کے ساتھ اور ایک حدیث کا متن دوسری سند کے ساتھ لگا دیا، اور دس دس حدیثوں کو ایک ایک شخص کے حوالہ کیا کہ وہ ان سے سوال کرے، امام بخاریؒ جب مجلس میں آئے تو ایک ایک شخص نے دس دس حدیثیں سنائیں اور ان کی رائے دریافت کی، وہ سنتے اور فرماتے کہ میں ان حدیثوں سے واقف نہیں، اہلِ علم اس راز کو سمجھے اور ناواقف اشخاص ان کی لاعلمی پر مسکرائے، جب سب نے اپنے اپنے حصہ کی حدیثیں سنا لیں تو امام نے باری باری ایک ایک کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ آپ نے جو دس حدیثیں سنائی تھیں ان کا متن یہ ہے اور ان کی سند یہ ہے، پھر دوسرے تیسرے کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ سب کی احادیث کی تصحیح کر دی، اور جس سند کا جو متن تھا اور جس متن کی جو سند تھی وہ بیان کی، لوگ ان کی وسعتِ نظر، حاضر دماغی اور حافظہ پر انگشت بدنداں رہ گئے۔[1]

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۷

مجالس درس میں سامعین کا ہجوم

اس ذہین طبقہ کی توجہ وانہماک اور حدیث کی ضرورت کے احساس نے حدیث کا ایسا عام ذوق اس کے درس و روایت کی مجلسوں میں شرکت کا شوق اور ائمۂ فن سے اس قدر استفادہ کی حرص پیدا کر دی تھی کہ محدثین کی مجالس درس میں حاضرین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی اور بادشاہوں کے دربار سے زیادہ وہاں پر سکون اور نظام ہوتا۔

یزید بن ہارون نے جب بغداد میں درس حدیث دیا تو اس میں ستر ہزار حاضرین کا تخمینہ کیا گیا۔ امام عاصم بن علی املائے حدیث کے واسطے بغداد سے باہر نخلستان میں ایک بلند چبوترے پر بیٹھے تھے، خلیفہ معتصم باللہ نے ایک بار اپنا ایک معتمد اس مجلس کے شرکاء کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا تو ایک لاکھ بیس ہزار حاضرین کی تعداد کا اندازہ تھا۔ احمد بن جعفر ختلی کہتے ہیں کہ جب ابو مسلم بغداد میں آئے تو رحبہ غسان نامی مقام پر انھوں نے حدیث کا املا کیا، سات مستملی کھڑے ہوئے تھے جن میں ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہونچاتا تھا اور لوگ کھڑے کھڑے تحریر حدیث میں مصروف تھے، دواتوں کا شمار کیا گیا تو کچھ اوپر چالیس ہزار دواتیں شمار ہوئیں، جو لوگ کھڑے تھے صرف سماعاً شریک تھے وہ اس تعداد سے خارج ہیں۔ شیخ وقت فریابی نے بغداد میں املائے حدیث کیا تو تین سو سولہ مستملی ان کی مجلس میں حاضر تھے اور حاضرین تخمیناً تیس ہزار، فریابی کی مجلس میں دس ہزار آدمی ان کے پاس ایسے پڑھنے آتے تھے جو دوات قلم لے کر بیٹھے[1]۔ فربری کی روایت ہے کہ امام بخاری کی جامع صحیح کو ان سے نوے ہزار آدمیوں نے سنا[2]۔

صحاح ستہ

یہ عمومی ذوق انہماک اور جذبہ باقتضائے حق تعالیٰ از حکمت نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث کا ایسا محفوظ و مستند سرمایہ جمع ہو گیا جو اس امت کی بہت بڑی ثروت اور اصلاح و تجدید کا ایک بڑا طاقتور

---

[1] عمل سلف صفحہ [illegible] بحوالہ تذکرۃ الحفاظ و تاریخ ابن خلکان۔

[2] مقدمہ فتح الباری صفحہ ۴۹۳

ذریعہ ہے۔ اس سلسلہ میں امام بخاری کی صحیح بخاری، امام مسلم کی صحیح مسلم (جن کو اکثر صحیحین کے لقب سے یاد کیا جاتا[1] ہے) اور جس حدیث کو ان دونوں نے روایت کیا ہے اس کو متفق علیہ کے لفظ سے یاد کرتے ہیں اور صحت کا اعلیٰ درجہ ہے، سب سے ممتاز اور منفرد ہیں، ان دونوں کے بعد امام مالک کی موطا اور امام ترمذی کی جامع، امام ابو داؤد سجستانی کی سنن ابی داؤد، امام نسائی کی نسائی، اور امام ابن ماجہ کے مجموعے اپنی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز ہیں، یہ کام اصلاحی کوششوں اور تجدید کی کارناموں کا ایک سلسلہ ہے، محدثین کرام کی ان ابتدائی کوششوں کا بہت بڑا احسان ہے آج بھی کوئی سنجیدہ اور دقیق اصلاحی تحریک اور دینی انقلاب کی کوشش اس علمی ذخیرہ سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

تدوین فقہ

اسی طرح فقہ کی تدوین، مسائل کا استنباط اور قرآن، جزئیات و فتاویٰ کی ترتیب اسلام کی ایسی علمی ضرورت تھی جس کو بالکل مؤخر نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر شام، عراق، مصر، ایران اور دوسرے وسیع اور زرخیز ملکوں میں پہنچ گیا تھا، معاشرت، تجارت، انتظام ملکی سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات و مسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لئے بڑی اعلیٰ ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری، قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے بڑھ کر اسلام کی روح، دین کے ذوق اور روح شریعت سے گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانہ صحابہ کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے

---

[1] شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں صحیحین کے متعلق لکھتے ہیں: اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علی ان جمیع ما فیھما من المتصل المرفوع صحیح بالقطع وانھما متواتران الی مصنفیھما وانہ کل من یھون امرھما فھو مبتدع متبع غیر سبیل المؤمنین۔ (محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ ان دونوں کی مرفوع متصل روایات قطعی طور پر صحیح ہیں اور ان دونوں کتابوں کی نسبت اپنے مصنفین کی طرف تواتر سے ثابت ہے، اور جو شخص ان دونوں کتابوں کی قدر گھٹائے وہ بدعتی ہے اور اہل ایمان کا راستہ چھوڑ کر چلنے والا ہے)

پورے علمی ذخیرہ (قرآن و حدیث اور لغت و قواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

ائمۂ اربعہ اور ان کی خصوصیات

یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا اور اس امت کی اقبال مندی کہ اس کام عظیم کے لئے ایسے لوگ میدان میں آئے جو اپنی ذہانت و دیانت، اخلاص اور علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) امام مالک (م ۱۷۹ھ) امام شافعی (م ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) جو فقہ کے چار دبستانِ فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہے، اپنے تعلق باللہ، للّٰہیت، تقویٰ، فہم، علمی انہماک اور جذبۂ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں، ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری توانائیاں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں، انہوں نے دنیا کے کسی جاہ و اعزاز اور کسی لذت و راحت سے سروکار نہیں رکھا تھا، امام ابو حنیفہ کو بار بار عہدۂ قضا پیش کیا گیا اور انہوں نے انکار کیا یہاں تک کہ قید خانہ ہی میں آپ کا انتقال ہوا، امام مالک نے ایک مسئلہ[1] کے اظہار میں کوڑے کھائے اور ان کے شانے اتر گئے، امام شافعی نے زندگی کا بڑا حصہ عسرت میں گزارا اور اپنی صحت قربان کر دی، امام احمد نے تن تنہا حکومتِ وقت کے رجحان اور اس کے سرکاری مسلک کا مقابلہ کیا اور اپنے مسلک اور اہل سنت کے طریقہ پر پہاڑ کی طرح جمے رہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنے موضوع پر تن تنہا اتنا کام کیا اور مسائل و تحقیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا جو بڑی بڑی منظم جماعتیں اور علمی ادارے بھی آسانی سے نہیں پیدا کر سکتے، امام ابو حنیفہ نے تراسی ہزار مسائل اپنی زبان سے بیان کئے جن میں سے اڑتیس ہزار عبادات سے تعلق رکھتے ہیں اور پینتالیس ہزار معاملات سے۔[2]

---

[1] مسئلہ یہ تھا کہ جبر کی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں، اس مسئلہ کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ خلفاء کے لئے جو بیعت لی جاتی تھی اس میں یہ کہلوایا جاتا تھا کہ اگر بیعت توڑی تو بیوی کو طلاق ہو جائے گی، اگر جبر کی طلاق کا اعتبار نہیں تو بیعت کے اس حلف نامہ میں کوئی طاقت اور تاثیر باقی نہیں رہ جاتی اسی بنا پر حکومت کو امام مالک کے اس فتوے سے بڑی تشویش لاحق ہوئی اور اس کے حکام نے ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا۔ [2] [illegible] مناقب ابی حنیفہ للمکی ج ۱ ص ۹۶

شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جس قدر مسائل مدون کئے ان کی تعداد چھ لاکھ [illegible] جو امام مالک کی شاگردی کا فخر رکھتے تھے چھتیس ہزار مسائل کی کتاب لکھی جو امام شافعی کے انتقال کے وقت تک موجود تھی۔ بعض لکھتے ہیں ابوبکر خلال نے جو امام کے شاگرد تھے امام احمد کے مسائل چالیس جلدوں میں جمع کئے تھے۔

ائمہ اربعہ کے شاگرد و جانشین

پھر ان کو شاگرد ایسے ملے جنہوں نے اس ذخیرہ میں اضافہ کیا اور فن کی تکمیل و ترتیب کا کام جاری رکھا۔ امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں امام ابو یوسف جیسا قانونی دماغ نظر آتا ہے جس نے اس زمانہ کی وسیع ترین سلطنت کے قاضی القضاۃ کے فرائض کامیابی کے ساتھ انجام دیئے اور اسلام کے اصول معاشیات پر کتاب الخراج جیسی لاجواب تصنیف کی۔ اسی طرح ان کے شاگردوں میں امام محمد جیسا فقیہ اور ماہر لغت اور امام زفر جیسا صاحب قیاس نظر آتے ہیں جنہوں نے فقہ حنفی کو چار چاند لگا دئے۔ امام مالک کو عبداللہ بن وہب، عبدالرحمن بن القاسم، اشہب بن عبدالعزیز، عبداللہ بن عبدالحکم، یحییٰ بن یحییٰ جیسے وفادار شاگرد اور لائق عالم ملے جن کی کوششوں سے سارا شمالی افریقہ فقہ مالکی کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ امام شافعی کو ابو علی مزنی اور ربیع جیسے محنتی اور ذہین شاگرد ملے جنہوں نے فقہ شافعی کو مرتب و منقح شکل میں پیش کیا۔ امام احمد کی فقہ کو ابن قدامہ جیسا مصنف اور محقق شارح ملا جس نے المغنی جیسی عظیم الشان تصنیف کی جو فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔

تدوین فقہ کا فائدہ

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اس فن پر صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہونا اس دین کی

[illegible]

[illegible]

زندگی اور اس امت کی کارکردگی کی صلاحیت سلب کر لی تھی، ان کی کوششوں اور ذہانتوں سے اس امت کی علمی و معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہوگئی اور اس ذہنی انتشار اور سخت بے نظمی اور ابتری سے محفوظ رہ گئی جس کی قومیں اپنے ابتدائی عہد میں شکار ہو چکی ہیں۔ انھوں نے فقہ کی ایسی بنیادیں قائم کر دیں اور ایسے اصول مرتب کر دیئے جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل اور مشکلات کے حل کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے اور تمام متمدن زندگی کو باقاعدہ اور شرعی رہنمائی کے ساتھ گزارا جا سکتا ہے۔

فتنۂ خلق قرآن اور امام احمد ابن حنبل

فلسفۂ الٰہیات اور ذات و صفات کی بحثیں

دوسری صدی کی ابتدا ہی میں مسلمانوں کا تعارف یونانی فلسفہ سے ہوا، فلسفہ محض چند خیالات و قیاسات کا مجموعہ اور ذاتی ملکہ کا ایک طلسم تھا، ایک ایسے وجود کی حقیقت و ماہیت ذہنی محدود الفاظ ہی کے ساتھ نامحصور اور تجربات و مشاہدات ہوں، ایک غیر محدود ذات کی حقیقت و صفات کس طرح بیان کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی ذات و صفات کے مسئلہ کو یونانی طرز کی تقسیم و تجزیہ اور منطقی موشگافیوں اور قیاس آرائیوں کا میدان بنانا اس معاملہ میں انسان کو وہ ابتدائی معلومات اور ذرائع تجربات ہی حاصل نہیں جن پر بحث و قیاس کی عمارت قائم کی جا سکے، اس بارہ میں انسانوں کا راہ نما صرف انبیاء علیہم السلام کی اتباع اور وحی الٰہی ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور اس کی صفت بیان کرنے کا ذریعہ معلوم ہو سکتا ہے اور اسی پر اکتفا کرنا عقل کی پختگی اور بلند نظری ہے، مسلمانوں کے پاس قرآن و حدیث کی صورت میں یہ علم محفوظ موجود تھا اور ان کو اس پر شرح قلب کامل بالاتفاق، ذات و صفات کے متعلق نصوص پر حقیقت صحابہ، تابعین، ائمہ دین اور محدثین اسی مسلک پر قائم تھے، مسلمانوں کی ساری توجہ دعوت اسلام، فتح و جہاد اور زندگی کے عملی مسائل اور مفید علوم کی تدوین میں صرف تھی، جب یونانی اور ایران کی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور قدیم مذاہب و ممالک کے علماء و متکلمین سے اختلاط ہوا تو کچھ لوگ جو جدت پسند اور نئی باتیں کرنے کے شوقین تھے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں گفتگو کرنے لگے

زیادہ سطحیت اور بدعت تھی۔ اس طرز فکر اور طریقۂ بحث سے متاثر ہو کے اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور ان کے باہمی تعلق، کلام الٰہی، رویت باری، مسئلۂ عدل، تقدیر، جبر و اختیار کے متعلق ایسی بحثیں اور مسائل پیدا ہو گئے، جو نہ دینی حیثیت سے ضروری تھے، نہ دنیاوی حیثیت سے مفید، بلکہ امت کی وحدت اور مسلمانوں کی قوت عمل کے لئے مضر۔

معتزلہ کا عروج

دینی فلسفیوں کے اس گروہ کی امامت معتزلہ کر رہے تھے جو اپنے وقت کے "روشن خیال" عالم اور پرجوش متکلم تھے، انھوں نے ان علمی بحثوں کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا، اور اپنی ساری ذہانتوں کو ان مباحث پر لگا دیا، ان کے مقابلہ میں محدثین و فقہاء کا گروہ تھا جو ان مسائل میں سلف کے مسلک کا قائل تھا، اور ان موشگافیوں کو مضر اور ان تعبیرات کو غلط سمجھتا تھا، ہارون رشید کے دور خلافت تک معتزلہ کو عروج حاصل نہیں ہوا، مامون کے زمانہ میں جو یونانی فلسفہ اور عقلیت سے مرعوب تھا اور مخصوص تربیت اور حالات کی وجہ سے اس کی دماغی ساخت معتزلہ سے ملتی جلتی تھی، معتزلہ کو عروج حاصل ہوا اور قاضی ابن ابی دؤاد کی بدولت جو سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاۃ ہو گیا تھا، اور معتزلہ کے افکار و آراء کا پرجوش داعی اور مبلغ تھا، مذہب اعتزال کو حکومت وقت کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہو گئی، مامون میں خود دعوت کی روح اور ایک داعی کا جوش اور جذبۂ تبلیغ تھا، اس میں ذہین نوجوانوں کی عجلت پسندی[1] اور مطلق العنان فرماں رواؤں کی ضد اور ہٹ، دونوں چیزیں تھیں، اس کے دربار و مزاج پر معتزلہ حاوی تھے۔

---

[1] اس نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی تفضیل کا اعلان کر دیا جس سے ملک میں عام بے چینی پیدا ہوئی، ایک مرتبہ متعہ کے جواز کا اعلان کیا، پھر جب قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم نے صحیح طور پر اس کو قائل کیا تو اس کی حرمت کا اعلان کروا دیا۔

عقیدۂ خلق قرآن[1] اس وقت معتزلہ کا شعار، بلکہ کفر و ایمان کا معیار بن گیا تھا، محدثین اس نظریہ کے مخالف اور قدم کے قائل تھے، اور محدثین کی طرف سے امام احمد بن حنبلؒ اس مسئلہ میں سینہ سپر تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ

امام احمد بن حنبلؒ ربیع الاول سنہ ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، وہ نسباً عربی النسل اور قبیلۂ شیبان[2] میں سے تھے، جو بہادری اور استقامت و عزیمت اس قبیلہ کے تاریخی خصائص میں سے ہیں۔ ان کے دادا حنبل بن ہلال بصرہ سے خراسان منتقل ہو گئے، اموی حکومت میں وہ علاقۂ سرخس کے حاکم بھی تھے، لیکن جب عباسیوں نے اہل بیت اور بنی ہاشم کے نام سے خراسان میں اپنی دعوت پھیلائی تو وہ اس دعوت کے ہمدردوں اور کارکنوں میں تھے، امام احمد کی ماں مرو سے بغداد آئیں تو وہ پیٹ میں تھے، ولادت سے پہلے ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، ماں نے بڑی کفایت اور ہوشمندی سے پرورش کی، گذر اوقات کے لئے باپ نے ایک جائداد چھوڑی تھی، ان حالات نے ان میں تحمل و جفاکشی اور عزم و استقامت و عزت النفس کی صفات پیدا کر دیں، بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا اور زبان کی تعلیم حاصل کی، پھر ایک دفتر میں داخل ہوئے تاکہ تحریر و انشاء کی مشق حاصل کریں، نجابت اور صلاحیت کے

---

[1] خلق قرآن کی بحث ایک عامی ہی نہیں طالب علم اور ذہین آدمی کے لئے بھی [illegible] اعتزال [illegible] کا [illegible] قرآن مجید کی [illegible] اس کے الفاظ و معانی کے قدیم ہونے کا عقیدہ [illegible] ان تعبیرات کے منافی [illegible] معتزلہ روشن خیال اور آزاد [illegible] اعتزال [illegible] جبر و اکراہ سے کام لیا اور اپنی تمام طاقت [illegible] امام احمد بن حنبلؒ [illegible] انھوں نے اس مسئلہ میں اپنے مخالفین کے ساتھ جو سلوک کیا وہ قرون وسطیٰ میں یورپ [illegible] کی یاد تازہ کرتا [illegible] حکومت وقت کی سرپرستی [illegible] مذہب اعتزال اور معتزلہ کے زوال کا باعث ہوئی۔

[2] یہ عرب کے مشہور سپہ سالار مثنیٰ بن حارثہ کا نسب اسی قبیلہ سے تھا۔

آثار بچپن سے نمایاں تھے۔ ان کے چچا بغداد کے وقائع نگار تھے اور خلیفہ کو خبریں دیا کرتے، وہ یہ پرچے تیار کیا کرتے
تھے اور خبریں بھیجتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے یہ تحریریں اپنے بھتیجے کے سپرد کیں، وہ ایک متعین شخص کو پہنچا دیں،
انھوں نے اس خیال سے کہ اس میں اہل بغداد کی شکایت اور بہت سے لوگوں کی مخبری ہوگی ان کاغذات کو
دجلہ میں ڈال دیا۔ جب وہ دفتر میں خطوط نویسی کی مشق کرتے تھے تو بہت سی عورتیں جن کے شوہر بیرون وطن یا
یا تو فوج میں باہر گئے ہوئے تھے ان سے خط پڑھوالیتیں اور جواب لکھوالیتیں، وہ خطوط لکھ دیا کرتے تھے لیکن جس
مضمون کو شریعت یا تہذیب کے خلاف سمجھتے تھے اس کو نہیں لکھتے تھے۔ تقویٰ اور طہارت اور صلاحیت کا
کے انھی آثار کو دیکھ کر ان کے زمانہ کے ایک صاحب نظر الہیثم ابن جمیل نے کہا تھا کہ اگر یہ نوجوان زندہ رہا تو
اہل زمانہ پر حجت ہوگا۔[1]

علوم دینیہ میں انھوں نے حدیث کی طرف خصوصی توجہ کی، سب سے پہلے قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ سے
حدیث کی کتابت کی۔[2] پھر چار برس تک بغداد میں امام حدیث ہشیم ابن بشیر ابن ابی حازم الواسطی (م ۱۸۳ھ) سے
استفادہ کرتے رہے، اس زمانہ میں مشہور ائمہ حدیث عبدالرحمٰن بن مہدی، ابوبکر بن عیاش وغیرہ سے استفادہ کیا، ان کی
اپنے مقصد میں سنجیدگی و سرگرمی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وہ کہتے ہیں کہ بعض دن حدیث سننے کے لئے سویرے
جانے کا ارادہ کرتا تو میری والدہ میرا دامن پکڑ لیتیں کہ ذرا تو ٹھہر جاؤ کہ اذان ہو جائے اور کچھ اجالا ہو جائے۔

بغداد سے فارغ ہو کر انھوں نے بصرہ، حجاز، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا اور وہاں کے نامور محدثین سے
استفادہ کیا۔

۱۸۷ھ میں حجاز کے پہلے سفر میں ان کی ملاقات امام شافعیؒ سے ہوئی، پھر بغداد میں دوبارہ ملاقات
ہوئی جب کہ وہ اپنے اصول اور اپنی فقہ بہت کچھ مدون کر چکے تھے، امام احمد اس وقت پختہ کار ہو چکے تھے،
امام شافعیؒ احادیث کی صحت و سقم کے بارے میں اکثر ان پر اعتبار کرتے اور فرماتے تھے کہ آپ ہم سے حدیث کے بیان

---

[1] تاریخ بغداد بحوالہ امام احمد بن حنبل، المناقب لابن الجوزی ص ۲۳ [2] ایضاً

حدیث صحیح ہو تو مجھے بتلا دیا کرو میں اسی کو اختیار کروں گا۔

انھوں نے جریر بن عبدالحمید محدث سے حدیث سننے کے لئے رے (ایران) جانے کا بھی قصد کیا لیکن خرچ نہ ہونے کی وجہ سے نہ جا سکے کہتے تھے کہ اگر میرے پاس ۹۰ درہم بھی ہوتے تو میں چلا جاتا۔ طلب حدیث میں ان کی جد و جہد کا اندازہ اس سے ہو گا کہ ۱۹۸ھ میں انھوں نے حج کی نیت سے حجاز کا سفر کیا اور وہاں کچھ دن قیام کر کے عبدالرزاق بن ہمام سے حدیث سننے کے لئے صنعاء (یمن) کا قصد کیا تھا انھوں نے اپنے ہم درس یحییٰ بن معین سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا، دونوں نے اسی کی نیت کی مکہ پہونچے ابھی دونوں طواف قدوم کر رہے تھے کہ عبدالرزاق بن ہمام طواف کرتے دکھائی دیئے، ابن معین ان کو پہچانتے تھے انھوں نے سلام کیا اور امام احمدؒ کا تعارف کرایا انھوں نے ان کو دعا دی اور کہا کہ میں نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا کہ ہم کل آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ سے حدیث کی سماعت کریں گے جب وہ چلے گئے تو امام احمدؒ نے اپنے رفیق سے کہا کہ تم نے شیخ سے کیوں وعدہ لے لیا؟ انھوں نے کہا کہ حدیث سننے کے لئے شکر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک مہینے کے سفر اور واپسی کے ایک مہینہ اور مصارف کثیرہ سے بچا لیا، اور شیخ کو یہیں پہونچا دیا، امام احمدؒ نے کہا کہ مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں حدیث کے لئے سفر کی نیت کروں پھر اسی وجہ سے فسخ کر دوں، ہم تو جائیں گے، اور وہیں جا کر سنیں گے چنانچہ حج کے بعد صنعاء گئے اور زہری اور ابن المسیب کی روایتیں کہ جو پہلے سے ان کی سنی ہوئی نہیں تھیں انھوں نے وہاں سماعت کیں۔[1]

اس لگن، محنت، جفاکشی، کثرت استفادہ اور فطری ذہانت اور غیر معمولی قوت حافظہ کا نتیجہ تھا کہ ان کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں، اس وسعت علم اور کثرت حفظ کے باوجود وہ امام شافعیؒ کے تفقہ، حسن استنباط اور ذکاوت کے معترف تھے اور کہتے تھے کہ [illegible] انھوں نے ان سے اجتہاد کے اصول سیکھے اور اس کا ملکہ اخذ کیا اور بالآخر وہ اس امت کے ان مجتہدین میں ہوئے جن کی فقہ ابھی تک عالم اسلام میں زندہ ہے۔ امام شافعیؒ بھی

---

[1] ابن کثیر اور ابن الجوزی۔

ان کے بڑے معترف اور قدرداں تھے بغداد سے جاتے ہوئے انھوں نے فرمایا "خرجت من بغداد وما خلفت بها اتقى ولا افقه من ابن حنبل" (میں بغداد چھوڑ کر جا رہا ہوں اس حالت میں کہ وہاں احمد بن حنبل سے بڑھ کر نہ کوئی متقی ہے نہ کوئی فقیہ)

چالیس سال کی عمر میں یعنی ۲۰۴ھ میں انھوں نے حدیث کا درس دینا شروع کیا، یہی ان کا کمال اتباع سنت تھا کہ انھوں نے عمر کے چالیسویں سال جو سن نبوت ہے اشاعت حدیث کی، ابتدا ہی سے ان کے درس میں طالبین و سامعین کا اژدحام ہوتا تھا، بعض راویوں کا بیان ہے کہ ان کے درس کے سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار ہوتی تھی جن میں سے پانچ پانچ سو صرف لکھنے والے ہوتے تھے، ان کے درس کی مجلسیں بڑی باوقار اور سنجیدہ ہوتی تھیں کوئی مزاح و تفریح کی بات یا غیر سنجیدہ حرکت جو حدیث کے وقار کے خلاف ہو نہیں کر سکتا تھا، غرباء کو امراء و اہل دنیا کے مقابلہ میں ترجیح اور اعزاز حاصل تھا، علامہ ذہبی امام احمد کے ایک رفیق اور ہمعصر کا بیان نقل کرتے ہیں:—

لم ار الفقير في مجلس اعز منه في مجلس	میں نے غریب آدمی کو حضرت امام احمد کی مجلس میں
ابي عبد الله، كان مائلا اليهم مقصرا	جتنا معزز دیکھا کہیں نہیں دیکھا، وہ غریبوں کی طرف متوجہ
عن اهل الدنيا، وكان فيه حلم ولم	رہتے تھے اور امراء سے بے توجہی برتتے تھے، ان میں حلم و
يكن بالعجول، وكان كثير التواضع	وقار تھا، وہ عجلت پسند نہ تھے، بڑے متواضع
تعلوه السكينة والوقار، اذا جلس في	اور منکسر المزاج تھے، طمانیت اور وقار ان کے چہرے سے
مجلسه بعد العصر لا يتكلم حتى يسأل۲؎	عیاں تھا، عصر کے بعد جب درس کے لیے بیٹھتے تو جب تک
	ان سے سوال نہ کیا جاتا گفتگو نہ کرتے تھے۔

ان کی زندگی ابتدا سے آخر تک فقر و زہد اور توکل و قناعت کی زندگی تھی اور ان کا یہ فقر اختیاری

۱؎ احمد بن حنبل بحوالہ ابن الجوزی ص ۲۰۶ ۲؎ ترجمۃ الامام ص ۱۵

تھا انھوں نے کبھی سفر دور دراز میں رخصت کا راستہ قبول نہیں کیا، ان کے لڑکوں نے کبھی ان سے اس سلسلہ پر بہت جرح کی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ اہل احناف کا مذہب ہے اور یہی رخصت ہے، میں اس کو حرام سمجھ کر نہیں بلکہ احتیاطاً چھوڑتا ہوں، وہ محنت کرکے یا اپنی تنخواہ کی آمدنی سے گذارا کرتے تھے۔ ان کی فقر دوستی کی وجہ سے بعض اوقات تو یہ حال تھا فرماتے تھے اگر ساری دنیا سمٹ کر ایک لقمہ بن جائے اور وہ لقمہ کسی مسلمان کے ہاتھ پڑ جائے اور وہ مسلمان اس لقمہ کو کسی مسلمان بھائی کے منہ میں رکھ دے تو وہ بھی اسراف نہ ہوگا، وہ صرف مال کے بارے میں نہیں بلکہ اپنی ذات کے بارے میں بھی بڑے فراخ حوصلہ اور عالی ظرف تھے، ایک شخص نے ایک موقع پر ان کو بہت سخت سست کہا، تھوڑی دیر کے بعد جب اس کو ندامت ہوئی اور واپس آکر معذرت کی اور کہا کہ آپ مجھے معاف کردیں، فرمایا جہاں یہ بات ہوئی تھی وہاں سے قدم اٹھانے سے پہلے ہی میں معاف کرچکا تھا، انھوں نے فتنۂ خلق قرآن میں اپنے سب دشمنوں کو بھی کہ خلیفۂ وقت کو جس کے حکم سے ان کو سخت ترین اذیت پہنچی تھی معاف کردیا، فرماتے تھے کہ حضرت راعی بدعت کو تو معاف نہیں کرتا، اور جس نے میری اذیت میں حصہ لیا ہے وہ سب میری طرف سے آزاد ہیں، کبھی فرماتے کہ تمہارا اس میں کیا نفع ہے کہ تمہارے سبب سے کسی مسلمان کو عذاب دیا جائے۔

ان کمالات و امتیازات کے ساتھ بھی ان کو اپنی عظمت کا احساس نہیں ہوتا تھا، اور کوئی فخریہ کلمہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا، ان کے ساتھی یحییٰ بن معین کہتے ہیں:۔

ما رأيت مثل احمد بن حنبل صحبناه | میں نے احمد جیسا آدمی نہیں دیکھا ہم پچاس برس
خمسين سنة ما افتخر علينا بشئ مما | ان کے ساتھ رہے انھوں نے کبھی ہمارے سامنے
كان فيه من الصلاح والخير[1] | اپنی نیکی اور خیر پر فخر نہیں کیا

ان کی تواضع اور انکسار کا یہ حال تھا کہ گو وہ نسباً عرب تھے اور عربیت دنیا میں بڑا سرمایۂ فخر تھا، لیکن اس کا تذکرہ بھی وہ پسند نہیں کرتے تھے، امام ذہبی ان کے ایک ساتھی عباس دوری سے

---

[1] حلیۃ الاولیاء جلد ۹ صفحہ [illegible]

نقل کرتے ہیں کہ احمد بن حنبل نے میرے پاس اپنا خرچ رکھا دیا تھا اور اس سے بقدر ضرورت وہ لیتے رہتے تھے، ایک دن میں نے ان سے کہا کہ ابو عبداللہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عرب ہیں انھوں نے جواب دیا یا ابا النعمان نحن قوم مساکین ابو نعمان ہمارا کیا ہم غریب لوگ ہیں میں اس بات سے بہت پوچھتا رہا مگر انھوں نے ٹالدیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔

باوجود اس کے کہ فتنۂ خلق قرآن میں ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام عالم اسلام میں ان کا چرچا تھا اور ہر طبقہ کی تعریف اور ان کے لئے دعا کا غلغلہ بلند تھا وہ برابر خائف رہتے تھے اور ان کو اپنی طرف سے اطمینان نہیں تھا مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ان سے کہا کہ آپ کے لئے بڑی کثرت سے دعا ہوتی ہے، فرمایا مجھے اندیشہ ہے کہیں استدراج نہ ہو کیوں تم نے یہ کیسے کہا میں نے کہا طرسوس سے ایک شخص آیا ہے وہ کہتا ہے کہ ہم ملک روم میں جہاد کر رہے تھے رات کے سناٹے میں احمد کے لئے دعا کا شور ہوتا اور کہنے والے نے کہا کہ احمد کے لئے دعا کرو اور ہم امام احمد کی طرف سے نیت کر کے منجنیق بھی چلاتے تھے اور ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ دشمن کا ایک شخص قلعہ کی دیوار پر کھڑا ہوا تھا اور سپر کو بالکل آڑ بنائے ہوئے تھا ہم نے احمد کی نیت کر کے منجنیق چلائی اس کا سر اور سپر اڑ گئی یہ سن کر امام احمد کے چہرہ کا رنگ بدل گیا اور فرمایا خدا کرے یہ استدراج نہ ہو۔

بعض مرتبہ ان کو دیکھنے کے لئے غیر مسلم بھی دور دور سے آتے ایک مرتبہ ایک عیسائی طبیب علاج کے لئے آیا اس نے کہا کہ میں کئی سال سے آپ کی زیارت کا آرزومند تھا آپ کی زندگی صرف اسلام ہی کے لئے خیر و برکت کا باعث نہیں ساری مخلوق کے لئے وہ خیر و برکت ہے ہمارے سب دوست آپ سے بہت خوش ہیں مروزی کہتے ہیں کہ جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں آپ کے لئے دعا ہوتی ہوگی، انھوں نے فرمایا کہ بھائی انسان پر اپنی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے تو کوئی بھی بات اس کو دھوکہ نہیں ہوتا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے تواضع اور مسکنت کے ساتھ ان کو رعب و وقار بھی اتنا بخشا تھا کہ اہل حکومت اور فوجی اور سیاسی بھی ان سے مرعوب ہو جاتے تھے اور ان کا احترام کرنے پر مجبور تھے، ان کے ایک معاصر کہتے ہیں کہ

---

[1] خدا کی طرف سے [illegible] کی کرامت اور وجاہت کا ظہور ہے۔ [illegible]

میں اسحٰق بن ابراہیم (نائب بغداد) اور فلاں فلاں حکام کے پاس گیا ہوں، لیکن میں نے احمد بن حنبل سے زیادہ بارعب کسی کو نہیں دیکھا، میں ان سے ایک مسئلہ میں گفتگو کرنے گیا، مجھ پر ان کی ہیبت سے لرزہ طاری ہوگیا۔ ان کے زمانہ کے تمام اہل قلوب اور اہل خلوص ان کی عظمت کے قائل اور ان کا ادب کرتے تھے، علماء وقت اور ائمہ فن ان کے تبحر و وسعت علم کے معترف اور اس سے متعجب تھے، مشہور محدث ابراہیم الحربی کہتے ہیں۔

رأیت احمد بن حنبل فرأیت کأن الله	میں نے احمد بن حنبل کو دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
جمع له علم الاولین والآخرین من کل	اللہ تعالیٰ نے ان کے سینہ میں اگلوں پچھلوں کا ہر قسم کا علم
صنف یقول ما شاء و یمسک	یکجا کر دیا ہے، جو چاہتے ہیں اظہار کرتے ہیں اور جو
ما شاء۔[1]	چاہتے ہیں اپنے سینہ میں رکھتے ہیں۔

امام احمد کا زہد ضرب المثل تھا، مامون، معتصم اور واثق کا دور ان کے لئے اس حیثیت سے آزمائش کا تھا کہ وہ تینوں ان کے درپے آزار تھے، متوکل کا دور اس لئے آزمائش کا تھا کہ وہ ان کا عقیدت مند اور بہت قدر دان تھا، ان کو اس دور کی آزمائش زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی اور اس سے ہمیشہ خائف رہتے تھے، کبھی کبھی فرماتے تھے کہ ان لوگوں کی ایذا و تعذیب کے باوجود میرا دین سلامت رہا، اب اس بڑھاپے میں اس دور کی آزمائش میں مبتلا ہوں، لیکن جس طرح معتصم کے تازیانے ان کے اعتصام بالسنۃ اور استقامت میں فرق نہ پیدا کر سکے اسی طرح متوکل کی عقیدت مندی ان کے استغناء و توکل میں تغیر نہ پیدا کر سکی، ایک مرتبہ متوکل نے ایک ایسی بھاری تھیلی بھیجی جو خچر پر رکھ کر لائی گئی تھی، انھوں نے صاف کہہ دیا کہ مجھے حاجت نہیں، لانے والے نے کہا کہ آپ کو واپس کرنا مناسب نہیں، بڑی مشکل سے خلیفہ کا دل صاف ہوا ہے، اس کو پھر بدگمانی ہو جائے گی، انھوں نے ایک جگہ ڈلوا دی، آدھی رات کو انھوں نے اپنے چچا کو جگایا اور کہا کہ مجھے اس تھیلی کی وجہ سے رات بھر نیند نہیں آئی، میں یہ سوچ کر بڑا پشیمان اور پریشان ہوں، انھوں نے کہا کہ اس وقت تو آدھی رات ہے، لوگ غافل

---

[1] مناقب ابن جوزی، مناقب حافظ ذہبی، طبقات ابن السبکی۔

سو رہئے، صبح جیسا آپ کی سمجھ میں آئے کیجئے گا، صبح ہی انھوں نے بعض معتمد اور بعض واقف کار لوگوں کو بلایا اور ان لوگوں کی فہرست تیار کروائی جو صاحب احتیاج اور مستور الحال تھے اور مال تقسیم کرنا شروع کیا یہاں تک کہ تھیلی میں ایک درہم بھی باقی نہیں بچا، پھر تھیلی بھی ایک مسکین کو خیرات کر دی۔[1]

انھوں نے متوکل کے حکم و اصرار سے کچھ روز اس کی لشکر گاہ میں قیام فرمایا، اس عرصہ میں وہ شاہی مہمان تھے، روزانہ ان کے لئے پر تکلف کھانا آتا تھا، جس کی قیمت کا اندازہ ایک سو بیس درہم روزانہ ہے، انھوں نے اس کھانے کو کبھی چکھا تک نہیں، وہ مسلسل روزہ رکھتے رہے، آٹھ روز انھوں نے روزہ پر روزہ رکھا، یہاں تک کہ بے انتہا ضعیف ہو گئے، اگر جلدی ان کو رخصت نہ مل جاتی تو ان کی زندگی مشکل تھی۔[2] ان کے صاحبزادے عبداللہ کہتے ہیں کہ میرے والد لشکر گاہ میں سولہ روز رہے، انھوں نے اس عرصہ میں ایک چوتھائی ستو کھایا ہو گا، ان کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے، متوکل کے اصرار سے ان کے صاحبزادوں کے لئے شاہی رقم مقرر ہو گئی تھی، ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان کے صاحبزادہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے تو ہمارے یہاں سے وہ کوئی چیز استعمال کے لئے منگوا بھی لیتے تھے لیکن جب سے شاہی رقم ہمارے گھر آنے لگی، انھوں نے یہ سلسلہ بالکل بند کر دیا، ایک مرتبہ طبیب نے ان کے لئے ایک بھنے ہوئے کدو کا پانی تجویز کیا، لوگوں نے کہا کہ اس کو صالح (امام احمد کے صاحبزادہ) کے تنور میں پکالو، وہ ابھی گرم ہے، انھوں نے منع فرمایا،[3] آخر میں ان کو خود اپنی احتیاط بھی کافی نہ معلوم ہوئی، صالح کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک روز فرمایا کہ صالح! میرا جی چاہتا ہے کہ تم اس عطیۂ شاہی کو چھوڑ ہی دو، اس لئے کہ یہ تم کو میرے سبب سے ملتا ہے۔

۷۷ سال کی عمر ہوئی تھی کہ بیمار ہوئے، عیادت کرنے والوں کا اتنا ہجوم تھا کہ لوگ فوج در فوج داخل ہوتے تھے اور گھر بھر جاتا تھا، جب وہ چلے جاتے تو دوسرا مجمع آتا، سڑک آدمیوں سے بھر جاتی تھی ۹ روز وہ بیمار رہے، ہجوم بڑھتا جاتا تھا، سلطان کو اطلاع ہوئی، ان کے دروازہ پر اور گلی میں پولیس کا پہرہ لگایا

---

[1] ترجمۃ الامام احمد بن حنبل از ابو اسلام محمد الطاہر بن عاشور صـ [illegible] [2] ایضاً صـ [illegible] [3] ایضاً صـ [illegible]

اور وقائع نگار متعین کر دیئے کہ حالات کی اطلاع برابر دیتا رہے۔ آج تو ورم بہت بڑھتا جاتا تھا یہاں تک کہ گلا بند کر دیا گیا، لوگ سڑکوں اور مسجدوں میں بھر گئے، یہاں تک کہ بازار میں خرید و فروخت مشکل ہو گئی، پیشاب خون کا آنے لگا تھا، طبیب سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ غم اور فکر نے ان کے پیٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔[1] جمعرات کو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی، ان کے شاگرد مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ان کو وضو کرایا، تو انھوں نے تکلیف کی حالت میں بھی مجھے ہدایت کی کہ انگلیوں میں خلال کراؤں، شب جمعہ میں حالت زیادہ نازک ہو گئی اور جمعہ ۱۲ ربیع الاول کو اس امام سنت نے انتقال کیا۔[2]

فتنۂ خلق قرآن

مامون نے خلق قرآن کے مسئلہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی، ۲۱۸ھ میں اس نے والی بغداد اسحاق بن ابراہیم کے نام ایک مفصل فرمان بھیجا جس میں عام مسلمانوں اور بالخصوص محدثین کی سخت مذمت اور حقارت آمیز تنقید کی، ان کو خلق قرآن کے عقیدہ سے اختلاف کرنے کی وجہ سے توحید میں ناقص، مردود الشہادۃ، ساقط الاعتبار اور شرار امت قرار دیا۔ اور حاکم کو حکم دیا کہ جو لوگ اس مسئلہ کے قائل نہ ہوں ان کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا جائے اور خلیفہ کو اس کی اطلاع دی جائے۔[3]

یہ فرمان مامون کی وفات سے چار مہینے قبل کا ہے۔ اس کی نقلیں تمام اسلامی صوبوں کو بھیجی گئیں اور صوبہ داروں (گورنروں) کو ہدایت کی گئی کہ اپنے صوبوں کے قضاۃ کا اس مسئلہ میں امتحان لیں، اور جو اس عقیدہ سے متفق نہ ہو اس کو اس کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔

اس فرمان کے بعد مامون نے حاکم بغداد کو لکھا کہ سات بڑے محدثین کو جو اس عقیدہ کے قائل نہیں

---

[1] ذہبی ص ۲۹۹ [2] بخاری تاریخ صغیر ص ۲۴۲ [3] جن کا نام و ذکر کی تفصیل آگے آئے گی۔

[4] اس خط کا مکمل مضمون تاریخ طبری اور یعقوبی ج ۳ میں موجود ہے۔

سرگروہ ہیں ان کے پاس بھیج دیا جائے، وہ سب آئے تو مامون نے ان سے خلق قرآن کے متعلق سوال کیا، ان سب نے اس سے اتفاق کیا اور ان کو بغداد واپس کر دیا گیا، جہاں انہوں نے علماء و محدثین کے ایک مجمع کے سامنے اپنے اس عقیدہ کا اقرار کیا، لیکن شورش ختم نہیں ہوئی اور عام مسلمان اور تقریباً تمام محدثین اپنے خیال پر قائم رہے۔

انتقال سے پہلے مامون نے اسحٰق بن ابراہیم کو تیسرا فرمان بھیجا جس میں زیادہ تفصیل سے پہلے خط کے مضمون کو بیان کیا تھا، اور امتحان کے دائرہ کو وسیع کر کے اہلکاران سلطنت اور اہل علم کو بھی اس میں شامل کر لیا تھا، اور سب کے لئے اس عقیدہ کو ضروری قرار دیا تھا، اسحٰق نے فرمان شاہی کی تعمیل کی اور مشاہیر علماء کو جمع کر کے ان سے گفتگو کی اور ان کے جوابات اور مکالمہ کو بادشاہ کے پاس لکھ کر بھیج دیا، مامون اس محضر کو پڑھ کر سخت برافروختہ ہوا، ان علماء میں سے دو (بشر بن الولید اور ابراہیم ابن المہدی) کے قتل کا حکم دیا، اور لکھا کہ بقیہ میں سے جس کو اپنی رائے پر اصرار ہو اس کو پابجولاں اس کے پاس بھیجا جائے، چنانچہ بقیہ تعمیل میں سے (جو پہلے قائل نہیں ہوئے تھے) چار اپنی رائے (عدم خلق قرآن) پر قائم رہے، یہ چار اشخاص امام احمد ابن حنبل، سجادہ، قواریری اور محمد بن نوح تھے، دوسرے دن سجادہ اور تیسرے دن قواریری نے بھی اپنی رائے سے رجوع کیا، اور حضرت امام اور محمد بن نوح باقی رہ گئے جن کو مامون کے پاس طوس ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں روانہ کر دیا گیا، ان کے ہمراہ اور بھی دوسرے مقامات کے علماء تھے جو خلق قرآن کے منکر اور اس کے غیر مخلوق ہونے کے قائل تھے، ابھی یہ لوگ رقہ ہی پہنچے تھے کہ مامون کے انتقال کی خبر ملی، اور ان کو حاکم بغداد کے پاس بغداد واپس کر دیا گیا، راستہ میں محمد بن نوح کا انتقال ہو گیا، اور امام اور ان کے رفقاء بغداد پہنچے۔

مامون نے اپنے جانشین معتصم بن الرشید کو وصیت کی تھی کہ وہ قرآن کے بارے میں اس کے مسلک و عقیدہ پر قائم رہے اور اسی کی پالیسی پر عمل کرے (وخذ بسیرۃ اخیک فی القرآن) اور قاضی ابن ابی دؤاد کو بدستور اپنا مشیر اور وزیر بنائے رکھے، چنانچہ معتصم نے ان دونوں وصیتوں پر پورا پورا عمل کیا۔

امام احمد ابتلاء و امتحان میں

اب مسئلہ خلق قرآن کی مخالفت اور عقیدہ جہمیہ کی حمایت اور حکومت وقت کے مقابل کی ذمہ داری تنہا امام احمد بن حنبل کے اوپر تھی جو گروہ محدثین کے امام اور سنت و شریعت کے اس وقت امین تھے۔

امام احمد کو قید سے بغداد روانہ کیا گیا، چار چار بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی تھیں تین دن تک ان سے اس مسئلہ پر مناظرہ کیا گیا لیکن وہ اپنے اس عقیدہ سے نہیں ہٹے تو چوتھے دن والی بغداد کے پاس ان کو لایا گیا اس نے کہا کہ احمد! یہ تمہاری زندگی کی بات ہے، وہ یعنی خلیفہ تم کو اپنی تلوار سے قتل نہیں کرے گا لیکن اس نے قسم کھائی ہے کہ اگر تم نے اس کی بات قبول نہ کی تو مار پر مار پڑے گی اور تم کو ایسی جگہ ڈال دیا جائے گا جہاں کبھی سورج نہیں آئے گا۔ اس کے بعد امام کو معتصم کے سامنے پیش کیا گیا اور ان کو اس انکار و اصرار پر کوڑے لگائے گئے، ایک جلاد صرف دو کوڑے لگاتا تھا پھر دوسرا جلاد بلایا جاتا، امام احمد کو کوڑے پر کوڑے پڑتے تھے۔

[illegible] اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی
[illegible] سنت سے کچھ پیش کرو تو میں اس کو مان لوں۔

واقعہ کی تفصیلات امام احمد کی زبان سے

امام احمد نے اس واقعہ کو خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"میں جب اس مقام پر پہنچا جس کا نام باب البستان ہے تو میرے لئے سواری لائی گئی اور مجھ کو سوار ہونے کا حکم دیا گیا۔ مجھے اس وقت کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا اور میرے پاؤں میں بوجھل بیڑیاں تھیں، سوار ہونے کی کوشش میں کئی مرتبہ اپنے منہ کے بل گرتے گرتے بچا، آخر کسی نہ کسی طرح سوار ہوا اور معتصم کے محل میں پہنچا۔ مجھے ایک کوٹھری میں داخل کر دیا گیا اور دروازہ بند کر دیا گیا، آدھی رات کا

وقت تھا۔ وہاں کوئی چراغ نہیں تھا۔ میں نے نماز کے لئے مسح کرنا چاہا۔ ہاتھ بڑھایا تو پانی کا ایک پیالہ اور طشت رکھا ہوا تھا۔ میں نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ اگلے دن معتصم کا قاصد آیا اور مجھے خلیفہ کے دربار میں لے گیا۔ معتصم بیٹھا ہوا تھا۔ قاضی القضاۃ ابن ابی دؤاد بھی موجود تھا اور ان کے ہمنواؤں کی ایک بڑی جمعیت تھی۔ ابو عبدالرحمن الشافعی بھی موجود تھے۔ اسی وقت دو آدمیوں کی گردنیں بھی اڑائی جا چکی تھیں۔ میں نے ابو عبدالرحمن الشافعی سے کہا کہ تم کو امام شافعی سے مسح کے بارے میں کچھ یاد ہے؟ ابن ابی دؤاد نے کہا کہ اس شخص کو دیکھو کہ اس کی گردن اڑائی جانے والی ہے اور یہ فقہ کی تحقیق کر رہا ہے۔ معتصم نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ۔ وہ برابر مجھے پاس بلاتا رہا یہاں تک کہ میں اس سے بہت قریب ہوگیا۔ اس نے کہا بیٹھ جاؤ۔ میں بیڑیوں سے تھک گیا تھا اور بوجھل ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا کہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟ خلیفہ نے کہا کہو۔ میں نے کہا کہ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے رسول نے کس چیز کی طرف دعوت دی ہے؟ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی شہادت کی طرف۔ میں نے کہا تو میں اس کی شہادت دیتا ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ آپ کے جد امجد ابن عباس کی روایت ہے کہ جب قبیلہ عبدالقیس کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے ایمان کے بارے میں آپ سے سوال کیا۔ فرمایا تمھیں معلوم ہے کہ ایمان کیا ہے؟ انھوں نے کہا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے۔ فرمایا اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی اور مال غنیمت میں سے پانچویں حصہ کا نکالنا۔ اس پر معتصم نے کہا کہ اگر تم میرے پیش رو کے قبضہ میں پہلے نہ آگئے ہوتے تو میں تم سے تعرض نہ کرتا۔ پھر عبدالرحمن بن اسحٰق کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے تم کو حکم نہیں دیا تھا کہ اس آزمائش کو ختم کر دو۔ امام احمد کہتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ اکبر اس میں تو مسلمانوں کے لئے کشائش ہے۔ خلیفہ نے علماء حاضرین سے کہا کہ ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو۔ پھر عبدالرحمن سے کہا کہ ان سے گفتگو کرو۔ درمیان، امام احمد اس مناظرہ کی تفصیل بیان

کرتے ہیں کہ ۔۔۔

ایک آدمی بات کرتا اور میں اس کا جواب دیتا، دوسرا بات کرتا اور میں اس کا جواب دیتا، معتصم کہتا احمد! تم پر خدا رحم کرے تم کیا کہتے ہو؟ میں کہتا امیر المومنین! مجھے کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ کچھ دکھا دیجئے تو میں اس کا قائل ہو جاؤں۔ معتصم کہتا کہ اگر یہ میری بات قبول کرلیں تو میں اپنے ہاتھ سے ان کو آزاد کر دوں اور اپنے فوج و لشکر کے ساتھ ان کے پاس جاؤں اور ان کے آستانہ پر حاضر ہوں۔ پھر کہتا احمد میں تم پر بہت شفیق ہوں اور مجھے تمہارا ایسا ہی خیال ہے جیسے اپنے بیٹے ہارون کا، تم کیا کہتے ہو؟ میں وہی جواب دیتا کہ مجھے کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں سے کچھ دکھاؤ تو میں قائل ہوں، جب بہت دیر ہو گئی تو وہ اکتا گیا اور کہا جاؤ، اور مجھے قید کر دیا اور میں اپنی پہلی جگہ پر واپس کر دیا گیا، اگلے دن پھر مجھے طلب کیا گیا اور مناظرہ ہوتا رہا اور میں سب کا جواب دیتا رہا یہاں تک کہ زوال کا وقت ہو گیا، جب اکتا گیا تو کہا کہ ان کو لے جاؤ، تیسری رات کو میں سمجھا کہ کل کچھ ہو کر رہے گا، میں نے ڈوری منگوائی اور اس سے اپنی بیڑیوں کو کس لیا اور جس ازار بند سے میں نے بیڑیاں باندھ رکھی تھیں اس کو اپنے پاجامہ میں پھر ڈال لیا کہ کہیں کوئی سخت وقت آئے اور میں برہنہ ہو جاؤں۔ تیسرے روز مجھے پھر طلب کیا گیا، میں نے دربار بھرا ہوا ہے، میں مختلف ڈیوڑھیاں اور مقامات طے کرتا ہوا آگے بڑھا، کچھ لوگ تلواریں لیے کھڑے تھے، کچھ لوگ کوڑے لیے، پچھلے دونوں دن کے بہت سے لوگ آج نہیں تھے، جب میں معتصم کے پاس پہنچا تو کہا بیٹھ جاؤ، پھر کہا ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، لوگ مناظرہ کرنے لگے، میں ایک کا جواب دیتا، پھر دوسرے کا جواب دیتا، میری آواز سب پر غالب تھی، جب دیر ہو گئی تو مجھے الگ کر دیا اور ان کے ساتھ تخلیہ میں کچھ بات کی، پھر ان کو ہٹا دیا اور مجھے بلا لیا، پھر کہا احمد! تم پر خدا رحم کرے، میری بات مان لو، میں تم کو اپنے ہاتھ سے رہا کر دوں گا، میں نے پہلا سا جواب دیا، اس پر اس نے برہم ہو کر کہا کہ ان کو پکڑو اور

لہ معتصم امام احمد کے معاملہ میں زیادہ سرگرم نہ تھا، مگر احمد بن ابی دؤاد اس کو گرم کرتا رہا اور غیرت دلاتا رہا کہ لوگ کہیں گے کہ معتصم نے شکست کھائی اور ان کے مسلک سے ہٹ گیا۔

کھینچا اور ان کے ہاتھ کھینچ دو۔ معتصم کرسی پر بیٹھ گیا اور جلادوں اور تازیانہ لگانے والوں کو بلایا اور جلادوں سے کہا آگے بڑھو۔ ایک آدمی آگے بڑھتا اور مجھے دو کوڑے لگاتا۔ معتصم کہتا زور سے کوڑے لگاؤ۔ پھر وہ ہٹ جاتا اور دوسرا آتا اور وہ کوڑے لگاتا۔ انیس کوڑوں کے بعد معتصم میرے پاس آیا اور کہا احمد! کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو؟ بخدا مجھے تمہارا بہت خیال ہے۔ ایک شخص عجیف مجھے اپنی تلوار کے دستے سے چھیڑتا اور کہتا کہ تم ان سب پر غالب آنا چاہتے ہو۔ دوسرا کہتا کہ اللہ کے بندے خلیفہ تمہارے سر پر کھڑا ہوا ہے۔ کوئی کہتا کہ امیرالمؤمنین! آپ روزے سے ہیں اور آپ دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں۔ معتصم پھر مجھ سے بات کرتا اور میں اس کو وہی جواب دیتا۔ وہ پھر جلاد کو حکم دیتا کہ پوری قوت سے کوڑے لگاؤ۔ امام احمد کہتے ہیں کہ پھر اس اثناء میں میرے حواس جاتے رہے۔ جب میں ہوش میں آیا تو دیکھا کہ بیڑیاں کھول دی گئی ہیں۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم نے تم کو اوندھے منہ گرا دیا، تم کو روندا۔ احمد کہتے ہیں کہ مجھ کو کچھ احساس نہیں ہوا۔[1]

بے نظیر عزیمت و استقامت

اس کے بعد احمد بن حنبل کو گھر پہنچا دیا گیا۔ جب سے وہ گرفتار کئے گئے اور رہائی کے وقت تک اٹھائیس مہینے ان کو حبس میں گزرے۔ ان کو ۳۳۔۳۴ کوڑے لگائے گئے۔ ابراہیم ابن مصعب جو سپاہیوں میں تھے کہتے ہیں کہ میں نے احمد سے زیادہ جری اور دلیر شخص نہیں دیکھا، ان کی نگاہ میں ہم لوگوں کی حقیقت بالکل مکھی کی سی تھی ۔۔۔ محمد بن اسمٰعیل کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ احمد کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی پر پڑتا تو چیخ مار کر بھاگتا۔ ایک صاحب جو واقعہ کے وقت موجود تھے بیان کرتے ہیں کہ امام روزے سے تھے۔ میں نے کہا بھی کہ آپ روزے سے ہیں اور آپ کو اپنی جان بچانے کے لئے اس عقیدہ کا اقرار کرنے کی گنجائش

---

[1] تاریخ الاسلام ذہبی ترجمۂ امام احمد صفحہ ۱۲۱ - ۲۹ باختصار و تلخیص۔

ہے لیکن انھوں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا، ایک مرتبہ پیاس کی بہت شدت ہوئی تو پانی طلب کیا، آپ کے سامنے برف کے پانی کا پیالہ پیش کیا گیا، آپ نے اس کو ہاتھ میں لیا، اور کچھ دیر اس کو دیکھا، پھر بغیر پئے واپس کر دیا۔[1]

صاحبزادہ کہتے ہیں کہ انتقال کے وقت میرے والد کے جسم پر ضرب کے نشان تھے۔ ابوالعباس الرقی کہتے ہیں کہ احمد جب رقہ میں محبوس تھے تو لوگوں نے ان کو سمجھانا چاہا، اور اپنے بچاؤ کرنے کی حدیثیں سنائیں، انھوں نے فرمایا کہ خباب کی حدیث کا کیا جواب ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ پہلے بعض بعض لوگ ایسے تھے جن کے سر پر آرہ رکھ کر چلا دیا جاتا تھا پھر بھی وہ اپنے دین سے ہٹتے نہیں تھے۔

یہ سن کر لوگ ناامید ہو گئے اور سمجھ گئے کہ وہ اپنے مسلک سے نہیں ہٹیں گے اور سب کچھ برداشت کریں گے

امام احمد کا کارنامہ اور اس کا صلہ

امام احمد کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اور مسلمان ایک بڑے دینی خطرے سے محفوظ ہو گئے، جن لوگوں نے اس دینی ابتلا میں حکومت وقت کا ساتھ دیا تھا اور رخصت پرستی اور مصلحت شناسی سے کام لیا تھا، وہ لوگوں کی نگاہوں سے گر گئے اور ان کا دینی و علمی اعتبار جاتا رہا، اس کے بالمقابل امام احمد کی شان دوبالا ہو گئی، ان کی محبت اہل سنت اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کا شعار اور علامت بن گئی، ان کے ایک معاصر قتیبہ کا مقولہ ہے کہ:—

اذا رأیت الرجل یحب احمد بن	جب تم کسی کو دیکھو کہ اس کو احمد بن حنبل سے
حنبل فاعلم انہ صاحب سنۃ[2]	محبت ہے تو سمجھو کہ وہ سنت کا متبع ہے۔

---

[1] تاریخ الاسلام للذہبی، ترجمۃ الامام احمد ص [illegible] باختصار و تلخیص۔

[2] ایضاً ص [illegible]

ایک دوسرے عالم احمد بن ابراہیم الدورقی کا قول ہے۔

من سمعتموہ یذکر احمد بن حنبل	جس کو تم احمد بن حنبل کا ذکر برائی سے کرتے سنو
بسوء فاتہموہ علی الاسلام۔[۱]	اس کے اسلام کو مشکوک نظر سے دیکھو۔

امام احمد حدیث میں امام وقت تھے، مسند کی ترتیب و تالیف ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے، وہ مجتہد فی المذہب اور امام مستقل ہیں، وہ بڑے زاہد و عابد تھے، یہ سب فضیلتیں اپنی جگہ پر مسلم ہیں لیکن ان کی عالمگیر مقبولیت و محبوبیت اور عظمت و امامت کا اصل راز ان کی عزیمت اور استقامت اس فتنۂ عالم آشوب میں دین کی حفاظت اور اپنے وقت کی سب سے بڑی بادشاہی کا تنہا مقابلہ ہی ان کی قبولِ عام اور بقائے دوام کا اصل سبب ہے۔

آوازۂ خلیل ز تعمیر کعبہ نیست
مشہور شد ازاں کہ در آتش نکو نشست

ان کے معاصرین نے جنھوں نے اس فتنہ کی عالم آشوبی دیکھی تھی ان کے اس کارنامہ کی عظمت کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے اور اس کو دین کی بروقت حفاظت اور مقام صدیقیت سے تعبیر کیا ہے، ان کے ہمعصر اور ہم استاذ مشہور محدث وقت علی بن المدینی (جو امام بخاری کے نامور استاذ ہیں) کا ارشاد ہے:-

ان اللہ اعز ھذا الدین برجلین	اللہ تعالیٰ نے اس دین کا غلبہ و حفاظت
لیس لھما ثالث ابوبکر الصدیق	کا کام دو شخصوں سے لیا ہے جن کا کوئی تیسرا ہمسر
یوم الردۃ واحمد بن حنبل یوم المحنۃ۔[۲]	نظر نہیں آتا، ارتداد کے موقع پر ابوبکر صدیق
	اور فتنۂ خلق قرآن کے سلسلہ میں احمد بن حنبل۔

---

[۱] تاریخ بغداد للخطیب ج ۴ ص ۴۲۱ [۲] ایضاً ص ۴۱۸

اس عظمت و مقبولیت کا نتیجہ تھا کہ ۲۴۱ھ میں جب امام سنت نے انتقال کیا تو سارا شہر امنڈ آیا۔ کسی کے جنازہ پر خلقت کا ایسا ہجوم اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ نماز جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد کا اندازہ یہ ہے کہ آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں۔[1]

---

[1] ترجمۃ الامام احمد للذہبی، تاریخ ابن خلکان۔

فتنۂ اعتزال

اور

امام ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو

معتزلہ کا علمی اقتدار اور اس کے اثرات

معتصم اور واثق کے انتقال پر جو مذہب اعتزال اور معتزلہ کے سرپرست تھے، معتزلہ کا زور ٹوٹ گیا، واثق کا جانشین خلیفہ متوکل مذہب اعتزال سے بیزار اور معتزلہ کا دشمن تھا، اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر معتزلہ کی عظمت و اقتدار کے نشانات مٹائے اور ان کو حکومت سے بالکل بے دخل کر دیا، لیکن علمی حلقوں میں ابھی معتزلہ کا اثر باقی تھا، خلق قرآن کا عقیدہ تو اپنی طاقت کھو چکا تھا، لیکن ان کے دوسرے مباحث اور مسائل ابھی تازہ اور زندہ تھے، معتزلہ نے اپنی ذہانت، علمی قابلیت اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کی وجہ سے اپنا علمی وقار قائم کر لیا تھا، اور قضا، وزارت اور حکومت کے اندر بعض اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ تیسری صدی کے وسط میں ان کا خاصا دور دورہ ہو گیا، عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا کہ معتزلہ دقیق النظر، وسیع الفکر اور محقق ہوتے ہیں اور ان کی آراء و تحقیقات عقل سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، بہت سے نوجوان طالب علم اور شہرت پسند اعتزال کو فیشن کے طور پر اختیار کرتے تھے، امام احمد کے بعد حنابلہ میں کوئی طاقتور علمی اور دینی شخصیت نہیں پیدا ہوئی، محدثین اور ان کے ہم مسلک علماء نے علوم عقلیہ اور نئے طریقۂ بحث و نظر کی طرف (جس کا معتزلہ اور فلاسفہ کے اثر سے رواج پڑ چلا تھا) توجہ نہیں کی نتیجہ یہ تھا کہ مباحثوں میں مغلوب

اور دین کے حلقوں میں محدثین کی یہ علمی کمزوری اور فلسفہ کے مبادی سے بے خبری محسوس کی جاتی تھی، اس کے مقابلہ میں علمی مباحثوں میں معتزلہ کا پلہ بھاری رہتا، اور جو لوگ دین کا گہرا علم نہیں رکھتے تھے، اور اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ سطحی ذہانت معتزلہ کی تائید کرتی ہے اور پختہ اور گہری ذہانت بالآخر محدثین ہی کے مسلک اور محکمات شریعت کو قبول کرتی ہے، وہ معتزلہ کی حسن تقریر، حاضر جوابی اور علمی موشگافی سے متاثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہر شریعت اور مسلک سلف کی علمی بے توقیری اور اس کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو چلی تھی، خود محدثین اور ان کے تلامذہ کے گروہ میں بہت سے لوگ احساس کمتری کا شکار تھے اور معتزلہ کی عقلیت اور تفلسف سے مرعوب ہو رہے تھے، یہ صورت حال دینی وقار اور سنت کے اقتدار کے لئے سخت خطرناک تھی، قرآن مجید کی تفسیر اور عقائد اسلام، ان فلسفی نما ناظرین کے لئے بازیچۂ اطفال بنے ہوئے تھے، مسلمانوں میں ایک خام عقلیت اور سطحی فلسفیت مقبول ہو رہی تھی، یہ محض ایک ذہنی ورزش تھی اور اصطلاحات کی کرتب بازی، اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے نہ تو محدثین و حنابلہ کی دینی غیرت اور جوش کافی تھا، نہ عابدوں و زاہدوں کا زہد و عبادت، اور نہ فقہاء کے فتاوی اور جزئیات و مسائل پر ان کا عبور و استحضار۔

سنت کے وقار کے لئے ایک بلند شخصیت کی ضرورت

اس کے لئے ایک ایسی شخصیت درکار تھی جس کی دماغی صلاحیتیں معتزلہ سے کہیں بلند ہوں، جو عقلیت کے کوچہ سے نہ صرف واقف بلکہ عرصہ تک اس کا رہ نورد رہ چکا ہو، جس کی بلند شخصیت اور مجتہدانہ دماغ کے سامنے اس زمانہ کی عقلیت و فلسفہ کے علمبردار مبتدی طالب علم معلوم ہوتے ہوں، اور ایسے پست و حقیر نظر آتے ہوں جیسے کسی دیو قامت انسان کے سامنے پستہ قد انسان اور نو عمر بچے، اسلام کو فوری طور پر ایک ایسے امام سنت کی ضرورت تھی اور شیخ ابوالحسن اشعری کی ذات میں اس کو وہ شخصیت مل گئی۔

امام ابو الحسن اشعری

ابو الحسن علی نام، والد کا نام اسمٰعیل تھا، مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعری کی اولاد میں سے تھے، سنہ ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ نے ان کے والد اسمٰعیل کے انتقال کے بعد ابو علی الجبائی سے نکاح کر لیا تھا، جو اپنے وقت میں معتزلہ کے امام اور مذہب اعتزال کے علمبردار تھے، شیخ ابو الحسن نے ان کی آغوش میں تربیت پائی اور بہت جلد ان کے معتمد اور دست راست بن گئے، ابو علی الجبائی اچھے مدرس اور مصنف تھے، مباحثہ پر زیادہ قدرت نہیں رکھتے تھے، ابو الحسن اشعری شروع سے زبان آور اور حاضر جواب تھے، ابو علی بحث و مناظرہ کے موقع پر انہی کو آگے کر دیتے تھے، بہت جلد وہ سر حلقہ اور مجالس بحث کے صدر نشین بن گئے،[1] تمام ظاہری قیاسات و قرائن بتلاتے تھے کہ وہ اپنے مربی اور استاد کے جانشین ہوں گے اور مذہب اعتزال کی حمایت و اشاعت میں شاید ان سے بھی آگے بڑھ جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے انتظامات عجیب ہیں، اس نے سنت کی حفاظت و نصرت کے لئے اسی شخص کو انتخاب کیا جس نے ساری زندگی مذہب اعتزال کی حمایت و اثبات میں گزار دی تھی اور جس کے لئے اعتزال کی مسند امامت تیار تھی، شیخ ابو الحسن کی طبیعت میں اعتزال کا رد عمل پیدا ہوا، ان کی طبیعت معتزلہ کی تاویلوں اور قیاس آرائیوں سے متنفر ہونے لگی اور ان کو محسوس ہونے لگا کہ یہ سب ذہانت کی باتیں ہیں اور اپنے مذہب کی پیچ سے حقیقت کچھ اور ہے، اور وہ وہی ہے جو صحابہ کرام اور سلف کا مسلک ہے، بالآخر عقل کو نبوت کے آستانہ پر جھکنا پڑتا ہے، چالیس برس تک معتزلہ کے مذہب اور اعتقادات کی حمایت اور ان کی وکالت کرنے کے بعد ان کی طبیعت اس سے بالکل پھر گئی اور ان کے ذہن میں ان کے خیالات سے بغاوت پیدا ہوئی، پندرہ دن وہ گھر سے نہیں نکلے، سولہویں دن وہ گھر سے سیدھے جامع مسجد پہنچے، جمعہ کا دن تھا، اور جامع مسجد

---

[1] تبیین کذب المفتری لابن عساکر دمشقی ص ۱۱۱

جمع ہوئی تھی انھوں نے منبر پر چڑھ کر بلند آواز سے اعلان کیا "جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا ہے اس کو بتلاتا ہوں کہ میں ابوالحسن اشعری ہوں، میں معتزلی تھا فلاں فلاں عقیدوں کا قائل تھا، اب توبہ کرتا ہوں، اپنے سابق خیالات سے باز آتا ہوں، آج سے میرا کام معتزلہ کی تردید اور ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کا اظہار ہے۱، وہ دن اور ان کی زندگی کا آخیر، ان کی ذہانت، علمی تبحر، قوت گویائی اور استدلال تحریر معتزلہ کی تردید اور سلف کے مسلک اور اہل سنت کے عقائد کی تائید و اثبات میں صرف ہوئی، وہ کل تک معتزلہ کی زبان اور ان کا سب سے بڑا وکیل تھا، وہ اہل سنت کا ترجمان اور ان کا سب سے بڑا حامی بن گیا

امام ابوالحسن اشعری کا جذبۂ تبلیغ و احقاق حق

وہ اس کو فرض کفایہ اور جہاد و دعوت سمجھ کر انجام دیتے تھے اور خود معتزلہ کی مجلسوں میں جا کر اور ان کے ممتاز لوگوں سے مل کر ان کو دعوت دیتے اور حق کی تفہیم کرنے کی کوشش کرتے تھے، کسی نے ان سے کہا کہ آپ اہل بدعت سے کیوں ملتے جلتے ہیں اور خود کیوں ان کے پاس چل کر جاتے ہیں حالانکہ ان کے ترک تعلق کا حکم ہے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا کیا کروں وہ بڑے بڑے عہدوں پر ہیں، ان میں سے کوئی حاکم شہر ہے کوئی قاضی ہے، وہ اپنے عہدہ اور وجاہت کی وجہ سے میرے پاس آنے سے رہے، اب اگر میں بھی ان کے پاس نہ گیا تو حق کیسے ظاہر ہوگا، اور ان کو کیسے معلوم ہوگا کہ اہل سنت کا بھی کوئی مددگار اور دلائل سے ان کے مذہب کا ثابت کرنے والا ہے؟۲

ان کی ذہنی صلاحیتیں اور علمی کمالات

امام ابوالحسن کو مناظرہ اور بحث و استدلال کا پہلے سے ملکہ تھا، اور یہ ان کا فطری ذوق اور خداداد

۱۔ ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۶۴ ۲۔ تبیین کذب المفتری صفحہ ۱۱۶

صلاحیت تھی، مذہب حق کی حمایت کے جذبہ اور تائید الٰہی نے ان کی ان قوتوں اور صلاحیتوں کو اور جلا دیا، وہ اپنے زمانہ کی عقلی سطح سے بلند تھے اور عقلیات و علم و کلام میں ماہرانہ دماغ رکھتے تھے، معتزلہ کے سوالات و اعتراضات کا جواب وہ اس آسانی سے دیتے تھے جیسے کوئی کہنہ مشق استاد اور ماہر فن مبتدی طالب علم کے سوالات کا جواب دیتا ہے، اور ان کو خاموش کر دیتا ہے، ان کے ایک شاگرد ابو عبداللہ بن خفیف اپنی پہلی ملاقات اور ایک مجلس کی کیفیت بیان کرتے ہیں:-

> "میں شیراز سے بصرہ آیا، مجھے ابوالحسن اشعری کی زیارت کا شوق تھا، لوگوں نے مجھے ان کا پتہ دیا، میں آیا تو وہ ایک مجلس مناظرہ میں تھے، وہاں معتزلہ کی ایک جماعت تھی، وہ لوگ گفتگو کر رہے تھے، جب وہ خاموش ہو گئے اور انھوں نے اپنی بات پوری کر لی تو ابوالحسن اشعری نے گفتگو شروع کی، انھوں نے ایک ایک سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے یہ کہا تھا اور اس کا جواب یہ ہے، تم نے یہ اعتراض کیا تھا اور اس کا جواب اس طرح ہے، یہاں تک کہ انھوں نے سب کا جواب دے دیا، جب وہ مجلس سے اٹھے تو میں ان کے پیچھے پیچھے چلا اور ان کو دیر تک دیکھنے لگا، انھوں نے فرمایا کہ تم کیا دیکھتے ہو؟ میں نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی کتنی زبانیں ہیں، کتنے کان اور کتنی آنکھیں ہیں، آپ سب کی سنتے، سب کی سمجھتے اور سب کا جواب دیتے ہیں، وہ یہ سن کر ہنس دیئے۔"[1]

ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ "آپ کی سب باتیں تو سمجھ میں آ گئیں مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ آپ ابتداءً خاموش کیوں رہتے ہیں، اور معتزلہ کو گفتگو کا موقع کیوں دیتے ہیں، آپ کی شان تو یہ ہے کہ آپ ہی گفتگو کریں اور اعتراضات کو خود رفع کر دیں، انھوں نے فرمایا کہ میں ان مسائل و اقوال کو اپنی زبان سے ادا کرنا جائز نہیں سمجھتا، البتہ یہ جب کسی کی زبان سے نکل جائیں تو پھر ان کا جواب دینا اور ان اقوال کی تردید اہل حق کا فرض ہو جاتا ہے۔"[2]

---

[1] تبیین کذب المفتری ص ۹۵ [2] ایضاً ص ۹۵-۹۶

امام ابوالحسن اشعری مجتہد فن اور علم کلام کے بانی تھے، ان کے بعد متکلمین ان کی خداداد ذہانت، ان کے کلام کی گہرائی، ان کی نکتہ رسی اور ان کی بلند نظری کے قائل رہے، قاضی ابوبکر باقلانی سے جن کو ان کے معاصرین نے ان کی فصاحت و حسن تقریر و قوت تحریر کی وجہ سے "لسان الامۃ" کا خطاب دیا تھا، کسی نے کہا کہ آپ کا کلام امام ابوالحسن اشعری کے کلام سے زیادہ دلنشیں اور واضح معلوم ہوتا ہے، انھوں نے کہا کہ "میری انتہائی سعادت یہ ہے کہ میں ابوالحسن کے کلام کو سمجھ لوں"۔[1]

علامہ ابو اسحٰق اسفرائینی کا پایہ علم کلام و اصول فقہ میں مسلم ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں شیخ ابوالحسن باہلی (امام ابوالحسن اشعری کے شاگرد) کے سامنے ایسا تھا جیسے سمندر کے اندر قطرہ، اور شیخ ابوالحسن باہلی کہتے تھے کہ میری حیثیت امام ابوالحسن اشعری کے سامنے ایسی تھی جیسے سمندر کے پہلو میں ایک قطرہ۔[2]

ان کا مسلک اور ان کی خدمات

امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ اور محدثین کے درمیان ایک معتدل و متوسط مسلک اختیار کیا، وہ نہ تو معتزلہ کی طرح عقل کی غیر محدود طاقت اور فرمانروائی کے قائل تھے کہ وہ الٰہیات کے بارے میں اور مابعد الطبیعیات میں بھی بے تکلف اپنا عمل کر سکے اور اس کے جزئیات و تفصیلات اور ذات و صفات باری تعالیٰ کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کر سکے اور اس کو معیار قرار دیا جا سکے، نہ وہ بعض پرجوش محدثین و حنابلہ کی طرح دین کی نصرت اور عقائد اسلامیہ کی حفاظت کے لیے عقل کا انکار اور اس کی تحقیر ضروری سمجھتے تھے اور ان کلامی و اعتقادی مباحث سے جو زمانہ کے اثرات سے شروع ہو گئے تھے بالکلیہ احتیاط و سکوت واجب سمجھتے تھے، وہ معتزلہ اور فلسفہ زدہ علماء سے ان کی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کرتے تھے جس سے مذہب و عقائد اہل سنت کا وقار اور وزن بڑھتا تھا، ان کا اس پر عمل تھا کہ کلموا الناس علی قدر عقولہم، اس میں

---

[1] تبیین کذب المفتری صفحہ [illegible]   [2] ایضاً صفحہ ۱۲۵

جس طرح عوام کی عقلی سطح کی رعایت ضروری ہے اسی طرح اہل علم و عقلاء کی عقلی سطح کی رعایت بھی ضروری

ابوالحسن اشعری نے پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ معتزلہ پر تنقید کی انھوں نے دین کے اخذ و فہم میں اپنی خواہشات کی پیروی اور اپنے فرقہ کے پیشواؤں کی تقلید کی اور کتاب و سنت کو اس کا ماخذ نہیں بنایا بلکہ جہاں قرآن کی آیات اور اپنے عقائد میں تعارض دیکھا بے تکلف اس کی تاویل اور توجیہ کر لی۔ کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ * میں جو اعتزال سے علیحدگی کے بعد کی اولین تصنیفات میں سے ہے تحریر فرماتے ہیں۔

أما بعد فإن كثيراً من الزائغين عن الحق	حمد و صلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ معتزلہ اور قدریہ والوں
من المعتزلة وأهل القدر مالت بهم	نے جو حق سے منحرف ہیں اپنی خواہشات کی پیروی کی
أهواؤهم إلى تقليد رؤسائهم ومن مضى	اپنے پیشواؤں اور اپنے فرقہ کے پیش روؤں کی تقلید
من أسلافهم فتأولوا القرآن على آرائهم	کی اور اپنی آراء کے مطابق کرنے کے لئے قرآن کی
تأويلاً لم ينزل الله به سلطاناً ولا أوضح	ایسی تاویلیں کیں جن کی خدا نے کوئی سند نہیں
به برهاناً ولا نقلوه عن رسول الله	اتاری نہ اس کی کوئی واضح دلیل ہے اور نہ وہ
رب العالمين ولا عن السلف	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف (صحابہ و
المتقدمين۔	تابعین) سے منقول ہیں۔

پھر اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں۔

قولنا الذي نقول به وديانتنا التي	ہمارا عقیدہ جس کے ہم قائل ہیں اور ہمارا مسلک
ندين بها التمسك بكتاب ربنا عز وجل	جس پر ہم قائم ہیں۔ یہ کہ قرآن مجید اور سنت
وبسنة نبينا عليه السلام وما روي	رسول کو مضبوط پکڑا جائے اور صحابہ و تابعین

---

* کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ ص۵ ۔ طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد۔

[illegible]

مذهب أهل السنة.

[illegible]

لیکن ان کا اصل کارنامہ اس مسلک سنت اور عقیدہ اہل سنت کے ساتھ موافقت اور اس کا اعلان و تائید نہیں ہے، یہ تو محدثین اور علماء حنابلہ کر رہے تھے، ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کتاب و سنت کے ان حقائق اور اہل سنت کے ان عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا اور معتزلہ اور دوسرے فرقوں سے ان کے ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک عقیدہ میں انہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے مذاہب اہل سنت کی صداقت اور ان کا منقول و معقول کے مطابق ہونا واضح کیا

[illegible]

دین کی اہم ضرورت تھی کیونکہ اس وقت کے تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن پر یونانی علوم و فنون کے مرعوب تھے اور ایسا ہونا بالکل فطری تھا، علمی و ذہانت، ذہن اور دماغ کی برتری کا باعث بھی تھے جن کے نزدیک ان مباحث پر گفتگو، فلسفیانہ اصطلاحات کا استعمال کرنا اور مباحث و مسائل میں عقلی استدلال سے کام لینا ہی ایک ذہنی و علمی کمال کی بات تھی

امام ابوالحسن اشعری خود اس بات کے قائل رہے ہیں کہ وحی کا مقام بالاتر اور یہ بات و ما بعد الطبیعیاتی مسائل کے متعلق جو کچھ کتاب و سنت میں بیان ہوا ہے وہ عقل محدود اور قیاسات پر نہیں کی جا سکتی، یہ خیال بھی صحیح نہیں تھا کہ دین کے حقائق سے یا دوسری قوموں کے فلسفیوں کے افکار سے نظام کے بارے میں جو مسائل چھڑ گئے ہیں اور دین کی بنیاد پر جو مستقل گرہیں اور خرابیاں پڑ گئی ہیں ان سے صرف اس بنا پر سکوت کیا جائے کہ عہد صحابہ میں یہ مسائل و مباحث اور یہ الفاظ و اصطلاحات کوئی نہیں ہے ان کے نزدیک اس سے سنت و شریعت کے دفاع و تحفظ میں نقصان پہنچتا ہے اور اس کو ان کی شکست اور کمزوری محمول کیا جائے گا جو ذوق و فطرت کو عقلی استدلال اور فلسفیانہ اصطلاحات سے کام لینے پر مجبور کرتے ہیں غور و خوض کے اندر غور کرنے اور ان کے ذریعہ ان دین کی خدمت کو اپنا مقصد قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک متکلم کا مقصد محض نصرت و حمایت دین ہے اور اس کا تمام تر اعتماد کتاب و سنت پر ہے وہ جو کچھ کہتا ہے قرآن و روایت میں اس بارے میں ان کا راستہ معتزلہ و فلاسفہ سے بالکل جدا اور اس کے خلاف ہے۔ حقائق و عقائد کے ثبوت میں ان کے نزدیک عقلی استدلال اور منطقی طریق اور فلسفیانہ اصطلاحات سے کام لینا نہ صرف جائز بلکہ وقت کے تقاضے کی بنا پر ضروری اور افضل ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ وہ مباحث ہیں جن کا تعلق عقلیات و نیز سے ہے اور جن پر فلاسفہ نے ان کو اپنا نظام اعتقاد کا جزو بنا رکھا ہے ان پر تنقید اور زبان آوری سے ان کو حق و باطل کا معیار قرار دے دیا ہے، امام ابوالحسن اشعری کے نزدیک ان سے گریز کرنا صحیح نہیں، شریعت کے وکیل و ترجمان کو ان میدانوں میں بھی ان کا تعاقب کرنا ضروری ہے، عقلی حیثیت سے

ان کی تردید اور اہل حق کے مذہب کا اثبات فرض ہے ان کے نزدیک : آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے سکوت کی وجہ لاعلمی و ناقصی نہ تھی بلکہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں یہ مباحث اور یہ طرز استدلال پیدا نہیں ہوا تھا لیکن جس طرح زمانہ کے تغیرات اور نئے حالات نے بہت سی فقہی تفصیلات و جزئیات پیدا کر دیں اور نئے مسائل کے استنباط اور اجتہاد پر مجبور کیا اور زمانہ شناس اور نباض فقہاء و مجتہدین نے استنباط و اجتہاد سے کام لے کر نئے حوادث و مسائل کا جواب دیا اور امت کو نئے فتنوں اور انتشار و بے عملی کے خطروں سے بچا لیا اسی طرح محافظین شریعت اور متکلمین اہل سنت کا فرض ہے کہ عقائد و الٰہیات کے دائرہ میں جو نئے سوالات پیدا ہوں جو شبہات یا نئے اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کا جواب دیں اور زمانہ کی عقلیت کے مطابق عقائد حقہ کو ثابت و مدلل کریں امام ابو الحسن اشعری نے اسی مدعا کو ثابت کرنے کے لئے ایک مستقل رسالہ "استحسان الخوض فی الکلام" تصنیف کیا۔

بہر حال انھوں نے دونوں گروہوں کی خفا مندی اور نارضامندی سے آنکھیں بند کر کے دین کی نصرت و حمایت اور ایمان و عقیدہ کی حفاظت کے لئے جو طرز عمل ضروری سمجھا بڑی شجاعت اور صداقت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کی اور تقریر و تحریر اس میں مصروف رہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معتزلہ و فلاسفہ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو تھام لیا اور بہت سے اکھڑتے ہوئے قدموں کو جما دیا عقائد اہل سنت اور طریقہ سنت کی طرف سے پرزور و مدلل حمایت و وکالت کرنے کی وجہ سے اہل سنت میں نیا اعتماد اور نئی زندگی پیدا ہوئی اور وہ احساس کمتری دور ہو گیا جو گھن کی طرح سواد اعظم کو کھاتا جا رہا تھا معتزلہ ان کے پے در پے حملوں سے پیچھے ہٹ گئے اور ان کو اپنی حفاظت اور اپنے مذہب کے وجود کو قائم رکھنے کی فکر لاحق ہو گئی ابو بکر بن الصیرفی کہتے ہیں کہ معتزلہ نے بہت سر اٹھایا تھا ان کے مقابلے کے لئے اللہ تعالیٰ نے امام ابو الحسن اشعری کو پیدا کر دیا انھوں نے معتزلہ کو اپنی ذہانت و استدلال سے بند کر دیا ان کے اسی کارنامہ کی وجہ سے لوگوں نے ان کو مجددین و محافظین سنت میں شمار کیا ہے اور ابو بکر اسماعیلی جیسے بعض اہل

نے تجدید دین اور حفاظت شریعت کے سلسلہ میں امام احمدؒ کے بعد ان کا نام لیا ہے۔

ان کی تصنیفات

امام ابو الحسن اشعری نے صرف بحث و مناظرہ اور درس و تقریر و تفہیم پر اکتفا نہیں کی بلکہ مخالفین و اہل باطل کی تردید میں ضخیم اور متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ انھوں نے اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر بھی جو ذہبی کے بیان کے مطابق تیس اجزاء میں ہے[1] بعض مؤلفین نے امام ابو الحسن اشعری کی تصنیفات ڈھائی سو تک بیان کی ہیں[2] جن میں سے اکثر معتزلہ کے رد میں ہیں اور بعض دوسرے مذاہب اور فرقوں کی تردید میں، ان میں سے ایک کتاب الفصول ہے جس میں انھوں نے فلاسفہ، طبائعیین، دہریوں اور براہمہ، یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کا رد کیا ہے، یہ بڑی ضخیم کتاب ہے اور بارہ کتابوں کا مجموعہ ہے۔ ابن خلکان نے کتاب اللمع، الموجز، ایضاح البرہان، التبیین عن اصول الدین، الشرح والتفصیل فی الرد علی اہل الافک والتضلیل کا بھی ذکر کیا ہے۔ علوم عقلیہ و کلامیہ کے علاوہ علوم شریعت میں بھی ان کی متعدد تصنیفات ہیں جن میں سے کتاب القیاس، کتاب الاجتہاد، کتاب خبر الواحد[3] ابن الراوندی کے افکار و آراء کے رد میں بھی ایک مستقل تصنیف ہے۔ انھوں نے خود اپنی کتاب (العمد) میں ان کتابوں کے نام لکھے ہیں جو وہ ۳۲۰ھ تک یعنی وفات سے چار سال پہلے تصنیف کر چکے تھے، یہ تقریباً ۶۸ کتابیں ہیں جن میں سے متعدد کئی کئی بارہ بارہ جلدوں میں ہیں۔ زندگی کے آخری چار سال کے اندر بھی انھوں نے بکثرت تصنیفات کیں۔ مقالات الاسلامیین (ان کی مشہور کتاب ہے) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف متکلم ہی نہ تھے بلکہ علم عقائد کے ایک بلند پایہ اور ثقہ مورخ بھی تھے، انھوں نے اس کتاب میں معتزلہ اور دوسرے فرقوں کے جو اقوال و مذاہب نقل کئے ہیں ان میں بڑی احتیاط و دیانت سے کام لیا ہے اور

---

[1] تبیین کذب المفتری ص ۱۳۶ [2] [illegible] ابو الحسن کے تبیین کذب المفتری ص ۱۳۵ [3] [illegible] ص ۱۳۵

خود ان فرقوں کی کتابوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔[1]

عبادت و تقویٰ

امام ابوالحسن محض علمی و عقلی آدمی نہ تھے، بلکہ علم و عقل میں درجۂ امامت و اجتہاد کو پہنچنے کے ساتھ عبادت و تقویٰ اور اخلاق و احسان سے بھی آراستہ تھے اور یہ ائمہ سلف کی عام خصوصیت ہے۔ احمد بن علی فقیہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوالحسن کی بیس سال خدمت کی ہے، میں نے ان سے زیادہ متورع، متقی، باحیا دنیاوی معاملات میں شرمیلا اور امور آخرت میں مستعد نہیں دیکھا۔[2] ابوالحسین سروی بیان کرتے ہیں کہ امام ابوالحسن نے بیس برس عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ہے۔[3] ان کے خادم بندار بن الحسین کا بیان ہے کہ امام ابوالحسن صرف ایک جائداد پر گزر کرتے تھے، جو ان کے دادا بلال ابن ابی بردہ بن ابی موسیٰ اشعری نے وقف کی تھی، اور جس کی آمدنی سترہ درہم روزانہ تھی۔[4]

وفات

۳۲۴ھ میں امام ابوالحسن اشعری نے انتقال کیا، اور بغداد محلہ مشرع الروایا میں مدفون ہوئے،[5] ان کے جنازہ پر اعلان کیا گیا کہ آج ناصر سنت کا انتقال ہو گیا۔

امام ابو منصور ماتریدی

اسی زمانہ میں دنیائے اسلام کے ایک دوسرے سرے ماوراء النہر میں ایک دوسرے عالم اور

---

[1] مشہور مستشرق WENSINCK نے اپنی کتاب مسلم عقیدہ MUSLIM CREED میں ص ۹۳ پر اور ان کی مقالات الاسلامیین کے مقدمہ میں اس کا بجا طور پر اعتراف کیا ہے۔ [2] [illegible] [3] تبیین کذب المفتری ص ۱۴۱ [4] ایضاً

[5] ابن [illegible] و ابن [illegible] [illegible]

متکلم ابو منصور ماتریدی (م ۳۳۳ھ) نے علم کلام اور عقائد اسلام کی طرف توجہ کی۔[1] وہ بڑے [illegible] دماغ کے آدمی تھے، معتزلہ سے ہر وقت براہ راست مقابلہ ہونے کی وجہ سے امام ابوالحسن کے علم کلام میں بعض انتہا پسندانہ باتیں آگئی تھیں اور بعد کے اشاعرہ نے ان مسائل کو اور آگے بڑھا دیا، امام ابو منصور نے حشو و زوائد اور ایسے اضافات کو جو معتزلہ کی ضد میں اشعری علم کلام کا جزو بن گئے تھے اور ان کا ثابت کرنا اور نباہنا مشکل تھا، خارج کر دیا، اور اہل سنت کے علم کلام کی مزید تنقیح و تہذیب کی، اور اس کو زیادہ معتدل اور جامع بنا دیا، امام ابو منصور اور ان کے متبعین کا یہ اختلاف جزئی اور محدود تھا، ایسے مسائل جن میں ماتریدیہ نے اشاعرہ سے اختلاف کیا ہے تیس یا چالیس سے زائد نہیں، اور ان میں بھی اختلاف بیشتر لفظی ہے۔[2]

امام ابو منصور ماتریدی فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے، جس طرح شافعی علماء و متکلمین عقیدۃً و اصولاً اشعری ہیں، اسی طرح حنفی علماء و متکلمین بالعموم ماتریدی ہیں، امام ابو منصور بہت بڑے مصنف بھی تھے، معتزلہ، روافض اور قرامطہ کی تردید میں ان کی بڑی فاضلانہ تصنیفات ہیں، ان کی کتاب تاویلات القرآن اپنے موضوع پر ایک جلیل القدر تصنیف ہے، جس سے ان کی غیر معمولی قابلیت، علوم عقلیہ سے واقفیت اور اعلیٰ درجہ کی ذکاوت کا اظہار ہوتا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری نے چونکہ معتزلہ اور اعتزال کا براہ راست مقابلہ کیا تھا، اور وہ عالم اسلام کے علمی مرکز (عراق) میں تھے، جہاں معتزلہ کا بڑا زور تھا، اس لئے انھوں نے علمی حلقوں کو زیادہ متاثر کیا، اور علم کلام

---

[1] یہ زمانہ اعتزال کے خلاف ردعمل اور نئے علم کلام و عقائد کی تدوین کا خاص زمانہ تھا۔ امام ابوالحسن اشعری کے علاوہ تقریباً اسی زمانہ میں مصر میں علامہ طحاوی (م ۳۲۱ھ) اور سمرقند میں امام ابو منصور ماتریدی (م ۳۳۳ھ) پیدا ہوئے، اول الذکر نے اپنے دونوں ہم عصروں کے مقابلہ میں علم کلام میں شہرت حاصل نہیں کی اور امام ابو منصور ماتریدی کا مدرسہ فکر بھی اشعری مدرسہ میں ضم ہو کر رہ گیا۔

[2] عقائد نسفیہ کے تعلیقات میں شیخ محمد عبدہ نے ثابت کیا ہے کہ یہ مختلف فیہ مسائل [illegible] سے زائد نہیں (ابن تیمیہ از ابو زہرہ) ص [illegible]

کی تاریخ میں ان کا نام اور کام زیادہ نمایاں اور مستحق ترجیح ہے۔

اشعری حلقہ کے علماء اور ان کا علمی اثر

امام اشعری کے بعد ان کے سلسلہ اور مکتب خیال میں بڑے جلیل القدر علماء و متکلمین اور اساتذہ پیدا ہوئے جنہوں نے تمام عالم اسلام پر اپنا ذہنی تفوق اور اپنی قابلیت کا سکہ قائم کر دیا اور ان کی وجہ سے دنیائے اسلام کی علمی و ذہنی قیادت معتزلہ کے ہاتھ سے نکل کر علمائے اہل سنت کے ہاتھ میں آگئی، چوتھی صدی میں قاضی ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) اور شیخ ابو اسحاق اسفرائینی (م ۴۱۸ھ) بڑے نامور متکلم اور با عظمت عالم تھے، پانچویں صدی میں علامہ ابو اسحاق شیرازی متوفی ۴۷۶ھ اور امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک الجوینی (م ۴۷۸ھ) نے اپنے علم و فضل سے دنیا پر بادشاہت کی۔

علامہ ابو اسحاق شیرازی مدرسہ نظامیہ بغداد کے صدر مدرس تھے، خلیفہ مقتدی بامر اللہ نے ان کو ملک شاہ سلجوقی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا، وہ بغداد سے نیشاپور اس شان سے پہنچے کہ جس شہر سے گذرتے شہر کا شہر ان کے استقبال کے لئے نکل آتا، جوش عقیدت میں یہ لوگ ان کے پاؤں کے نیچے کی مٹی اٹھا لیتے، دوکاندار اپنا سامان تجارت ان پر نثار کرتے، مٹھائیوں، حلووں، قیمتی کپڑوں کی بارش کرتے، نیشاپور پہنچے تو پورا شہر استقبال کے لئے امنڈ آیا، امام الحرمین ان کا غاشیہ اپنے کاندھوں پر رکھ کر خادم کی طرح ان کے آگے چلتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے۔[1]

الپ ارسلان سلجوقی کی سلطنت اور نظام الملک کی وزارت میں سب سے بڑی اسلامی مملکت میں امام الحرمین کو سب سے بڑا دینی اعزاز حاصل تھا، وہ نیشاپور کے خطیب، سلطنت کے اسلامی اوقاف کے ناظر و نگراں اور مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرس تھے۔ ابن خلکان لکھتے ہیں:۔

---

[1] طبقات ابن سبکی ج ۳ ص ۹۰،۹

وبقي على ذلك قريباً من ثلاثين سنة	تیس سال تک وہ اس طرح رہے کہ علمی و دینی
غير مزاحم ولا مدافع مسلم له المحراب	میدان میں ان کا کوئی ہمسر اور حریف نہ نظر آ
والمنبر والخطابة والتدريس ومجلس	و منبر کی وہ زینت تھے خطابت تدریس اور وعظ
التذكير يوم الجمعة۔[1]	و تذکیر انھیں کا منصب سمجھا جاتا تھا۔

ان کے اثر و رسوخ اور علو مرتبت کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ ملک شاہ سلجوقی نے عید کے چاند کا اعلان کرا دیا، امام الحرمین کے نزدیک رویت ثابت نہیں تھی انھوں نے منادی کروا دی کہ ابوالمعالی (امام الحرمین کی کنیت) کہتے ہیں کہ کل تک رمضان ہے جو میرے فتوی پر عمل کرنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ وہ کل بھی روزہ رکھے، ملک شاہ نے بازپرس کی تو فرمایا کہ جو امور فرامین سلطانی پر موقوف ہیں ان کی اطاعت ہم پر فرض ہے اور جو حکم فتوی سے متعلق ہے وہ بادشاہ کو مجھ سے پوچھنا چاہیے کیونکہ بحکم شریعت علماء کا فتوی حکم قاضی کے برابر ہے روزہ رکھنا عید کرنا یہ امور فتوی پر موقوف ہیں بادشاہ وقت کو ان سے کوئی تعلق نہیں، چنانچہ بادشاہ نے اعلان کرا دیا کہ میرا حکم درحقیقت غلط تھا اور امام الحرمین کا حکم صحیح ہے۔[2]

ان کا انتقال ہوا تو نیشاپور کے بازار بند ہوگئے، جامع مسجد کا منبر توڑ دیا گیا، ان کے شاگرد جو چار سو کے قریب تھے سب نے دوات قلم توڑ ڈالے، لوگ ایک دوسرے سے تعزیت کرتے تھے، سال بھر ان کا غم تازہ رہا۔[3]

نظام الملک طوسی کے عہد وزارت سے (جو عقیدۃً اشعری تھا اور اپنے وقت کی سب سے بڑی اسلامی (سلجوقی) سلطنت کا نفس ناطقہ تھا) اشعریت کو بڑا فروغ ہوا اور اس کو ایک طرح کی سرکاری حمایت و تائید حاصل ہوگئی، بغداد اور نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ کے قیام نے جو اشعری

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۴۲

[2] اخلاق جلالی ص ۲۹۵، ۲۹۶

[3] ابن خلکان ج ۲ ص ۳۴۳

علماء و اساتذہ کے زیر اہتمام تھے، اشعریت کو علمی رفعت و استحکام ہوتا، مدرسہ نظامیہ بغداد عالم اسلام کا سب سے بڑا دار العلوم تھا جس کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اس میں پڑھنا اور پڑھانا علماء و طلبہ کے لئے ایک فخر کی بات تھی، اس کے اثر سے طلبہ اور عوام کا اشعری عقائد و افکار سے متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔

علم کلام کا انحطاط، فلسفہ اور باطنیت کا فروغ

اور

ایک نئے متکلم کی ضرورت

علم کلام کا انحراف و انحطاط

اس وقت اگرچہ اشعری مکتب خیال کے علماء تمام عالم اسلام اور نظام تعلیم اور مذہبی زندگی پر حاوی ہو گئے تھے، لیکن خود ان کے کلام اور اوراق کے اقتدار کو اندر سے گھن لگ گیا تھا، امام ابوالحسن اشعری کی طاقتور شخصیت و عقلیت اور مجتہدانہ دماغ نے معتزلہ کے سحر کو باطل کر دیا تھا، اور سنت و شریعت کا اقتدار از سر نو قائم کر دیا تھا، اس میں ان کے اصول و قواعد کو تنہا دخل نہ تھا، ان کی بلند ذہنی صلاحیتوں اور علمی ملکہ استدلال و اجتہاد کو بھی دخل تھا، یہ وقار ایسی ہی طاقتور شخصیتوں اور اجتہادی قابلیتوں سے قائم رہ سکتا تھا، لیکن ان کے بعد رفتہ رفتہ تقلید کے فقیر بن گئے، اور علم کلام میں بھی بجائے تجدید و اجتہاد کے نقل در نقل کا سلسلہ شروع ہو گیا، جن لوگوں نے زمانہ کی تبدیلی کا احساس کیا، اور جدت سے کام لیا، انھوں نے فلسفہ کی اصطلاحات اور فلسفیانہ طرز استدلال کو علم کلام میں داخل کر لیا، جو نہ قرآن مجید کے طریق استدلال کی طرح فطری و عام فہم اور دلکش تھا، نہ ان کے دعاوی کے ثبوت کے لئے قطعی دلائل فراہم کرتا تھا، اس میں خود قیل و قال کی بڑی گنجائش تھی، اور ہر وقت اس کا خطرہ تھا کہ اس کے مقدمات کو کمزور اور مشکوک ثابت کر دیا جائے[1]، اس طرح نہ انھوں نے اہل سنت اور مسلک سلف کی صحیح نمائندگی کی، نہ خالص فلسفہ کے

---

[1] جیسا کہ ابن تیمیہ نے اپنی بعض تصنیفات خصوصاً الرد علی المنطقیین میں کیا۔

حلقوں میں احترام و عظمت حاصل کی۔

فلسفہ کا رواج

دوسری طرف عباسیوں کی قدردانی اور دلچسپی، اور مترجمین کی محنت اور توجہ سے سریانی، یونانی اور فارسی سے یونانی فلسفہ کی کثرت سے کتابیں خصوصاً ارسطو کی تصنیفات عربی میں منتقل ہو گئی تھیں، اور وہ تیز طبیعت اور خام عقلیت مسلمانوں پر بڑا اثر ڈال رہی تھیں، اس ذخیرہ میں کچھ تو منطق، طبیعیات، علم ہیئت اور ریاضیات کی کتابیں اور علوم تھے جن کے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہ تھا، اور کچھ الٰہیات اور ما بعد الطبیعیات کے مباحث اور دفتر تھے۔ الٰہیات کا یہ ذخیرہ درحقیقت یونانیوں کا علم الاصنام اور دیومالا تھا جس کو انھوں نے بڑی چالاکی سے فلسفیانہ زبان اور علمی اصطلاحات میں منتقل کر دیا تھا، یہ مفروضات اور تخیلات کا ایک طلسم تھا جس کا کوئی ثبوت نہ تھا نہ کسی عالم میں ان کا وجود، اس میں کہیں عقول و افلاک کا شجرۂ نسب ہے، کہیں ان فرضی اور خیالی چیزوں کے افعال و حرکات کا زائچہ کھینچا گیا ہے۔ ایک ایسی امت کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی دولت سے سرفراز فرمایا تھا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنی ذات و صفات کے صحیح معرفت اور نوع انسان اور کائنات کی ابتدا و انتہا اور آغاز و انجام کا یقینی علم بخشا تھا، اس یونانی افسانہ اور طلسم ہوشربا کی طرف التفات کرنے اور اس کی تفصیلات و جزئیات پر وقت ضائع کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی، مگر چونکہ یونانیوں کے منطق و طبیعیات اور ریاضیات سے مرعوب تھے، انھوں نے الٰہیات کے اس دفتر پارینہ کو بھی صحیفہ آسمانی کی طرح قبول کر لیا اور اس کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا کہ گویا ان کے پاس پیغمبر اور آسمانی کتاب کے ذریعہ کوئی علم نہیں پہنچا تھا، وہ دیانتداری سے یونانیوں کی طرح الٰہیات و دینیات میں بھی اسی طرح بے بضاعت اور تہی دامن تھے، جیسے ریاضیات و طبیعیات میں۔

فلسفۂ یونان کے عرب ناقل و شارح

دوسری طرف فلسفۂ یونان کو یعقوب کندی (م ۲۶۰ھ) ابو النصر فارابی (م ۳۳۹ھ) اور شیخ بو علی ابن سینا (م ۴۲۸ھ) کے سے پرجوش وکیل حاصل ہوئے کہ خود یونان میں بھی ان کی نظیر ملنی مشکل ہے، انھوں نے ارسطو کو عصمت و تقدیس اور علم و حکمت کے ایسے مقام پر پہونچا دیا جو یونانی الٰہیات میں شاید مبدء اول (واجب الوجود) کو بھی حاصل نہیں، یہ بھی ایک بدقسمتی تھی کہ مسلمانوں کے حصہ میں یونان کے علمی ذخیرہ میں سے زیادہ تر ارسطو کی تصنیفات و افکار آئے جو پیغمبروں کی تعلیمات اور دین کی روح و مزاج سے زیادہ اختلاف اور کم از کم مناسبت رکھتے ہیں، پھر دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ فلاسفۂ عرب میں سے کوئی بھی ان کے اصلی ماخذوں اور ان کی اصلی زبانوں سے واقف نہیں تھا، ان کا تمام تر انحصار تراجم پر تھا، اور ان سے خود ان فلاسفہ کا منشا سمجھنے میں غلطیاں ہوئیں، پھر ان پر ارسطو کا ایسا علمی رعب اور اس کی شخصیت کا ایسا سحر غالب تھا کہ انھوں نے اس کے افکار و آراء پر نقد و جرح کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور منقولات کو بھی معقولات بنا دیا۔

جماعت اخوان الصفا اور اس کے رسائل

چوتھی صدی کے آخر میں تمام عالم اسلام پر فلسفۂ یونان کا اثر پڑ رہا تھا، ہر ذہین و حساس نوجوان اس کو شوق و عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، چوتھی صدی کے وسط ہی میں اخوان الصفا کے نام سے فری میسن کے طرز کی ایک خفیہ انجمن بغداد میں قائم ہوئی، جس میں فلسفۂ یونان کو معیار قرار دے کر دینی مباحث اور عقائد پر گفتگو ہوتی تھی اور مسائل کو طے کیا جاتا تھا، اس انجمن کا منشور ان کے الفاظ میں یہ تھا۔

ان الشریعۃ الاسلامیۃ قد تنجست　　　اسلامی شریعت جہالتوں اور گمراہیوں کی آمیزش سے

بالجہالات واختلطت بالضلالات	شریعت نجس ہوگئی اب صرف فلسفہ کے ذریعہ
ولا سبیل الی غسلہا وتطہیرہا الا بالفلسفۃ	دھویا اور پاک کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ فلسفہ
لانہا حاویۃ للحکمۃ الاعتقادیۃ والمصلحۃ	اعتقادی علوم و حکمت اور اجتہادی مصلحتوں
الاجتہادیۃ وانہ متی انتظمت الفلسفۃ	پر حاوی ہے اب صرف فلسفہ یونان اور عربیت
الیونانیۃ والشریعۃ العربیۃ فقد	کو ملا کے امتزاج سے کمال مطلوب حاصل
حصل الکمال۔[1]	ہو سکتا ہے۔

ان کی اپنے رفقاء کو خاص ہدایت تھی کہ وہ پختہ کار اور سن رسیدہ لوگوں پر وقت ضائع کرنے کے بجائے نوجوانوں اور کم عمروں کی طرف توجہ کریں اور ان کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی کوشش کریں اس لئے کہ عمر رسیدہ لوگوں میں پختگی اور جمود ہوتا ہے جو کسی چیز کو قبول کرنے سے مانع ہوتا ہے، نوجوان نئی چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔[2]

انھوں نے اس بحث و نظر کے نتیجہ میں ۵۰ رسالے مرتب کئے جو ان کے فلسفہ کی نمائندگی کرتے ہیں اور رسائل اخوان الصفا کے نام سے تاریخ و ادب میں مشہور ہیں اور طبیعیات، ریاضیات، عقلیات کے مباحث پر مشتمل ہیں معتزلہ اور ان کے ہم مذاق لوگوں نے ان رسائل کو ہاتھوں ہاتھ لیا، وہ اپنی مجلسوں میں ان کو پڑھتے تھے اور جہاں جاتے تھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر وہ اندلس پہنچ گئے۔[3]

معتزلہ و فلاسفہ کا فرق

معتزلہ نے اگرچہ دانستہ یا نادانستہ شریعت کو نقصان پہنچایا تھا اور انھوں نے عقل کی طاقت غیر محدود سمجھ کر ذات و صفات کے نازک و ماوراء العقل (اور مخالف عقل) مسائل کو بازیچۂ اطفال بنا دیا

---

[1] تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق والمغرب محمد لطفی جمعہ ص ... [2] ایضاً ص ... [3] تاریخ فلسفۃ الاسلام ص ۱۴۵

تھا، بہرحال وہ دینی ذہن کے لوگ تھے، قرآن و سنت پر ایمان رکھتے تھے اور عموماً متقشف، متقی اور مجتنب محرمات تھے، عبادت اور دینی دعوت کا ذوق رکھتے تھے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سختی کے ساتھ پابند تھے[1] اور یہ سب ان کے اصول و عقائد کا تقاضا تھا[2]، اس لیے اعتزال کے فروغ اور معتزلہ کے اقتدار سے عالم اسلام میں کفر و الحاد، انکار نبوت، انکار معاد، بے عملی اور تعطل کا رجحان پیدا نہیں ہو سکا اور مسلمانوں کا مذہبی شعور مجروح یا کمزور نہیں ہونے پایا۔

لیکن فلاسفہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا، فلسفہ نبوت سے بالکل متوازی چلتا ہے اور کہیں جا کر نہیں ملتا، وہ دین کے اصول و کلیات اور اس کے بنیادی عقائد و مسائل سے متصادم ہے، اس لیے جس قدر فلسفہ کی مقبولیت اور عظمت بڑھتی گئی، اسی قدر طبعی طور پر دین کی وقعت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت کم ہوتی گئی، اور عقائد سے لے کر اخلاق و اعمال تک اس ذہنی تبدیلی سے متاثر ہوئے، مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو دین کی تحقیر کرتا اور اسلام سے فخریہ اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتا، جو لوگ اتنی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے تھے، وہ ظاہری طور پر رسم و رواج کے پابند تھے لیکن اندر سے وہ کسی معنی میں مسلمان نہیں تھے۔

باطنیت کا فتنہ

فلسفہ کے ساتھ ساتھ اور اس کے اثر سے ایک نیا فتنہ پیدا ہوا، جو اسلام کے حق میں اور نبوت کی تعلیمات کے لیے فلسفہ سے بھی زیادہ خطرناک تھا، یہ باطنیت کا فتنہ ہے، اس کے بانی اور داعی اکثر ان قوموں کے افراد تھے جو اسلام کے مقابلہ میں اپنی سلطنتیں اور اقتدار کھو چکے تھے اور ظاہری مقابلہ اور جنگ سے ان کی بازیافت کی کوئی امید نہ تھی، یا شہوت پرست اور لذت پسند لوگ تھے اور اسلام ان کی زندگی پر

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ضحی الاسلام ج ۳ فصل اول۔

[2] ان کے نزدیک کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی مخلد فی النار ہو جاتا ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض ہے۔

محدود ہو کر رہنا گوارا تھا یا شخصی اقتدار اور سرداری کے حریص تھے۔ ان تمام مختلف مقاصد کے لوگوں کی باطنیت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے، انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اسلام کو جنگی طاقت سے شکست نہیں دے سکتے نہ مسلمانوں کو کفر و الحاد کی کھلی ہوئی دعوت دے سکتے ہیں، اس لئے کہ اس سے ان کے مذہبی احساسات بیدار ہو جائیں گے اور مقابلہ کی قوت ابھر آئے گی، انھوں نے اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

ظاہر و باطن کا مغالطہ

انھوں نے دیکھا کہ شریعت کے اصول و عقائد اور احکام و مسائل کو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور انسانوں کے سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے ایسا ضروری تھا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ. (سورۂ ابراہیم ۴)

اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان میں تاکہ لوگوں پر مطلب واضح کر سکے۔

ان الفاظ کے معنی و مفہوم متعین ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے ان کی تشریح کی اور اپنے عمل سے ان کی تعیین کر دی ہے، یہی معنی و مفہوم امت میں علمی و عملی طور پر تواتر و تسلسل سے چلے آ رہے ہیں، اور ساری امت ان کو جانتی اور مانتی ہے، نبوت و رسالت، ملائکہ، معاد، جنت، دوزخ، شریعت، فرض و واجب، حلال و حرام، صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج یہ سب وہ الفاظ ہیں جو متعین دینی حقائق کو بیان کرتے ہیں اور جس طرح یہ دینی حقائق محفوظ چلے آ رہے ہیں، اسی طرح ان دینی حقائق کو ادا کرنے والے یہ الفاظ بھی محفوظ چلے آ رہے ہیں، اور اب دونوں لازم و ملزوم بن گئے ہیں۔

جب نبوت و رسالت یا نبی، صلوٰۃ یا زکوٰۃ کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے معنی کی وہی متعین صورت سمجھ میں آئے گی اور ذہن میں وہی شکل سامنے آئے گی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی اور صحابہ کرام نے اس کو سمجھا، اس پر عمل کیا اور اس کو دوسروں تک پہنچایا اور اسی طرح نسلاً بعد نسل وہ بتواتر امت تک

منتقل ہوتا رہا، انھوں نے اپنی دعوت سے اس [illegible] امت کی [illegible] اور اسلام کے فکری و عملی نظام کی بنیاد ہے اور وہی امت کی وحدت اور اپنے مرکز اور اپنے ماضی سے اس کا رابطہ قائم ہے، اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور دینی الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم و معانی متعین نہ رہیں یا مشکوک ہو جائیں تو یہ امت ہر دعوت اور ہر فلسفہ کا شکار ہو سکتی ہے، وہ اس کے منتشر نظام میں سیکڑوں چور دروازے اور اس کی مضبوط دیواروں میں ہزاروں شگاف پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس مقصد کو پانے کے بعد انھوں نے اپنا سارا زور اس تبلیغ پر صرف کیا کہ ہر لفظ کے ایک ظاہری معنی ہوتے ہیں اور ایک حقیقی و باطنی، اسی طرح قرآن و حدیث کے کچھ ظواہر ہیں اور کچھ حقائق، ان حقائق سے ان ظواہر کو وہی نسبت ہے جو گودے اور مغز سے چھلکے اور پوست کو ہے، جہلاء صرف ان ظواہر کو جانتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں پوست ہی پوست ہے، عقلاء و حقائق کے عالم ہیں اور ان کے حصہ میں مغز آیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ الفاظ دراصل حقائق کے رموز و اشارات ہیں، ان سے وہ مراد نہیں جو عوام سمجھے اور نقل کرتے ہیں، ان سے مراد کچھ اور چیزیں ہیں جن کا علم صرف اہل اسرار کو ہے اور انھیں سے دوسروں کو حاصل ہو سکتا ہے، جو ان حقائق تک نہیں پہنچا اور ظواہر میں گرفتار ہے وہ ظاہری بیڑیوں اور شریعت کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے اور نہایت نیچی سطح پر ہے، جو حقائق و رموز کی بلند سطح تک پہنچ جاتا ہے اس کی گردن سے یہ طوق و سلاسل اتر جاتے ہیں اور وہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے، یہی اس آیت کا مفہوم ہے:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف ۱۵۷) میں ان چند رسمی تکالیف کا جن میں گرفتار تھے۔

جب یہ اصول تسلیم کر لیا گیا اور حقائق و ظواہر کے اس فلسفہ کو قبول کر لیا گیا تو انھوں نے نبی، وحی، نبوت، ملائکہ، آخرت اور اصطلاحات شرعیہ کی من مانی تشریح کرنی شروع کر دی جس کے بعض نمونے یہ ہیں:

> نبی اس ذات کا نام ہے جس پر قوت قدسیہ صافیہ کا فیضان ہو، جبرئیل کسی ہستی کا نام نہیں، صرف فیضان کا نام ہے، معاد سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف واپس جانا ہے، جنابت سے مراد افشائے راز ہے، غسل سے مراد تجدید عہد، زنا سے مراد علم باطن کے نطفہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا جو عہد میں شریک نہ ہو، طہارت سے مراد مذہب باطنیہ کے علاوہ ہر مذہب سے برأت، تیمم سے مراد ماذون (اجازت یافتہ) سے علم کا حصول، صلوٰۃ سے مراد امام وقت کی طرف دعوت، زکوٰۃ سے مراد اہل استعداد و صفا میں اشاعت علم، صیام (روزہ) سے مراد افشائے راز سے پرہیز و احتیاط، حج سے مراد اس علم کی طلب جو عقل کا قبلہ اور منزل مقصود ہے، جنت علم باطن، جہنم علم ظاہر، کعبہ خود نبی کی ذات ہے، باب کعبہ سے مراد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات، قرآن مجید میں طوفان نوح سے مراد علم کا طوفان ہے جس میں اہل شبہات غرق کر دیئے گئے، آتش نمرود سے مراد نمرود کا غصہ ہے نہ کہ حقیقی آگ، ذبح سے مراد جس کا ابراہیم کو حکم دیا گیا تھا، بیٹے سے عہد لینا، یاجوج ماجوج سے مراد اہل ظاہر، عصائے موسیٰ سے مراد ان کی دلیل اور حجت ہے وغیرہ وغیرہ۔

نبوت محمدی کے خلاف بغاوت

الفاظ شرعی کے متواتر و متوارث معنی و مفہوم کا انکار اور قرآن و حدیث کے ظاہر و باطن اور مغز و پوست کی تقسیم ایسا کامیاب حربہ تھا جس سے اسلام کے نظام اعتقاد و نظام فکر کے خلاف سازش

(ملخص از قواعد عقائد آل محمد الباطنیہ تالیف محمد بن الحسن الدیلمی یمانی المتوفی سنہ ۷۱۱ھ صفحہ ۱۲)

کرنے والوں نے ہر زمانہ میں کام لیا، اسلام کی پوری عمارت کو اس طرح آسانی سے ملیامیٹ کیا جا سکتا تھا اور اسلام کے ظاہری خول کے اندر ریاست اندر ریاست قائم کی جا سکتی تھی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں جتنے فرقے بنے اور منافقین کی جس جماعت نے نبوت محمدی کے خلاف بغاوت کرنی چاہی اس نے باطنیت کے اسی حربے سے کام لیا اور اسی معنوی تواتر و توارث کا انکار کر کے پورے نظام اسلامی کو مشکوک و مجروح بنا دیا اور اپنے لئے دینی سیادت بلکہ نئی نبوت کا دروازہ کھول لیا۔ ایران کی بہائیت اور ہندوستان کی قادیانیت اسی کی بہترین مثالیں ہیں۔ [له]

[له] قادیانیوں نے بھی باطنیوں کی طرح الفاظ کو قائم رکھتے ہوئے ان کا نیا مفہوم بیان کیا ہے اور معنوی تواتر و توارث کا انکار کیا، کیونکہ ختم نبوت، مسیح و نزول مسیح، معجزات، وحی وغیرہ سب الفاظ وہی ہیں مگر ان کی تشریح و تعبیر میں باطنیوں کی طرح اختراع و ایجاد سے کام لیا ہے مرزا صاحب کی کتابیں اور مولوی محمد علی کی تفسیر ان کی مثالوں سے بھری ہوئی ہیں۔

بہائیوں نے بالکل نئی شریعت وضع کی ہے جس کے بعض اصول دینی یہ ہیں مثلاً سال میں ایک مہینہ ۱۹ دن کا ہے جس کے روزے ہوں گے، روزہ کی ابتداء صبح صادق کے بجائے طلوع آفتاب سے ہے ۱۱ سال سے ۴۲ سال تک انسان احکام شرعیہ کا مکلف ہے، جب وہ چند آیات اللہ جانی میں پڑھے وضو فرض نہیں ہے کسی مقام پر نماز پڑھ لے، کوئی پردہ نہیں، جس گھر میں بابی مذہب کے باب کی ولادت ہوئی ہے اس کی زیارت واجب ہے، زیارت کی نذر صرف عکہ میں مشروع ہے، ۱۹ دن کے بعد کوئی چیز نجس نہیں رہتی، مذہب بابی کی پیروی سے آدمی طاہر ہو جاتا ہے، پھر کوئی گندگی نجس نہیں ہوتا۔ بلکہ جس چیز پر اس کا ہاتھ لگ جاتا ہے وہ بھی طاہر ہو جاتی ہے یا اپنی جنس سے طاہر رہتا ہے، بہائیوں کا قانون میراث بھی عجیب ہے۔ احکام اسلامی کو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں پروفیسر براؤن نے اپنے مقالہ (بابیت) میں صحیح لکھا ہے کہ باب نے اسلام میں اصلاح کے نام سے ایک نئے دین کی تشکیل کی ہے جس کے عقائد، اصول بنیادی اور اس کے ضروری مسائل اور حیثیت اجتماعی کی نشو و نما کو پیش کیا ہے یہی صورت حال قادیانیت کی ہے وہ در حقیقت ایک نئی نبوت اور ایک نئے نظام دینی کا اعلان ہے، در حقیقت یہ سب باطنیت کی صدائے بازگشت ہے۔

تھا جب زمانہ کا رنگ ان تحریکوں کو ذہنی و دینی حیثیت سے [illegible] مسلم باطنیت اور قبول

نہیں رہا تھا کہ اتنی یقین کا جوہر [illegible] ایسا ایمانی اضمحلال پیدا کر دیا تھا اور فلسفہ

کے اثر سے لوگوں میں جو شبہات اور بعض مسلمانوں کا خود اس کے اندر کوئی عقیدہ یا ایسا مذاق پیدا ہو گیا

تھا کہ ایک طبقہ پر باطنیوں کا جادو چل گیا، انہوں نے تمام علوم ہیئت، علم طبیعیات اور یونانی الٰہیات کے

مسائل اور یونانی اصطلاحات عقل یا ارواح [illegible] مختلف الخیال [illegible] وہ مختلف اثرات اور مختلف

اغراض سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے [illegible] معتقد [illegible] اسرار و رموز کے شوق میں کچھ غلط قسم کی تاویلات

اور تقشف کے رد عمل میں کچھ ہوا پرستی اور نفس پرستی کی آزادی کے لالچ میں [illegible] ان کا حلقہ

باطنیوں نے ایسی منظم تحریک قائم کر لی تھی جس سے خائف ہو کر اسلامی سلطنتیں [illegible] تک پریشان رہیں اسلام

کی بعض نامور ترین اور مفید ترین شخصیتیں جیسے نظام الملک طوسی، فخر الملک وغیرہ ان کا نشانہ بن کر رہ

چکے تھے، کسی بڑے حاکم اور سلطان و بادشاہ و وزیر کو اطمینان نہیں تھا کہ وہ کسی وقت بھی سلامت رہ سکے گا

بڑے بڑے لکھے پڑھے فرمانرواؤں میں اگر کوئی شخص ان کے خلاف [illegible] تو سمجھا جاتا کہ اب وہ کسی

باطنی کا شکار ہو گیا، اس بدامنی کے علاوہ باطنیوں نے ذہنی و ادبی اور علمی حیثیت سے [illegible] اور

دین کے اصول و نصوص اور تعلیمات کی تاویل و تحریف کا ایک لامتناہی دروازہ کھول دیا۔

ایک نئی شخصیت کی ضرورت

فلسفہ اور باطنیت کے ان اہم و نازک اثرات کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جس کو علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں پوری بصیرت اور درجہ کمال حاصل ہو اور وہ تمام علوم میں مجتہدانہ نظر اور ذہن خود تمام رکھتا ہو جو [illegible] طبع اور قلب [illegible] نظر [illegible] فلسفہ و یونان اور باطنیت سے

۱؎ باطنیوں کی [illegible] [illegible] ص ۱۹۳۲

قدیم یا مروجہ فکر سے کرتا ہو، جو بہت سے علوم کو نئے طریقے سے مدون کرنے کی قابلیت رکھتا ہو، جو وفور علم اور وسعت نظر کے ساتھ دولت یقین سے بھی مالا مال ہو، اور جس نے اپنے ذاتی تفکر، تلاش و تحقیق اور ریاضت و عبادت سے دین کے ان ابدی حقائق پر یقین پایا ہو اور عمل کیا ہو، وہ شک و اضطراب کی جگہ یقین کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت دین کی پیروی اور رسولؐ کی اقتداء کی طرف دعوت دیتا ہو، نیز عالم اسلامی اور علمی دنیا میں اپنے علم و یقین اور فکر و نظر سے ایک نئی روح اور زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کر دے۔ پانچویں صدی کے نصف وسط میں اسلام کو ایسی شخصیت عطا ہوئی جس کی عالم اسلام کو سخت ضرورت تھی، یہ شخصیت امام غزالی کی تھی۔

امام غزالیؒ

تعلیم اور علمی عروج

امام غزالیؒ کا نام محمد کنیت ابو حامد والد کا نام بھی محمد تھا طوس کے ضلع میں ۴۵۰ھ میں طاہران میں پیدا ہوئے۔ والد کی وصیت کے مطابق جو ایک مخلص علم دوست اور غریب مسلمان تھے ان کے ایک صوفی دوست نے تعلیم کا انتظام کرنے سے معذرت کی اور کسی مدرسہ میں داخل ہو جانے کا مشورہ دیا چنانچہ وہ ایک مدرسہ میں داخل ہو کر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔

امام غزالیؒ نے اپنے وطن میں شیخ احمد الراذکانی سے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی پھر جرجان میں امام ابو نصر اسماعیلی سے پڑھا۔ اس کے بعد نیشاپور جا کر امام الحرمین کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے رفقاء میں جو ۴۰۰ کی تعداد میں تھے ممتاز ہو گئے اور اپنے نامور استاد کے نائب (معید) بن گئے۔ امام الحرمین ان کی تعریف میں فرماتے تھے کہ غزالیؒ بحر زخار ہے۔ امام الحرمین کے انتقال کے بعد نیشاپور سے نکلے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۸ سال کی تھی لیکن بڑے بڑے کبیر السن علماء سے وہ زیادہ ممتاز اور باکمال سمجھے جاتے تھے۔

درس و تدریس سے فارغ ہونے کے بعد امام غزالیؒ نظام الملک کے دربار میں پہنچے۔ نظام الملک نے ان کی شہرت اور ممتاز قابلیت کی بنا پر بڑے اعزاز و اکرام سے دربار میں جگہ دی۔ یہاں اہل کمال کا مجمع رہتا تھا۔ علمی مباحثے اور دینی مناظرے درباروں اور مجلسوں یہاں تک کہ تقریبات شادی و غمی کا ایک ضروری عنصر تھے۔

امام غزالیؒ ان مباحث میں سب پر غالب رہتے تھے، ان کی نمایاں قابلیت دیکھ کر نظام الملک نے ان کو مدرسۂ نظامیہ کی صدارت کے لئے انتخاب کیا، جو اس وقت ایک عالم کے لئے سب سے بڑا اعزاز اور منتہائے ترقی تھا، اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال سے زیادہ نہ تھی، ۴۸۴ھ میں وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ بغداد میں داخل ہوئے اور نظامیہ میں درس شروع کیا، تھوڑے ہی دنوں میں ان کے درس، حسن تقریر اور تبحر علمی کی بغداد میں دھوم مچ گئی، طلبہ و علماء نے استفادہ کے لئے ہر طرف سے ہجوم کیا، ان کی مجلس درس مرجع خلائق بن گئی، تین تین سو منتہی طالب علم اور سو سو امراء و رؤساء اس میں شرکت کرتے تھے، رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی علمی ذاتی فضیلت اور طاقتور شخصیت سے بغداد میں ایسا اثر اور رسوخ پیدا کرلیا کہ ارکان سلطنت کے ہمسر بن گئے اور بقول ایک معاصر (شیخ عبدالغافر فارسی) کے ان کے جاہ و جلال کے سامنے امراء و وزراء اور خود بارگاہ خلافت کی شان و شوکت بھی ماند پڑگئی، یہاں تک کہ ۴۸۷ھ میں ان کو خلیفہ عباسی المقتدی باللہ نے ملک شاہ سلجوقی کی بیگم ترکان خاتون کے پاس (جو اس وقت سلطنت کی مالک تھی) اپنا سفیر بنا کر بھیجا، خلیفہ مستظہر جو مقتدی باللہ کا جانشین تھا، امام سے خاص ربط و ارادت رکھتا تھا، اسی کی فرمائش سے امام غزالیؒ نے باطنیہ کے رد میں کتاب لکھی اور اس کا نام خلیفہ کی نسبت سے مستظہری رکھا۔

گیارہ سال کی رہ نوردی اور اس کے تجربات

اس انتہائی عروج کا جو کسی علمی و دینی شخصیت کو حاصل ہو سکتا ہے تقاضا تھا کہ امام غزالیؒ اسی پر قناعت کریں اور اسی کے دائرہ کے اندر پوری زندگی گزار دیں جیسا کہ ان کے بعض اساتذہ نے کیا اور لوگ عموماً کیا کرتے ہیں، مگر ان کی بے چین طبیعت اور بلند حوصلہ طائر ہمت اس بلندی پر راضی نہ تھا اور یہ دراصل اسی بلند ہمتی نے ان کو امام اور حجۃ الاسلام بنا دیا، دنیا میں جاہ و اعزاز کی قربانی اور مقصد کی دھن اور یکسوئی

---

[۱] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۴ ص ۱۰۳

کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ امام غزالی نے خود ان حالات و اسباب کو بیان کیا ہے جنھوں نے ان کو اس اقدام کا اٹھانے پر آمادہ کیا اور ان کو تعلیم و تدریس کے کام کا نہیں رکھا یہاں تک کہ وہ اقلیم علم کی بادشاہی چھوڑ کر یقینی علم اور معرفت باطن کی تلاش میں نکل گئے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر لوٹے۔ المنقذ من الضلال میں وہ لکھتے ہیں:۔

۔ عنفوان شباب سے میری طبیعت مذہبات و معقولات کی تہ پانا فطرت تھی، ہر فرقہ و جماعت کے ملنے اور اس کے عقائد و خیالات معلوم کرنے کا شوق تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقلید کی بندش ٹوٹ گئی جو عقائد بچپن سے ذہن میں جمے ہوئے تھے وہ متزلزل ہو گئے، میں نے خیال کیا کہ عیسائی اور یہودی کے بچے بھی اپنے عقائد پر پرورش پاتے ہیں۔ یقینی علم وہ ہے کہ کسی قسم کے شبہ کا احتمال نہ رہے مثلاً مجھے اس بات کا یقین ہے کہ دس کا عدد تین سے زیادہ ہے اگر کوئی شخص کہے کہ نہیں بلکہ تین زیادہ ہے اور میرے دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ میں لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں اور وہ بنا کر دکھا بھی دے تب بھی مجھے اپنے علم میں کوئی شک نہیں ہوگا، مجھے اس پر تعجب ضرور ہوگا لیکن پھر بھی میرا یقین باقی رہے گا کہ دس تین سے زائد ہے، میں نے غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کا یقینی علم صرف حسیات اور بدیہیات کے دائرہ میں ہے لیکن جب زیادہ کد و کاوش سے کام لیا تو معلوم ہوا کہ ان پر بھی شک کی گنجائش ہے، میں نے دیکھا کہ حواس میں سب سے زیادہ قوی حاسہ بصارت کا ہے لیکن وہ بھی غلطی کرتی ہے، میرا شک یہاں تک بڑھا کہ مجھے محسوسات کے یقینی ہونے کا اطمینان نہیں رہا، پھر میں نے عقلیات پر غور کیا تو وہ مجھے حسیات سے بھی زیادہ مشکوک [illegible] نظر آئے تقریباً دو مہینے تک یہی کیفیت رہی اور میں مسلک سفسطہ کا قائل رہا، بالآخر اللہ نے مجھے اس بیماری سے شفا دی اور طبیعت پھر سے اعتدال پر آگئی اور بدیہیات عقلی پر طبیعت پھر جم گئی لیکن یہ اعتدال و ترتیب دلائل کی بنا پر نہیں بلکہ ایک [illegible] اور یہی بات تھی اس وقت سے متلاشیان حق کے مختلف طبقات نظر آئے جو سب حق کے طالب معلوم ہوتے تھے متکلمین، باطنیہ، فلاسفہ

کے مشتاق تھے۔ باطنیہ کا دعویٰ تھا کہ ان کے پاس ایسا علم ہے جو عام انسانوں کے پاس نہیں، اور انھوں نے یہ علم امام معصوم سے براہ راست حاصل کیا ہے، اس لئے سب کو ان کا تابع ہو کر ان کی ہر بات بغیر دلیل مان لینا لازم ہے۔ صوفیہ جو اپنے کو صاحب کشف و شہود کہتے ہیں۔ میں نے ہر ایک گروہ کی کتابوں اور خیالات کا مطالعہ کیا تو کسی سے بھی مطمئن نہیں ہوا۔ علم کلام کے متعلق اس فن کے ائمہ کی تصنیفات پڑھیں اور خود بھی اسی موضوع پر تصنیفات کیں۔ میں نے دیکھا کہ اگرچہ یہ فن اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے لیکن میری تسکین کے لئے وہ کافی نہیں کیونکہ اس میں ایسے مقدمات پر بنا رکھی جاتی ہے جو فریق مقابل نے تسلیم کئے ہوئے ہیں اور متکلمین نے ان کو محض تقلیداً تسلیم کر لیا ہے یا اجماع یا قرآن و حدیث کے نصوص ہیں اور یہ چیزیں اس شخص کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کارآمد نہیں جو بدیہیات کے سوا کچھ بھی تسلیم نہ کرتا ہو۔ فلسفہ کی نسبت رائے قائم کرنے سے پہلے میں نے اس کا تفصیلی مطالعہ ضروری سمجھا، اگرچہ مجھے تصنیف و تدریس کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی تھی، میرے حلقۂ درس میں بغداد میں تین سو طالب علم ہوتے تھے، پھر بھی میں نے اس کے لئے وقت نکالا اور دو سال کے مختصر زمانہ میں ان کے تمام علوم کا مطالعہ کر ڈالا، پھر تقریباً ایک سال تک اس پر غور و فکر کرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے علوم جو چھ قسم کے ہیں ریاضیات، منطقیات، طبیعیات، سیاسیات، اخلاقیات اور الٰہیات۔ ریاضیات یا منطقیات کو براہ راست مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور نہ مذہب کے اثبات کے لئے ان کا انکار ضروری ہے۔ طبیعیات میں ان کے بعض نظریات کا تسلیم کرنا مذہب کے خلاف ہوتا ہے، مگر وہ چند چیزیں ہیں۔ اس سلسلہ میں اصول یہ سمجھ رکھنا چاہئے کہ طبیعت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ خود کچھ نہیں کرتی۔ بعض لوگ جب ان علوم و فنون میں ان فلاسفہ کی ذہانت اور باریک بینی دیکھتے ہیں تو وہ ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تمام علوم میں ان کو یہی شان حاصل ہوگی حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص ایک فن میں ماہر ہو وہ ہر فن میں ماہر ہو۔ جب ان کی ذہانت اور ان کے کمال کو دیکھتے ہیں تو محض تقلیداً وہ بھی دین کا انکار کرنے لگتے ہیں۔

[illegible] اور

اسلام کی نعمت سمجھتے ہیں [illegible] جماعت کے [illegible]

[illegible] کے قائل [illegible]

ان کے [illegible] اور [illegible]

[illegible]

[illegible] حقیقت

انھوں نے [illegible]

[illegible] تمام

[illegible] تمام [illegible] کا [illegible]

پہچان [illegible] کی طرح [illegible]

میں نے دیکھا [illegible] امام وقت [illegible] امام وقت کا [illegible] اور

اس کی صداقت [illegible] دلیل ہے اور [illegible] حضرت [illegible]

میں [illegible] تصنیف کی [illegible] علم [illegible]

ابوطالب کی [illegible] اور [illegible] حضرت علی [illegible]

کے ملفوظات پڑھے اور علم [illegible] حاصل [illegible] میں نے حاصل کر لیا [illegible] علم

ہوا کہ اصل حقائق [illegible] کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ذوق و حال [illegible]

ہے جو [illegible] میرا سرمایہ [illegible]

[illegible] حاصل ہو سکا [illegible]

جا رہی [illegible] تفصیل مشکل ہے [illegible]

صرف یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے، نفس کو اس کی خواہشات سے روکا جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ دارِ فانی سے بے رغبتی، آخرت کی طرف میلان کی کوشش اور پوری یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ کے ذریعہ قلب کا علاقہ دنیا سے ٹوٹ جائے، لیکن یہ جاہ و مال سے اعراض اور موانع و علائق سے فرار کے بغیر ممکن نہیں، میں نے اپنے حالات پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سرتاپا علائق دنیوی میں غرق ہوں، میرا سب سے افضل عمل تدریس و تعلیم کا معلوم ہوتا تھا، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ میری تمام تر توجہ ان علوم پر ہے جو زیادہ اہم نہیں اور نہ آخرت کے سلسلہ میں کچھ نفع پہنچانے والے ہیں، میں نے اپنی تدریس کی نیت کو دیکھا تو وہ بھی خالص لوجہ اللہ نہیں تھی، بلکہ اس کا باعث و محرک بھی محض طلب جاہ و حصول شہرت تھا، تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہلاکت کے غار کے کنارے کھڑا ہوا ہوں، اگر میں نے اصلاح حال کی کوشش نہ کی تو میرے لئے سخت خطرہ ہے، میں ایک عرصہ تک اس سب کو چھوڑنے اور بغداد سے نکل جانے کا ارادہ کرتا رہا، لیکن اس کا فیصلہ نہ کر سکا، کچھ دن اسی کشمکش میں گذر گئے، کبھی تو دنیاوی خواہشات کشش کرتیں اور کبھی ایمان کا منادی پکارتا کہ کوچ قریب ہے، عمر تھوڑی باقی ہے، طویل سفر درپیش ہے اور یہ سب علم و عمل محض ریا و تخیلات ہیں، کبھی نفس کہتا کہ یہ عارضی حالت ہے، اگر تم نے جو کچھ جاہ و عزت حاصل کی ہے چھوڑنے کے بعد اگر پھر واپس آنے کا خیال ہوا تو اس کا دوبارہ حصول مشکل ہے، غرض اسی کشمکش میں چھ مہینے گذر گئے، یہاں تک کہ اب معاملہ بس سے باہر ہو گیا، زبان بالکل رک گئی جیسے اس میں تالا لگ گیا ہو، میں کوشش کرتا تھا کہ آنے جانے والوں کی خوشی کے لئے ایک روز درس دوں لیکن زبان بالکل ساتھ نہیں دیتی تھی اور ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا، زبان کی بندش سے قلب میں ایک رنج و غم کی کیفیت پیدا ہوئی جس کے اثر سے قوت ہاضمہ نے بالکل جواب دے دیا، کھانے پینے کی خواہش بالکل جاتی رہی، یہاں تک کہ ایک گھونٹ پانی اور کھانے کے ایک لقمہ کا ہضم کرنا بھی میرے لئے دشوار ہو گیا، رفتہ رفتہ تمام قوائے جسمانی پر ضعف کا غلبہ ہوا، یہاں تک کہ اطباء نے علاج سے ہاتھ اٹھا لیا اور کہا کہ قلب پر

گھلنا اثر ہے اور اس سے مزاج ناساز ہو گیا ہے جب تک قلب پر اثر نہ جائے اس وقت تک علاج کچھ سود مند نہیں۔ جب میں نے دیکھا تو میں اس معاملہ میں بالکل بے بس ہوں تو میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور اضطراری کیفیت کے ساتھ اس سے دعا کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جاہ و مال اور اہل و عیال کا چھوڑ دینا مجھے آسان معلوم ہونے لگا۔ میں نے مکہ کا قصد ظاہر کیا اور میرے دل میں یہ تھا کہ میں شام کا سفر کروں گا اور بڑے لطائف الحیل سے میں نے بغداد سے نکلنے کا سامان کیا اہل عراق کو جب میرا قصد معلوم ہوا تو انھوں نے چاروں طرف سے مجھے ملامت کرنی شروع کی اس لئے کہ کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس ترک و انقطاع کا کوئی دینی سبب بھی ہو سکتا ہے اس لئے کہ ان کے خیال میں مجھے دین کا بلند ترین منصب حاصل تھا "ذٰلِکَ مَبْلَغُھُمْ مِّنَ الْعِلْمِ" پھر لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع کیں، جو لوگ حکومت سے دور تھے انھوں نے خیال کیا کہ اس میں کچھ حکام کا اشارہ ہے اور ان کے ایماء سے یہ خدمت ترک کی جا رہی ہے، لیکن جن لوگوں کا حکومتی حلقوں سے تعلق تھا وہ دیکھتے تھے کہ اہل حکومت کو کس قدر میرے قیام پر اصرار ہے اور ان کو کیسی شدید خواہش ہے کہ میں اپنے کام میں مشغول رہوں، وہ یہ کہتے تھے کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی اس رونق اور علمی چہل پہل کو کسی کی نظر لگ گئی ہے کہ یہ شخص سب چھوڑ چھاڑ کر جا رہا ہے، غرض میں نے بغداد کو الوداع کہا اور جو کچھ میرے پاس مال و متاع تھا اس میں سے بقدر کفاف رکھ کر سب بانٹ دیا، بغداد سے میں شام آیا اور وہاں دو سال کے قریب رہا، وہاں میرا کام عزلت و خلوت اور مجاہدے کے سوا کچھ نہ تھا میں نے علم تصوف سے جو کچھ حاصل کیا تھا اس کے مطابق نفس کے تزکیہ اخلاق کی درستی و تہذیب اور ذکر الٰہی کے لئے قلب کو مصفا کرنے میں مشغول رہا، میں مدت تک دمشق کی جامع مسجد میں معتکف رہا، مسجد کے منارے پر چڑھ جاتا اور تمام دن دروازہ بند کئے وہیں بیٹھا رہتا۔ دمشق سے میں بیت المقدس آیا وہاں بھی روزانہ صخرہ کے اندر چلا جاتا اور دروازہ بند کر لیتا۔ سیدنا ابراہیم کی

زیارت کے بعد میری طبیعت میں حج و زیارت کا شوق اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے برکات سے استفادہ کا خیال ہوا، چنانچہ میں حجاز گیا، حج کرنے کے بعد اہل و عیال کی کشش اور بچوں کی دعاؤں نے مجھے وطن پہنچایا حالانکہ میں وطن کے نام سے کوسوں بھاگتا تھا، وہاں بھی میں خلوت پسندی کا اہتمام رکھا اور قلب کی صفائی سے غافل نہیں ہوا، لیکن حوادث و واقعات، اہل و عیال کے افکار اور معاشی ضروریات طبیعت میں انتشار پیدا کرتے تھے، مقصد میں بھی اور سکون قلب مسلسل نہیں رہتا تھا، لیکن پھر بھی اس سے مایوس نہیں ہوتا تھا، وقتاً فوقتاً اس سے لطف یاب ہوتا رہتا تھا، دس برس اسی حالت میں گزر گئے، ان تنہائیوں میں مجھ پر جو انکشافات ہوئے اور جو کچھ مجھے حاصل ہوا اس کی تفصیل اور اس کا استقصاء تو ممکن نہیں، لیکن ناظرین کے نفع کے لئے اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ صوفیا ہی اللہ کے راستے کے سالک ہیں، ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں، اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں، ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کی جائے"۔

خلوت سے جلوت کی طرف

ممکن تھا کہ امام غزالیؒ اسی خلوت و عزلت کی حالت میں رہ جاتے اور بقیہ عمر بھی روحانی لذت اور یکسوئی کے سکون و اطمینان میں گزار دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان سے جو عظیم الشان کام لینا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس خلوت سے نکلیں اور درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور اجتماعی زندگی اختیار کریں، تاکہ خلائق کو نفع ہو، اور فلسفہ کی تردید اور عقلی و علمی طور پر اسلام کی برتری اور صداقت ثابت کرنے کے لئے خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یقین و مشاہدہ کے مقام تک پہنچا دیا تھا۔ عالم اسلام

میں ان سے زیادہ کوئی موزوں شخصیت نہیں تھی، چونکہ یہ کام خدا کو منظور تھا، اور اسلام کو اس کی سخت ضرورت تھی، اس لئے خود ان کی طبیعت میں اس کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوا، اور ان پر اس چیز کا غلبہ ہوا کہ یہی عزیمت کا کام اور انبیاء علیہم السلام کی نیابت اور وقت کا فریضہ اور افضل عبادت ہے، اپنے ان احساسات کو وہ خود بیان کرتے ہیں اور خلوت سے جلوت میں آنے کا سبب تحریر کرتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ فلسفہ کے اثرات بہت گہرے ہو گئے ہیں، ان عصروں کی گمراہی بہت سے علماء تک پہنچ گئی اور متکلمین کی غلطی اور کج روی، خامیوں کی وجہ سے اکثر طبقات کا ایمان متزلزل ہو چکا ہے اور عقائد پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے، بہت سے فلسفہ زدہ لوگ ظاہری احکام کے پابند تو ہیں لیکن نبوت اور دین کی حقیقت پر ان کا ایمان نہیں ہے، بعض لوگ محض جاہلی رسم و رواج کے خیال سے نماز پڑھتے ہیں، بعض محض سوسائٹی اور شہری عادت کی پیروی کا اور اپنی حفاظت کے لئے بعض احکام شرعی کی پابندی کرتے ہیں اور ان کے ترک کرنے کے دنیاوی نقصانات سمجھتے ہیں اور اگر ان نقصانات سے بچا جا سکے تو ان کے ارتکاب میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، میں نے دیکھا کہ میں ان شبہات کے دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اور آسانی سے اس پر تیار رہوں، یہاں تک کہ ان لوگوں کی یہ دوری مجھے اپنے مطالعہ اور ان کے علوم سے گہری واقفیت کی وجہ سے پانی پینے سے بھی زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے، یہ دیکھ کر میرے دل میں شدت سے خیال پیدا ہوا کہ مجھے یہی کام کرنا چاہئے، وہی وقت کا فریضہ ہے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ تجھے یہ خوف و خطر کب جانے دے گا، مرض پھیل گیا ہے اور طبیب خود بیمار ہیں، امت کی کشتی ہلاکت کے کنارے پہنچ گئی ہے، پھر میں نے کہا کہ یہ عظیم الشان کام تم سے کیسے انجام پا سکے گا جو نبوت سے بہت بعید ہو گیا ہے، باطل کا ہر طرف دور دورہ ہے، اگر تم نے محض خدا کے ان کا محبوب بنانے کی چیز کو سمجھانے کی کوشش کی تو زمانہ تمہارا مخالف ہو جائے گا، تم تنہا کیسے ان کا مقابلہ کر سکو گے، تو تمہیں زندگی دو بھر ہو جائے گی، یہ تو جب ممکن تھا کہ زمانہ مساعد ہوتا، اور سلطان وقت دین دار اور صاحب اقتدار

ہوتا میں نے یہ دیکھ کر اپنے دل کو سمجھا لیا اور اپنے لئے عزلت و خلوت کی زندگی کو جائز قرار دے لیا لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا اس نے سلطان وقت کے دل میں خود بخود تحریک پیدا کر دی اس نے مجھے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے نیشاپور پہونچنے کا تاکیدی حکم دیا۔ یہ حکم سلطانی کچھ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کی تعمیل نہ کی تو ناراضی تک نوبت پہونچے گی میں نے خیال کیا کہ اب میرے لئے عذر باقی نہیں رہا اب میری گوشہ نشینی اور خلوت پسندی محض سستی اور راحت طلبی اور تن آسانی کے لئے ہوگی اور آزار و اذیت اور تکالیف سے گریز ہوگی حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

الٓمّٓ ۝ أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ۝ تیرے رسول کریم سے جو اس کے بندوں میں سب سے معزز و مکرم تھے اس کا ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبَإِ الْمُرْسَلِينَ ۝

میں نے چند اہل قلوب اور اہل مشاہدات سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا انھوں نے بھی بالاتفاق مجھے ترک عزلت کا مشورہ دیا اس کی تائید میں بہت سے صلحاء نے متواتر خواب بھی دیکھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ میرا یہ اقدام بڑی خیر و برکت کا باعث ہوگا اور پانچویں صدی کے شروع ہونے میں ایک ہی مہینہ باقی تھا کوئی نہ کوئی عظیم الشان تجدید کا کام ہوگا اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے آدمی کو پیدا کرتا ہے جو اس امت کے دین کو تازہ کر دیتا ہے ان سب آثار و قرائن سے مجھے بھی اس کی امید پیدا ہوئی اللہ تعالیٰ نے میرے لئے نیشاپور کا سفر میسر کر دیا اور میں نے اس کار عظیم کا ارادہ کر لیا۔ ۴۹۹ھ کے ماہ ذیقعدہ کا قصہ ہے بغداد سے ذیقعدہ ۴۸۸ھ میں نکلا تھا اس طرح سے میری گوشہ نشینی کی مدت ۱۱ سال ہوتی ہے

یہ سب تقدیر الٰہی کی کارفرمائی تھی جس طرح بغداد سے نکلنا اور وہاں کے جاہ و اعزاز کو خیرباد کہنا تصور میں نہیں آتا تھا لیکن اللہ کے حکم سے وہ سب کچھ آسان ہو گیا، اسی طرح سے اس عزت کے زمانہ میں خوشی سے خلوت کی طرف دوبارہ آنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن وقت پر اس کا بھی سامان ہو گیا۔

غرض ذیقعدہ ۴۹۹ھ میں امام صاحب نے پھر نیشاپور کا رخ کیا اور مدرسہ نظامیہ کی مسند درس کو زینت دی اور دوبارہ تدریس و افادہ کا کام شروع کیا لیکن اب امام غزالیؒ کے درس و تدریس اور اصلاح و ارشاد اور اس انقلاب سے پہلے کے تدریسی مشاغل اور وعظ و ارشاد میں فرق تھا، پہلے وہ نفس کے تقاضے اور طبیعت کے جذبے سے کرتے تھے، اب وہ اپنے کو مامور اور آلۂ کار سمجھتے تھے چنانچہ خود پوری صاف گوئی سے لکھتے ہیں۔

> "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ علم کی نشر و اشاعت کی طرف میں نے پھر رجوع کیا ہے لیکن درحقیقت اس کو پہلی حالت کی طرف بازگشت نہیں کہہ سکتے، میری اس حالت اور دوسری حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، میں پہلے اس علم کی اشاعت کرتا تھا جو عزت و جاہ کا ذریعہ ہے اور اپنے قول و عمل سے اسی کی دعوت دیتا تھا۔ وہی میرا مقصود و نیت تھی لیکن اب میں اس علم کی دعوت دیتا ہوں جس سے جاہ سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، اب میں اپنی اور دوسرے کی اصلاح چاہتا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصود تک پہنچوں گا یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہو جائے گا لیکن مجھے یقین و مشاہدہ کی بنا پر ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کی طاقت ہے، اسی سے آدمی گناہ اور شر سے بچ سکتا ہے اور ہدایت و طاعت کی طاقت حاصل کر سکتا ہے اور اصل میں میں نے اپنی طرف سے حرکت نہیں کی، اس نے مجھے حرکت دی ہے، میں نے خود کام نہیں شروع کیا ہے، اس نے مجھے کام میں لگایا ہے، میری دعا ہے کہ پہلے اللہ میری اصلاح فرمائے پھر مجھ سے دوسروں کی اصلاح ہو، پہلے مجھے راہ پر لگائے پھر مجھ سے دوسروں کی رہنمائی فرمائے، حق مجھ پر منکشف ہو جائے اور اس کی

نفس سے مجھے اتباع کی توفیق ہو، باطل مجھ پر واضح کر دے اور مجھے اس کی پیروی سے بچائے۔[1]

امام غزالیؒ کا تجدیدی کام

امام غزالیؒ نے اس کے بعد جو تجدیدی کام انجام دیا اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ فلسفہ اور باطنیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ اور اسلام کی طرف سے ان کی بنیادوں پر ضرب۔

۲۔ زندگی و معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ اور ان کی تنقید و اصلاح۔

فلسفہ پر مکمل جراحی

ان کے پہلے اور سب سے بڑے کارنامہ کی تفصیل یہ ہے کہ فلسفہ الٰہی و باطنیت کے خلاف اس وقت تک جو کچھ کیا جا رہا تھا اس کی حیثیت صرف مدافعت و جواب دہی کی تھی۔ اس وقت تک فلسفہ اسلام پر حملہ آور تھا اور متکلمین اسلام صفائی کے وکیل تھے۔ فلسفہ اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتا تھا اور علم کلام سپر بننے کی کوشش کرتا تھا۔ اس وقت تک متکلمین و علمائے اسلام کے گروہ میں کسی نے خود فلسفہ کی بنیادوں پر ضرب لگانے کی جرأت نہیں کی۔ فلسفہ جن مفروضات پر قائم تھا ان پر جرح کرنے اور خود ان کی علمی تنقید کرنے کی صدیوں تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی۔ امام ابوالحسن اشعری کو چھوڑ کر جن کو فلسفہ سے براہ راست واسطہ نہیں پڑا، پورے علم کلام کا لہجہ معذرت آمیز اور مدافعانہ تھا۔ امام غزالیؒ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفہ کا تفصیلی و تنقیدی مطالعہ کیا۔ اس کے بعد مقاصد الفلاسفہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں آسان زبان اور سلجھے ہوئے طریقہ پر منطق، الٰہیات اور طبیعیات کا خلاصہ پیش کیا اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ فلاسفہ کے نظریات اور مباحث کو مدون کر دیا۔ کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے وضاحت کے ساتھ

---

[1] المنقذ من الضلال ص ۲۰-۱ مختصراً

لکھ دیا ہے کہ ریاضیات میں قبولیت و انکار کی گنجائش نہیں اور دین کا اس سے نفیاً و اثباتاً کوئی تعلق نہیں لیکن اصل مذہب کا تصادم الٰہیات سے ہے، منطقیات میں بھی شاذ و نادر غلطیاں ہیں اگرچہ اختلاف ہے تو اصطلاحات کا، طبیعیات میں حق و باطل کی آمیزش ہے، اس لئے ان کا موضوع بحث دراصل الٰہیات اور کسی قدر طبیعیات ہے، منطق محض تمہید و اصطلاحات کے لئے۔

اس کتاب سے فارغ ہو کر جس کی علم کلام کے حلقہ میں سخت ضرورت تھی انھوں نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "تہافۃ الفلاسفہ" لکھی جس کی خاطر انھوں نے مقاصد الفلاسفہ لکھی تھی، اس میں انھوں نے فلسفہ کے الٰہیات و طبیعیات پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کی اور اس کی کمزوریوں، اس کے استدلال کے ضعف اور فلاسفہ کے باہمی تناقض و اختلافات کو پوری جرأت و قوت کے ساتھ ظاہر کیا، اس کتاب میں ان کا لہجہ پُر اعتماد، ان کی زبان طاقتور اور شگفتہ ہے، کہیں کہیں وہ طنز اور شوخ طرز بیان بھی اختیار کر لیتے ہیں جس کی فلسفہ سے مرعوب حلقوں میں ضرورت تھی اور جو بڑا نفسیاتی اثر رکھتا ہے، اس کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا مصنف فلاسفہ کے مقابلہ میں احساس کمتری کے ہر شائبہ سے پاک، خود دار اور یقین سے لبریز اور فلسفہ پر مکمل عبور رکھتا ہے، وہ فلاسفۂ یونان کو اپنی صف اور سطح کا آدمی سمجھتا ہے اور ان سے مساویانہ و حریفانہ باتیں کرتا ہے، اس وقت ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی جو فلسفہ سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے اور بجائے مدافعت اور جواب دہی کے فلسفہ پر یورش و حملہ کرے، امام غزالیؒ نے تہافۃ الفلاسفہ میں یہی خدمت انجام دی ہے، اول سے آخر تک کتاب میں ان کا طرز یہی ہے، کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں:۔

> "ہمارے زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جن کو یہ زعم ہے کہ ان کا دل و دماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہے، یہ لوگ مذہبی احکام و قیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے سقراط و بقراط، افلاطون و ارسطو کے پر ہیبت نام سنے، اور ان کی تقلید میں ان مقلدوں کی مبالغہ آمیز بیان اور قصیدہ خوانی سنی، ان کو معلوم ہوا کہ یہ اصحاب منطقیات، طبیعیات و الٰہیات

میں انھوں نے بڑی موشگافیاں کی ہیں اور ان کا عقل و ذہن میں کوئی ہمسر نہ تھا، اس کمال و دانائی اور ذہانت کے ساتھ وہ مذاہب اور ان کی تفصیلات کے منکر تھے اور ان کے نزدیک ان کے اصول قواعد فرضی و مصنوعی ہیں، پس انھوں نے بھی تقلیداً انکارِ مذہب کو اپنا شعار بنا لیا، اور تعلیم یافتہ و روشن خیال کہلانے کے شوق میں مذاہب کا انکار کرنے لگے، تاکہ ان کی سطح عوام سے بلند سمجھی جائے اور وہ بھی عقلاء و حکماء کے زمرہ میں شمار ہونے لگیں، اس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکماء نے الٰہیات پر جو کچھ لکھا ہے اس کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیچۂ اطفال اور ان کے بہت سے اقوال و نظریات حد درجہ کے مضحکہ خیز بلکہ عبرت انگیز ہیں۔[1]

اس کتاب میں آگے چل کر ان کا زورِ بیان اور طنز آمیز طریقۂ تحریر اور شوخ ہو جاتا ہے اور ذات و صفاتِ باری کے متعلق فلاسفہ کے نظریات اور عقول و افلاک کا پورا شجرۂ نسب لکھ کر جو فلاسفہ نے تصنیف کیا ہے لکھتے ہیں:-

قلنا ما ذکرتموہ تحکمات وھی علی التحقیق	تمہاری یہ ساری باتیں اور تفصیلات محض دعاوی اور
ظلمات فوق ظلمات لو حکاہ الانسان	تحکمات ہیں بلکہ درحقیقت تاریکی پر تاریکی ہیں، اگر
عن منام رآہ لاستدل بہ علی سوء مزاجہ[2]	کوئی شخص اپنا ایسا خواب بھی دیکھنا بیان کرے
	تو اس کے سوء مزاج کی دلیل ہوگا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:-

لست ادری کیف یقنع المجنون من نفسہ بمثل	مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ بھی اپنی خود ساختہ
ھذہ الاوضاع فضلاً عن العقلاء الذین	باتوں پر کیسے قانع ہو سکتا ہے چہ جائیکہ وہ عقلاء
یشقون الشعر بزعمھم فی المعقولات۔[3]	جو بزعم خود معقولات میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔

---

[1] تہافت الفلاسفہ ص ۳ طبع نو، مصر [2] ایضاً ص ۴۱ [3] ایضاً ص ۴۲

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

[illegible]	اے [illegible] بالذکر [illegible]
[illegible] خطبہ وقد [illegible]	[illegible]
[illegible] المبتدعة [illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
في [illegible] وهكذا الفضل	کیا [illegible]
[illegible] عن سبله والراكبين	گمراہی کو [illegible]
عن طريق الهدى المنكرين [illegible]	[illegible] ایسے لوگوں کا [illegible]
[illegible] والارض	[illegible] کی راہ سے بہت [illegible]
وكذلك [illegible] للملائكة [illegible]	اور ہدایت کے راستے [illegible]
[illegible] الرحمن	[illegible]
[illegible] البشرية	[illegible] آسمان اور زمین کی پیدائش کے
المغرورين [illegible]	وقت [illegible]
[illegible] الرسل والانبياء	کے وقت [illegible]
فلاجرم اضطروا الى الاعتراف بان	اور [illegible]
[illegible]	ربوبیت کی حقیقت [illegible]
في المنام [illegible][1]	[illegible]
	[illegible]

---

[1] تجلیات صفدر ص [illegible]

انسان کی ضرورت نہیں وہ نہ لاسکا، انجام یہ ہوا کہ
اس کی زبان سے وہ معقولات کہلائے ہیں ایسی ایسی
مضحکہ خیز باتیں نکلیں کہ اگر کوئی خواب میں بھی بیان
کرے تو لوگ تعجب کریں۔

تہافت الفلاسفہ کا اثر

فلسفہ پر یہ دلیرانہ تنقید اور کسی حد تک تحقیر علم کلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا جس کا سہرا امام غزالیؒ کے سر ہے۔ بعد میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس کی تکمیل کی اور فلسفہ اور منطق کی لاش کی تشریح (پوسٹ مارٹم) کا فرض انجام دیا، فلسفہ کی جراحی کے اس سلسلہ کا آغاز امام غزالیؒ ہی کی تصنیفات سے ہوتا ہے۔

تہافت الفلاسفہ نے فلسفہ کے خیالی طلسم پر کاری ضرب لگائی اور اس کی عظمت اور تقدس کو کافی نقصان پہنچایا، اس کتاب کی تصنیف نے فلسفہ کے حلقوں میں ایک اضطراب اور غم و غصہ پیدا کر دیا، مگر سو برس تک اس کے جواب میں کوئی شایان شان کتاب تصنیف نہیں ہوئی، یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں فلسفہ کے مشہور پرجوش وکیل اور ارسطو کے معتقد گرویدہ ابن رشد (م ۵۹۵ھ) نے "تہافت التہافت" کے نام سے اس کا جواب لکھا، علماء مغرب کہتے ہیں کہ اگر ابن رشد فلسفہ کی حمایت کے لئے نہ کھڑا ہو جاتا تو فلسفہ غزالیؒ کے حملوں سے نیم جان ہو چکا تھا، ابن رشد کی حمایت نے اس کو سو برس تک کے لئے پھر زندگی عطا کر دی۔[1]

باطنیت پر حملہ

فلسفہ کے علاوہ امام غزالیؒ نے فتنۂ باطنیت کی طرف بھی توجہ کی، انھوں نے قیام بغداد کے دور

---

[1] تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق والمغرب محمد لطفی جمعہ ص ۲۲

مدرسہ نظامیہ کی مدرسی کے زمانہ میں جن علوم کی تدریس و تعلیم و افتاء سے مشغول رہے [illegible] فقہ تھی جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی خود نوشت [illegible] کتاب سے اس فن کے [illegible] ان کی [illegible] اور [illegible] ہیں ۔ [illegible] تصنیف [illegible] ان کی تصنیفات کی فہرست میں اس موضوع پر دو کتابیں [illegible] حقیقت یہ کے حلقہ میں ان سے زیادہ [illegible] مشکل [illegible] علوم [illegible] مہارت دونوں کو [illegible] ان کی عقلی [illegible] نہیں کر سکتے تھے ۔ [illegible] امام غزالی جیسا [illegible] شخص [illegible] تفصیلات [illegible] کہ انھوں نے [illegible] ان کی علمی [illegible]

زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ

امام غزالی کا دوسرا اصلاحی کارنامہ زندگی و معاشرت کا اسلامی جائزہ اور دین کی [illegible] کی [illegible] تھی ان کی اس کوشش کا نمونہ اور کامیاب تجربہ ان کی زندہ و جاوید تصنیف احیاء علوم الدین ہے

احیاء علوم الدین

تاریخ اسلام میں جن چند کتابوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ اور ان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے اور جن سے اسلامی طبقے [illegible] تک متاثر رہے ہیں ان میں احیاء علوم الدین کو ممتاز مقام

[illegible]

حاصل ہے حافظ زین الدین العراقی صاحب الفیہ (م ۸۰۶ھ) جنھوں نے احیاء کی احادیث کی تخریج کی ہے لکھتے ہیں کہ امام غزالی کی احیاء علوم اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیفات میں ہے۔ عبدالغافر فارسی جو امام غزالی کے معاصر اور امام الحرمین کے شاگرد ہیں لکھتے ہیں کہ احیاء العلوم کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی۔ شیخ محمد گازرونی کا دعویٰ تھا کہ اگر دنیا کے تمام علوم مٹ جائیں تو میں احیاء العلوم سے ان کو دوبارہ زندہ کر دوں گا۔ حافظ ابن جوزی نے بھی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود اس کتاب کی تاثیر اور مقبولیت کا اعتراف کیا ہے اور اس کا خلاصہ منہاج القاصدین کے نام سے لکھا۔

یہ کتاب خاص حالات و کیفیات اور خاص جذبہ کے ساتھ لکھی گئی ہے بغداد سے انھوں نے طلب حق اور تلاش الیقین کا جو سفر شروع کیا تھا اور جو دس برس کی خلوت اور بادیہ پیمائی کے بعد کمال پر ختم ہوا، احیاء العلوم اس سفر کی سوغات تھی جو امام غزالی اہل وطن کے لیے لائے، یہ ان کے قلبی تاثرات علمی تجربات، اصلاحی خیالات اور وجدانی کیفیات کا آئینہ ہے۔

مولانا شبلی نے الغزالی میں لکھا ہے:۔

> بغداد میں ان کو تحقیق حق کا جنون پیدا ہوا تھا۔ جب کوئی فن کسی سے تسلی نہیں ہوئی تو تصوف کی طرف رخ کیا، لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی بلکہ سراپا حال کا کام تھا اور اس کا مقصد اصلاح باطن اور تزکیہ نفس تھا۔ امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے بالکل متضاد تھے۔ قبول عام، [illegible] و منزلت، مناظرات و مجادلات اور پھر تزکیۂ نفس سے نا آشنا تھا۔ ع
>
> اے بہ کجا می روی تو بجز آب نمی دود
>
> آخر سب چھوڑ چھاڑ ایک کملی پہن کر بغداد سے نکلے اور دشت بیابان کی خاک چھانی، مجاہدات اور ریاضتیں کیں برسوں کے بعد اس منزل تک رسائی پائی جہاں پہنچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر ہو جاتے لیکن

تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء (شیخ عبدالقادر العیدروس)

کے لحاظ سے اتنا دور نہ تھا، زمانہ پر نظر ڈالی، دیکھا تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے، امیر و وزیر، عالم و عامی، عالم و جاہل، رہبر و رہنما، سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں، علماء جو دلیل راہ بن سکتے تھے طلب جاہ میں محو ہیں۔ یہ دیکھ کر فیصلہ کر چکا اور اسی حالت میں یہ کتاب لکھی، دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھا لیا ہے اور سعادت اخروی کی راہ بند ہو گئی ہے، علماء جو دلیل راہ تھے زمانہ ان سے خالی ہوتا جاتا ہے، جو رہ گئے ہیں وہ نام کے عالم ہیں، جن کو نفسانی اغراض نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور جنھوں نے تمام عالم کو یقین دلا دیا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے، مناظرہ (جو فخر و شہرت کا ذریعہ ہے) وعظ (جس میں عوام کی دلفریبی کے لئے نکتے اور مسجع فقرے استعمال کئے جاتے ہیں) فتویٰ (جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے) باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہو گیا ہے اور لوگ اس کو بھول بھال چکے ہیں، یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور مہر سکوت ٹوٹ گئی۔[1]

تنقید و احتساب

کتاب کی تالیف سے جو اصلاح و تربیت امام غزالی کے پیش نظر تھی اس کے لئے آمادگی اور شوق اور اپنی اور اپنے ماحول کی اصلاح کا تقاضا پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کمزوریوں اور خرابیوں کی نشاندہی کی جائے جو علمی و دینی حلقوں اور مسلم معاشرہ میں بالعموم پھیلی ہوئی تھیں، نیز اس حقیقت کو آشکارا کیا جائے کہ نفس و شیطان نے کس کس طریقہ سے مختلف طبقوں کو فریب دے رکھا ہے، دینی مفاہیم و حقائق کس طرح تبدیل ہو گئے ہیں، لوگ حقائق و مقاصد سے ہٹ کر ظواہر و اشکال اور رسوم میں کس طرح گرفتار ہیں اور مقصد اصلی سعادت اخروی اور رضائے الٰہی سے کس طرح غافل ہیں، اس کے لئے انھوں نے

---

[1] الغزالی [illegible]

اپنے زمانہ کی زندگی اور معاصر سوسائٹی کا پورا جائزہ لیا، اور اس کی بے لاگ تنقید کی، اور ہر طبقہ کے امراض اور نقائص کو صفائی کے ساتھ بیان کیا، مقاصد اور وسائل و آلات میں فرق کیا، علوم میں دنیوی علوم اور دینی علوم، اور پھر علوم محمودہ اور علوم مذمومہ میں فرق، اور فرض کفایہ کی تقسیم کی، وقت کے فریضہ اور اہم کام کی طرف توجہ دلائی، اہل دولت اور اغنیاء کی کوتاہیوں اور ان کی مخصوص بیماریوں کو کھول کر بیان کیا، سلاطین حکام پر جرأت کے ساتھ تنقید کی، اور ان کے جبر و ظلم، خلاف شرع احکام و قوانین کی مذمت کی، اس کے علاوہ جمہور و عوام کے امراض اور مختلف طبقوں اور مقامات کے منکرات، مذموم عادات اور جماعت دینی رسوم و بدعات کی تفصیل کی، اس طرح یہ کتاب اسلام میں پہلی مفصل و مدلل کتاب ہے جس میں پوری زندگی اور بگڑے ہوئے اسلامی معاشرہ کا جرأت کے ساتھ احتساب کیا گیا ہے اور اخلاقی بیماریوں کے عوارض و اسباب اور ان کا طریق علاج بتایا گیا ہے

علماء و اہل دین

امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد دینی و اخلاقی انحطاط کی سب سے بڑی ذمہ داری علماء پر ہے جو ان کے نزدیک امت کا نمک ہیں، اگر نمک بگڑ جائے تو اس کو کون سی چیز درست کر سکتی ہے، بقول شاعر:-

یا معشر القراء یا ملح البلد ما یصلح الملح اذا الملح فسد

اے جماعت علماء! اے وہ جو شہر کا نمک ہو — بھلا بتلاؤ کہ جب نمک ہی بگڑ جائے تو بگاڑ کا علاج کس سے کیا جائے

ایک جگہ امراض قلب کی کثرت اور عام غفلت کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

الثالثة وهو الداء العضال فقد الطبيب	تیسرا سبب اور وہ لاعلاج مرض کی حیثیت رکھتا
فان الاطباء هم العلماء	ہے یہ ہے کہ امراض موجود ہیں اور طبیب مفقود،
وقد مرضوا في هذه الاعصار مرضاً	طبیب علماء ہیں اور وہ خود اس زمانہ میں
شديداً وعجزوا عن علاجه	خود بیمار ہیں اور علاج سے عاجز ہیں۔

ان کے نزدیک سلاطین و حکام کی خرابی کا سبب بھی علما کی کمزوری اور اپنے فرائض سے غفلت ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں۔

وبالجملة انما فسدت الرعية	خلاصہ یہ ہے کہ رعیت کی خرابی کا سبب سلاطین
بفساد الملوك وفساد الملوك	کی خرابی ہے اور سلاطین کی خرابی کا سبب علما
بفساد العلماء ولولا القضاة السوء	کی خرابی ہے اس لئے کہ اگر برے قاضی اور
والعلماء السوء لقل فساد الملوك	علما نہ ہوتے تو سلاطین اس طرح نہ بگڑتے
خوفاً من انكارهم اھ[۱]	اور ان کو علما کی روک ٹوک کا کھٹکا ہوتا۔

ان کو علماء وقت سے شکایت ہے کہ وہ علماء سلف کی طرح امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور کلمۂ حق عند سلطان جائر کا فریضہ انجام نہیں دیتے، ان کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ خود بہت سے علما دنیا طلبی اور جاہ طلبی کا شکار ہو گئے ہیں، وہ سلاطین وقت اور ارباب حکومت کے سامنے علماء حق کی جرأت و بیباکی اور احتساب و انکار کے مؤثر واقعات نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

> یہی علما کا طرز عمل اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شان تھی، ان کو سلاطین کی شان و حشمت کی ذرا پرواہ نہیں تھی وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ رکھتے تھے اور ان کو اطمینان تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر بھی راضی تھے کہ ان کو شہادت نصیب ہو، چونکہ ان کی نیت خالص تھی اس لئے ان کے کلام سے سخت دل موم ہو جاتے تھے اور بڑے سے بڑے سنگدل متاثر ہوتے تھے اب تو حالت یہ ہے کہ طمع دنیا نے علما کی زبانیں گنگ کر دی ہیں، وہ خاموش ہیں، اگر بولتے بھی ہیں تو ان کے قول و عمل میں مطابقت نہیں ہوتی اس لئے ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اگر آج بھی وہ خلوص و صداقت سے کام لیں اور علم کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں تو ان کو ضرور کامیابی ہو، غرض رعیت کی خرابی سلاطین کی خرابی

---

[۱] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۳۸

کو نیچی نظر سے دیکھتے ہیں، اور علماء [illegible] دین کی دعوت اور [illegible] کا

نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے طالب علم جانتے ہیں [illegible] کی طرف رغبت [illegible] لوگ

مجلسیں کم ہیں [illegible] مدارس [illegible][1]

امام غزالی کے زمانہ میں ایک بڑی جماعت فقہ کی جزئیات اور فرضی مسائل میں مشغول تھی، مباحثہ و مناظرہ کا بازار گرم تھا، ملک کے چپہ چپہ پر گرم مجالس، تقریبات اور بادشاہوں کے درباروں کی رونق بھی انہی مذہبی و فقہی مباحثوں اور مناظروں سے تھی، اس بارہ میں علماء و طلبہ کا انہماک اور غلو اتنا بڑھ گیا تھا کہ تمام دوسرے علوم و مشاغل اور خدمت دین کے شعبے نظر انداز ہوتے جا رہے تھے، یہاں تک کہ اصلاح نفس، تہذیب اخلاق اور سعادت اخروی کو جس فکر اور کوشش پر منحصر تھا، اس سے بھی توجہ ہٹ گئی تھی، امام غزالی اس صورت حال کی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> اگر کسی فقیہ سے ان مسائل میں (صبر و شکر، خوف و رجاء، [illegible] اخلاص، [illegible] دعا، زہد وغیرہ) میں سے کسی کی حقیقت [illegible] اور ان سے بچنے کے طریقے کے متعلق سوال کیا جائے جن کا جاننا اس کے لئے فرض عین ہے اور اس کو نظر انداز کرنے میں آخرت کی تباہی کا خطرہ ہے تو وہ جواب نہ دے سکے گا، لیکن اگر آپ لعان، ظہار، سبق و رمی کے مسائل دریافت کریں تو وہ ایسی ایسی باریک تفریعات کے دفتر کے دفتر سنا دے گا، جن کی ضرورت مدتوں پیش نہیں آتی، اور اگر کبھی ضرورت پیش آجائے تو شہر میں ان کے متعلق فتویٰ دینے والے اور بتانے والے ہر وقت موجود ہیں، لیکن یہ عالم دن رات انہی جزئیات کے مطالعہ و محنت اور تکرار کا عادی ہے، اور ان کے حفظ و درس میں مشغول رہے گا، اور ان چیزوں سے غفلت برتے گا، جو دینی حیثیت سے اس کے لئے ضروری ہے، اگر اس سے کبھی اس بارہ میں سوال ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ علم میں اس لئے مشغول ہوں کہ وہ علم دین ہے اور فرض کفایہ ہے، اور دوسروں کے تلبیس [illegible] کے بارے میں [illegible]

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۱ صفحہ [illegible]۔

متاثر ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی۔ مثلاً کسی آدمی پر حج فرض ہے اگر اس کا تقاضا بھی علم کا ہے تو اور اگر جہاد ہو اور اس میں دوسرا جز واجب ادا نہ ہوتا ہو تو وہاں فرض کفایہ پر فرض عین کو مقدم رکھنا بلکہ دوسرا فرض کفایہ بھی بعض جگہ مقدم ہو جاتا ہے جیسے مثلاً کتنے شہر ہیں جن میں صرف غیر مسلم طبیب ہیں جن کی شہادت احکام فقہ میں قبول نہیں کی جاسکتی پھر ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی عالم اس کی ضرورت کو محسوس کر کے علم طب کی طرف توجہ کرتا ہو اس کے بالمقابل علم فقہ اور خصوصاً اختلافیات و جدلیات پر ٹوٹے پڑتے ہیں حالانکہ شہر ایسے علماء سے بھرا ہوا ہے جن کا مشغلہ فتویٰ نویسی اور مسائل کا جواب دینا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ علماء دین ایسے فرض کفایہ میں مشغول ہونے کو کیسے درست سمجھتے ہیں جس کو ایک جماعت کی جماعت سنبھالے ہوئے ہے اور ایسے دینی کام کو انھوں نے کیسے چھوڑ رکھا ہے جس کی طرف کوئی توجہ کرنے والا نہیں کیا اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ ہو سکتا ہے کہ طب کے ذریعہ سے اوقاف کی تولیت، وصیتوں کی تنفیذ اور یتیموں کے مال کی نگرانی، منصب قضا اور منصب افتاء پر تقرر، ہمعصروں پر تفوق اور دشمنوں اور حریفوں پر حکومت و غلبہ حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں[1]

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

کوئی شہر ایسا نہیں ہے جس میں بہت سے ایسے کام نہ ہوں جو فرض کفایہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی طرف توجہ کرنے والا کوئی نہیں اور علماء کو ان کی طرف بالکل التفات نہیں زیادہ ضروری طب کی ضرورت نہیں الگ طب کو لیجئے اکثر اسلامی شہروں میں مسلمان طبیب نہیں ہیں جن کی شہادت قبول کی جائے حالانکہ علماء اس میں مشغول ہونے کو اپنا فرض نہیں سمجھتے اس سے بڑھ کر اور کیا منکر ہو سکتا ہے کہ ایک فرض کفایہ ہے اور بالکل متروک ہو رہا ہے؟[2]

وہ ایک جگہ عام جہالت و غفلت، دین سے ناواقفیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور تبلیغ اور عمومی تعلیم کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۲۱ [2] ایضاً ص ۲۰

• ان شعبوں کے لیے جن کو اپنے دین کی زیادہ فکر ہے بے ضرورت ہیں ہم خود ایسے مشغلے میں پڑ گئے ہیں جو نادر الوقوع ہو رہا وہ وہ کاروبار حسبہ اور ان بنیادی موشگافیاں کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی جو وہ فرض کفایہ ہے۔[1]

امام غزالی محققانہ و مورخانہ حیثیت سے اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ اختلافی مسائل نے پچھلے دور میں کیوں اس قدر اہمیت اور مقبولیت حاصل کر لی اور علماء نے اس کو اپنی ذہانتوں اور قوتوں کا میدان بنا لیا، اور ان کی بحثیں اور توجہات اس میں صرف ہونے لگیں امام غزالی کے نزدیک اس کے کچھ تاریخی اسباب ہیں اور ان کے عہد میں ایسا ہونا بالکل قدرتی بات ہے وہ تحریر فرماتے ہیں۔

• آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین حضرات خلفائے راشدین خود بڑے عالم فقیہ اور صاحب فتویٰ تھے ان کو سوائے بہت کم کسی خاص موقع پر دوسرے اہل علم صحابہ سے مشورہ لینے کی ضرورت پیش آتی تھی اس لئے علماء صحابہ تمام تر آخرت کے لیے فارغ اور اس پر یکسو تھے اگر کوئی فتویٰ کا مسئلہ پیش آتا تو وہ ایک دوسرے پر ٹال دیتے اور پہلو تہی کرتے جیسا کہ ان کے حالات میں منقول ہے، جب ان لوگوں کی نوبت آئی جو خلافت کا استحقاق اور قابلیت نہیں رکھتے تھے اور ان میں خود فیصلہ کرنے اور فتویٰ دینے کی صلاحیت نہیں تھی تو ان کو مجبوراً دوسرے علماء سے مدد لینی پڑتی اور ان کو ساتھ رکھنا پڑتا کہ ان سے فتویٰ حاصل کرتے رہیں علماء تابعین میں ابھی ایسے لوگ زندہ تھے جو قدیم وضع پر تھے اور جن میں دین کی حقیقت اور سادگی قائم تھی جب ان کو بلایا جاتا تو وہ گریز کرتے اور اعراض کرتے خلفاء (بنی امیہ و بنی عباس) ان کا پیچھا نہ چھوڑتے، وہ مجبوراً قضاء اور حکومت کے فرائض سے انکار کرنے کی کوشش کرتے ان کے اس زمانہ کے لوگوں نے جب علماء کی یہ شان، سلاطین و حکام کا ان پر یہ جھکاؤ اور اہل علم کا استغنا اور بے پرواہی دیکھی تو وہ سمجھے کہ حصول جاہ و عزت کے لیے تفقہ کا علم بہترین ذریعہ ہے اس سے حکام کا تقرب اور قضاء و افتاء کا منصب حاصل ہوتا ہے، وہ اس پر ٹوٹ پڑے، علم فتاویٰ کو سامنے رکھ کر اپنے آپ کو پیش کیا ان

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۲۴

ان سے کہ علم سکھلا کے اور عہدوں اور مناصب کی درخواست پیش کی، بعض ناکام رہے اور بعض کامیاب ہوئے جو کامیاب ہوئے وہ بھی طلب کی ذلت اور اہانت سے محفوظ نہیں رہے اور ان کو اپنے مقام سے نیچے اترنا پڑا اور عوام کی سطح پر آنا پڑا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء جو پہلے مطلوب تھے اب طالب بن گئے پہلے سلاطین سے استغناء اور اعراض کی وجہ سے معزز تھے اب ان کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو گئے، البتہ اس کلیہ سے ہر دور میں کچھ حضرات ضرور مستثنیٰ رہے ہیں۔

ان زمانوں میں سب سے زیادہ حیثیت اور توجہ احکام اور فتاویٰ کی طرف تھی اور انتظامات و قضایا کے سلسلہ میں ان کی ضرورت بھی زیادہ تھی، اس کے بعد بعض رؤساء اور حکام کو اصول و عقائد سے دلچسپی پیدا ہوئی، اور اس کا شوق ہوا کہ مذاہب کے دلائل و مباحث سنیں، اور ان کا بحث و مباحثہ دیکھیں، لوگوں کو امراء و حکام کے اس ذوق کا علم ہوا تو وہ علم کلام کی طرف رجوع ہوئے، بعض نے اس موضوع پر بکثرت تصنیفات کیں اور مناظرہ کے اصول و قواعد کو مرتب کیا، اور وہ تدریجاً ایک فن بن گیا، ان لوگوں کا بیان تھا کہ ان کا مقصد دین کی طرف سے مدافعت اور مذہب اہل سنت کی نصرت اور بدعت کی تردید و مخالفت ہے، ٹھیک جیسے ان لوگوں سے پہلے کے لوگ یہ کہتے تھے کہ فتاویٰ میں مشغولیت سے مقصود محض دینی خدمت، خلق اور بندگانِ خدا پر شفقت اور خیر خواہی ہے، پھر اس کے بعد ایسے حکام پیدا ہوئے جو علم کلام و مناظرہ کو زیادہ مستحسن نہیں سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس سے تعصب، ہنگامہ، جدال اور بعض اوقات خونریزی و فساد کی نوبت آجاتی ہے، ان کو فقہی بحث و مناظرہ سے رغبت تھی اور اس میں تحقیق کا شوق تھا، خصوصیت کے ساتھ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے مذہب پر بحث سے، وہ لوگ یہ دیکھ کر کلام و عقائد کی بحث چھوڑ دی، اور اختلافی مسائل بالخصوص امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے اختلافات کو موضوع بحث بنا لیا، اور امام مالک، امام سفیان ثوری اور امام احمد بن حنبل کے اختلافات کو نظر انداز کر دیا اور دعویٰ کیا کہ ان کے اختلافات سے عام موضوع پر بھی ان کا بیان، فائدہ کا مقصد ہے کہ شریعت کی تائید ہو گیا

ظاہر کریں تو ابھی کچھ وجوہ و اسباب کو بیان کیا اور مناظرہ کے اصول کو مرتب و مدون کیا، انھوں نے اس میں کثرت سے تصنیفات کیں اور استنباطات کے طریقے بتائے اور تصنیف کے فن کو ترقی دی اور یہ مشغلہ ابھی تک جاری ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کیا دکھائے گا، اور اس میں کیا تغیر ہوگا، غرض اختلافی مسائل اور مناظرہ سے علماء کی دلچسپی اور ان کے انہماک کا سبب یہی ہے جو ہم نے بیان کیا، اگر اہل دنیا اور ارباب اقتدار کو امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے علاوہ کسی اور امام یا اختلافی مسائل و مناظرہ کے علاوہ کسی اور علم سے دلچسپی ہو جائے تو علماء بھی اسی کی طرف جھک پڑیں گے اور اس کی وجہیں بیان کریں گے کہ ان کا مقصد علم دین اور قربت خداوندی کے سوا کچھ نہیں ہے۔[1]

اس کے بعد امام غزالی نے تفصیل کے ساتھ مناظرہ اور بحث و جدال کے اخلاقی اور روحانی نقصانات و مفاسد اور اس کے شرور و آفات بیان کیے ہیں، وہ عرصہ تک اس میدان کے شہسوار رہ چکے تھے اس لیے اس سلسلہ میں ان کا بیان چشم دید شہادت کی حیثیت رکھتا ہے اور مشاہدات اور ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔[2]

اس سلسلہ میں ایک بڑا المناک اتفاق یہ تھا کہ امام غزالی کے زمانہ کے علوم مروجہ اور ان کی بگڑی ہوئی شکلوں کے لیے جو الفاظ عنوان کا کام دیتے تھے وہ قدیم الفاظ تھے جو قرآن و حدیث، صحابہ کے کلام اور علماء سلف کی سیرتوں میں بکثرت آتے ہیں، مثلاً اختلافی مسائل، فقہ کی نادر الوقوع جزئیات اور باریکیوں کے لئے بے تکلف "فقہ" کا لفظ استعمال ہوتا تھا، ہر طرح کے علمی اشتغال اور شرعی و غیر شرعی علم کے لیے مطلق علم کا لفظ بولا جاتا تھا، علم کلام اور اس کے فلسفیانہ مباحث کو توحید کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بے سروپا روایات و شطحیات اور عبارت آرائی و رنگین بیانی کو تذکیر کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا، ہر طرح کے نامانوس حقائق اور پیچیدہ عبارتوں کو "حکمت" کا خطاب ملا ہوا تھا، اور پھر ان سب خود ساختہ اعمال و اشغال پر وہ سب فضائل چسپاں کیے جاتے تھے جو قرآن و حدیث میں ان علوم کی حقیقتوں کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں[3]

---

[1] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۳۸

[2] ملاحظہ ہو احیاء العلوم ج ۱ ص ۳۸ تا ۴۲

کی اس بگڑی ہوئی شکل (یعنی اختلافات و جزئیات کے لئے) قرآن مجید کی آیت لیتفقہوا فی الدین اور حدیث من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین، فلسفہ اور پانچویں صدی کے علم کلام کے لئے ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً کی بشارت[1] جاہل و ناخدا ترس واعظوں کے عامیانہ مواعظ کے لئے فذکر انما انت مذکر اور دوسری آیات و احادیث منطبق کی جاتی تھیں، امام غزالی نے اس مغالطہ کا پردہ چاک کیا اور تفصیل سے بتایا کہ یہ الفاظ اپنی اصل حقیقت کھو چکے ہیں، اور اپنے اصل مفہوم سے دور ہوتے ہوتے کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں، قرون اولیٰ میں ان کا جو مفہوم تھا اس سے علماء کے ان موجودہ مشاغل کو کوئی مناسبت نہیں، ان کی یہ بحث الفاظ کے سفر کی ایک عجیب روداد اور اصطلاحات اور عنوانات کے تغیر کی ایک سبق آموز تاریخ ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا ذریعہ ہے جو علمی اور دینی حلقوں میں اس وقت پھیلی ہوئی تھیں۔[2]

حکام و سلاطین

دوسرا جو امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد و اخلاقی انحطاط اور دینی تنزل کا ذمہ دار تھا، وہ اہل حکومت اور سلاطین و امراء کا طبقہ تھا، امام غزالی سے دو سو برس پہلے حضرت عبد اللہ ابن مبارک نے انہی دونوں (علماء و سلاطین) کے گروہوں کو دین بگاڑنے والا قرار دیا تھا۔

وهل افسد الدين الا الملوك　　واحبار سوء ورهبانها

امام غزالی نے ایک ایسے زمانہ میں کہ بادشاہ مطلق العنان اور ہر طرح کے قوانین و ضوابط سے بالاتر تھے اور ان پر اعتراض کرنا موت کو پیغام دینا تھا، اس طبقہ کا پوری جرأت کے ساتھ احتساب کیا اور ان پر آزادانہ تنقید کی، ان کے زمانہ میں بادشاہوں کے عطیوں اور پیشکشوں کو قبول کرنے کا عام رواج

---

[1] چنانچہ فلسفہ کی درسی کتابوں پر حتی کہ منطق کی بعض بعض کتابوں کے سرورق پر اب بھی یہ آیت نظر آتی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین، بیان ما بدل من الفاظ العلوم، ج ۱ صفحہ ۲۴-۳۴

تھا امام غزالی نے اموال سلطانی کو نا جائز اور بالعموم مشتبہ اور حرام بتلایا ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

اغلب اموال السلاطین حرام فی هذه الاعصار والحلال فی ایدیهم معدوم او عزیز[١]۔

بادشاہوں کے مال اس زمانہ میں عموماً حرام ہے حلال نہیں حلال مال ان کے پاس یا تو ہے ہی نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

ان اموال السلاطین فی عصرنا حرام کلها او اکثرها وکیف لا والحلال هو الصدقات والفیٔ والغنیمة ولا وجود لها ولیس یدخل منها شیٔ ید السلطنة ولم یبق الا الجزیة وانها تؤخذ بانواع من الظلم لا یحل اخذها به فانهم یجاوزون حدود الشرع فی المأخوذ والمأخوذ منه والوفاء له بالشرط ثم اذا نسبت ذالک الی ما ینصب الیهم من الخراج المضروب علی المسلمین ومن المصادرات والرشا وصنوف الظلم لم یبلغ عشر معشار عشیره[٢]۔

سلاطین کے مال ہمارے زمانہ میں یا تو سب حرام ہیں یا بیشتر حصہ حرام ہے کیونکہ جب کہ حلال نہیں اس لئے کہ حلال صرف زکوٰۃ خمس اور مال غنیمت کی پیداوار کا کہیں وجود نہیں اور ان میں سے کوئی چیز بادشاہ تک پہنچتی نہیں اب صرف جزیہ رہ گیا ہے جس کی حد اور اس کا حال یہ ہے کہ وہ مختلف ظالمانہ طریقوں سے وصول کیا جاتا جن سے اس کا وصول کرنا جائز نہیں یعنی اہل سلطنت حدود شریعت سے تجاوز کرتے ہیں مال کی مقدار میں شریعت کا کچھ پاس کیا جاتا ہے نہ ان لوگوں کا جن سے وصول کیا جاتا ہے نہ ادائے شرط کے احکام کا خیال کیا جاتا ہے پھر اس کو شمار کیا جائے کہ جتنے ہیں جو مسلمانوں پر مقررہ خراج اور ضبطی مال، رشوت اور ظلم کی اقسام کے ظلم سے حاصل ہوتے ہیں تو وہ ان کے دسویں حصہ کا دسواں بھی نہ ہو

---

[١] احیاء علوم الدین ج ٢ ص ١٢٠ [٢] ایضاً ص ١٢٢

اس بزرگ کو امیر کی کوئی نسبت نہیں۔

امام غزالی اس سے ترقی کر کے یہاں تک لکھتے ہیں کہ سلاطین وقت سے ان رقوم کو قبول کرنا بھی مناسب نہیں جن کے متعلق تحقیق یا گمان غالب ہو کہ وہ مشتبہ اور ناجائز نہیں ہیں اس لئے کہ اس میں بکثرت دینی مفاسد ہیں اس موقع پر گذشتہ عہد کی مثالیں دی جا سکتی تھیں کہ سلف میں بعض علماء و صلحاء نے اپنے زمانہ کے خلفاء و سلاطین کی پیشکش بعض اوقات قبول کی ہیں، امام غزالی اس عہد کے ملوک و سلاطین اور ان دونوں زمانوں کے حالات کا فرق بیان کرتے ہیں:۔

- دور اول کے ظالم سلاطین خلفاء راشدین کے عہد کے قرب کی وجہ سے اپنے ظلم کا احساس رکھتے تھے اور ان کو صحابہ و تابعین کی دلجوئی و استمالت کا خیال رہا کرتا تھا اور اس بات کی فکر رکھتے تھے کہ وہ کسی طرح ان کے عطیے اور انعامات قبول کر لیں، وہ ان کے پاس بے درخواست اور بغیر ان حضرات کی طلب کے اور ان کی شان اور مرتبہ و عزت کے لحاظ سے ان کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے بلکہ ان کے قبول کر لینے پر ان کے احسان مند ہوتے تھے اور مسرت کا اظہار کرتے تھے، وہ حضرات بھی ان چیزوں کو لے کر تقسیم کر دیا کرتے تھے، وہ سلاطین کی خواہش میں ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے، نہ ان سے ملاقات کے لئے جاتے تھے، نہ ان کے ساتھ آمد و رفت کو پسند کرتے تھے، نہ ان کو ان کی درازی عمر اور جاہ و اقبال کے باقی رہنے کی خواہش تھی بلکہ وہ اکثر ان کے لئے بددعا کرتے تھے، ان کے بارہ میں آزادانہ اظہار خیال کرتے تھے اور ان کے منہ پر ان کے خلاف شرع امور پر ٹوکا کرتے تھے اور تنبیہ کرتے تھے، بجز اس کے کہ سلطنت کا نظم اور علماء کو ظالمین کا ناجائز یا ان کی ثنا ہی، ان کو سلاطین کی امداد سے دینی نقصان نہ پہنچتا تھا اس لئے ان کے قبول کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔

لیکن اس زمانہ کے سلاطین ان ہی لوگوں کے ساتھ فیاضی کرتے ہیں جن کے متعلق ان کو یہ امید ہوتی ہے کہ وہ ان کے کام آئیں گے ان سے ان کو مدد ملے گی، وہ ان سے اپنی اغراض پوری کر سکیں گے، ان سے ان کے درباروں اور مجلسوں کی رونق بڑھے گی اور وہ ہمیشہ دعا گوئی و ثنا خوانی اور

حاضر ہو تو سب ان کی تعریف و توصیف میں لگے رہیں گے اس سلسلے میں پہلا درجہ سلطان کی ذات کا ہے دوسرا خدمت کے لئے آمد و رفت کا تیسرا تعریف و دعا گوئی کا چوتھا یہ کہ ضرورت کے وقت ان کے اغراض میں ان کی مدد کی جائے پانچواں حاضر باشی اور درباداری جلوس کی شرکت چھٹا اظہار محبت و دوستی اور دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی امداد و نصرت، ساتواں ان کے ظلم اور ان کے عیوب اور بداعمالیوں کی پردہ پوشی، اگر کوئی شخص ان میں سے کسی درجہ کے لئے تیار نہیں ہے تو خواہ وہ امام شافعی کے مرتبہ کا ہو یہ لوگ ایک پیسہ بھی ان پر خرچ کرنا گوارا نہیں کریں گے اس لئے اس زمانہ میں ان بادشاہوں سے ایسے مال کا قبول کرنا بھی جائز نہیں جس کے متعلق یہ علم ہے کہ وہ حلال ہے اس لئے کہ اس کے وہ نتائج ہوں گے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے اس مال کا تو کیا ذکر جس کے متعلق معلوم ہے کہ حرام یا مشتبہ ہے اب اگر کوئی شخص ان سلاطین کے اموال کو جرأت کے ساتھ قبول کرتا ہے اور صحابہ و تابعین کی مثال دیتا ہے تو وہ درحقیقت فرشتوں کو لوہاروں پر قیاس کرتا ہے اس لئے کہ ان کے اموال کو قبول کرنے کے بعد ان سے ملنے جلنے اور اختلاط کی ضرورت پیش آئے گی، ان کا لحاظ کرنا پڑے گا، ان کے اہل کاروں اور عمال کی خدمت کرنا پڑے گی اور ان سے دبنا اور ان کے سامنے جھکنا گوارا کرنا پڑے گا، پھر ان کی تعریف اور ان کے در پر حاضری دینے سے چارہ نہیں، اور یہ سب معصیت کی باتیں ہیں۔

جب گذشتہ بیان سے سلاطین کی آمدنی کے ابواب اور ان میں سے حلال و حرام کی ...... تفصیل معلوم ہو گئی تو اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کہ انسان شاہی نذرانوں میں سے اتنا ہی قبول کرے جو حلال ہو اور وہ اس کا مستحق ہے اور وہ رقم اس کے پاس گھر بیٹھے آتی ہو اور کسی حاکم یا ملازم کی تلاش و خدمت اور سلاطین و حکام کی تعریف و تصدیق کی ضرورت بھی نہ پڑے اور ظالموں کی امداد و اعانت کی شرط نہ ہو تو جواز مسئلہ کے اعتبار سے ایسی رقم کا قبول کرنا حرام نہیں ہے لیکن دوسری خرابیوں اور بعد کے نتائج کے لحاظ سے مکروہ ضرور ہے۔[۱]

---

[۱] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۱۲۳۔

ایک دوسری جگہ سلاطین [illegible] ان کے اموال و ظائف و تعلقات کی بابت لکھتے ہیں:

[illegible]	[illegible]
[illegible]	کیونکہ حلال [illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

شخصی سلطنت اور جابر و مستبد بادشاہوں اور خود غرض وزراء و حکام کے اس دور میں کہ جب پوری کی پوری قوم اور اس کے مستقبل اور قسمت سے [illegible] ان کے رحم و کرم پر تھی اور جب شخص پر [illegible] ہو سکتا تھا، امام غزالی کی یہ جرأت اور سلطنت کے نظام [illegible] پر یہ کھلی ہوئی تنقید اور علماء کو سلاطین و حکام کے عطیوں کو قبول نہ کرنے کی ترغیب و تبلیغ اور حکومت سے عدم تعاون اور اظہار ناراضگی یا بے تعلقی کی علامت سمجھی جاتی تھی، ایک ایسا خاص ابھار تھا جس کی قدر کا اندازہ اجتہادات اور تقریروں کی آزادی کے اس عہد اور جمہوری اور دستوری (خواہ برائے نام) دور میں صحیح طور پر نہیں لگایا جا سکتا۔

امام غزالی نے صرف تحریر و تصنیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ جب ان کو بادشاہ وقت سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بھرے دربار میں بھی انھوں نے کلمۂ حق بلند کیا۔ ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا سلطان سنجر [illegible] خراسان کا فرمانروا تھا، امام غزالی نے ملاقات کے وقت اس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

۱ افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی

گردنیں طوق ہائے منت زریں کے بار سے[1]

محمد بن ملک شاہ کو جو سنجر کا بڑا بھائی اور اپنے وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا جس میں اس کو حاکمانہ ذمہ داریوں، خوفِ خدا اور اصلاحِ ملکی کی طرف متوجہ کیا۔[2]

مشرقی سلطنتوں میں چونکہ حکومت کا تمام نظم و نسق وزراء کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور وہی دروبست حکومت کے منتظم اور ذمہ دار ہوتے تھے اس لئے انہی کی اصلاح و توجہ سے مملکت کی اصلاح ہو سکتی تھی، امام غزالی اس حقیقت سے واقف تھے اس لئے انہوں نے سلاطین سے کچھ زیادہ ان کے وزراء کی طرف توجہ کی، ان کو مفصل خطوط و ہدایت نامے لکھے اور بڑی جرأت و صفائی کے ساتھ حکومت کی بے نظمیوں، حقوق کی پامالی، حکام کی مردم آزاری، اہل کاران دولت کی دولت ستانی، ذمہ داروں کی غفلت کی طرف توجہ دلائی اور خدا کا خوف دلا کر اور پچھلے وزراء اور صدور حکومت کا انجام یاد دلا کر اصلاح و تنظیم کی طرف متوجہ کیا، ان کے یہ خطوط شخصی جرأت، اظہار حق اور تاثیر و قوت انشاء و تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

فخر الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"بداں کہ ایں شہر از قحط و ظلم ویران بود و تا خبر تو از اسفرائن و دامغان بود ہمہ بترسیدند و دہقاناں از بیم غلہ می فروختند و ظالماں از مظلوماں عذر می خواستند اکنون کہ اینجا رسیدی ہمہ ہراس و خوف برخاست و دہقاناں و خبازاں بتدریج غلہ و دکان فراز کردند و ظالماں دلیر گشتند اگر کسی کہ ایں شہر بخلاف ایں حکایت می کند دشمن دین است، بداں کہ دعائے مردماں طوس بہ نیکی و بدی مجرب ست و علیہ دلائل نصیحت بس باشد کہ ہم چندیں روز مدت اعمال شد، عبرت برگشتہ بشنوانی، تنہا تلخی با حقیقت آمیز کسی را دل کہ قوی ترا بہر سلاطین و دارالخلافہ گرہ رواست تا ایں سخن بی تو آمد گفت و قدر ایں بشناسی کہ شہا ہا از کسے دیگر نخواہی

---

[1] مکتوبات امام غزالی ص ۱۲ [2] یہ ہدایت نامہ ایک رسالہ کی شکل میں ہے اور نصیحۃ الملوک کے نام سے موسوم ہے چونکہ محمد شاہ کی زبان فارسی تھی اس لئے یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے۔

بدانکہ ہر کسی کہ خبر ایں کند تاکید با ظلم وے حجاب است میان او و کرد حق ۔"

مجیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

" اے فرزند دعید ان خلق بر عموم واجب است کہ کار ظلم از ہمہ گذشتہ و بعد ازاں کہ رسی تا و ای بحال نابود آمد قریب یک سال است کہ از طوس ہجرت کردہ ام تا باشد کہ از مشاہدۂ ظالمان بے رحمت بے حرمت خلاص یابم چوں بحکم ضرورتی معاودت افتاد ظلم ہمچناں متواتر است ۔"

پھر وزراء سابقین کا انجام لکھ کر مجیر الدین کو متنبہ کرتے ہیں :۔

" و بحقیقت شناسد کہ ہیچ وزیرے بدیں پایہ منتفع نبود کہ قمرے سعود نگار ہیچ وزیر آں ظلم و خرابی نہ رفت کہ اکنوں می رود ، واگر چہ بیکارہ است و لیکن در غیر حینے است کہ چوں ظالماں را روز قیامت حاضر کنند ہم متعلقاں و ہم اتباع ایشاں را بہ ظلم گیرند مسلماناں را کہ باستراں و ہیزم حمال گشتند و ہر دیناری کہ قسمت کردند اضعاف آں از رعیت بستدند و سلطاں را ترسیدہ در میانہ از زوال حرماں در ظالماں ہمی روند ۔"

مسلمانوں کے دوسرے طبقے

طبقۂ علماء و طبقۂ سلاطین و حکام کے علاوہ انھوں نے عام زندگی کا بھی جائزہ لیا ہے اس میں جس قدر غیر دینی عناصر ، بدعات و منکرات ، مغالطے اور غلط فہمیاں داخل ہو گئی ہیں ان کی تنقید کی ہے احیاء العلوم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشتغال اور زاہدانہ زندگی کے باوجود وہ اس وقت کی سوسائٹی اور عام زندگی سے واقف ہیں اور ان کا زندگی کا مطالعہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے انھوں نے مسلمانوں کی عمومی زندگی اور امت کے مختلف طبقات اور ان کی مختلف بیماریاں اور کمزوریوں کی جو نشاندہی کی ہے اس سے ان کی قوت مشاہدہ اور قوت نظر کا اندازہ ہوتا ہے انھوں نے ایک مستقل باب ان منکرات کی تفصیل میں

لکھا ہے جو عادات میں داخل ہو چکے ہیں، اور لوگوں کو ان کا منکر (خلافِ شرع و اخلاق) ہونا محسوس نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے پوری شہری زندگی پر نظر ڈالی ہے، اور اس کے نمایاں منکرات کا تذکرہ کیا ہے اور مساجد سے لے کر بازاروں، سڑکوں، حمام اور دعوت کی محفلوں تک کے منکرات کو شمار کرایا ہے۔[1]

انھوں نے احیاء العلوم کا ایک مستقل حصہ (کتاب ذم الغرور) ان لوگوں کے متعلق لکھا ہے جو مختلف قسم کے مغالطوں اور فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ہر طبقہ کے فریب خوردہ اشخاص اور ان کی غلط فہمیوں اور خود فریبیوں کا حال بیان کیا ہے، اور ان کے بعض ایسے نفسیاتی امراض اور خصوصیات کا ذکر کیا ہے جن کو صرف ایک دقیق النظر مصلح اور ایک تجربہ کار ماہر نفسیات ہی دیکھ سکتا ہے۔ اس باب میں انھوں نے علماء، عباد و زہاد و اغنیاء، اور اہل تصوف سب کا جائزہ لیا ہے اور سب کے خصوصی امراض اور بے اعتدالیوں کا پردہ فاش کیا ہے، اور ہر ایک کے متعلق بڑے پتہ کی باتیں لکھی ہیں جس سے ان کی ذہانت و دقیقہ رسی اور حقیقت شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے زمانہ کے علماء نے جن جن علوم کے اشتغال میں حد سے زیادہ غلو کر رکھا تھا، مثلاً فقہی جزئیات و خلافیات، علم کلام و مباحثہ و جدال، وعظ و تذکیر، علم حدیث اور اس کے متعلقات، نحو، لغت، شعر، مفردات کی تحقیق و حفظ میں غلو، یا صوفیاء اور زاہدوں کے ملفوظات و حالات کی یاد رکھنے پر اکتفا، اس سب پر انھوں نے تنقید کی، اور ان کو اپنے ان مضامین کے بارہ میں جو غلط فہمی اور خوش گمانی تھی، اس کی تحقیق کی اور حقیقت حال بیان کی، اور آخر میں اپنا یہ تجربہ بیان کیا، جو بالکل قرین قیاس ہے کہ دنیاوی علوم مثلاً طب و حساب اور صنعتوں کے علم میں اس قدر خوش گمانی اور خود فریبی نہیں ہے جتنی علوم شرعیہ میں ہے، اس لئے کہ کسی شخص کا یہ خیال نہیں ہے کہ دنیاوی علوم فی نفسہ ذریعہ مغفرت ہیں، بخلاف علوم شرعیہ کے کہ وہ اپنے نتائج و مقاصد سے قطع نظر کر کے بھی بجائے خود بھی ذریعہ مغفرت و تقرب سمجھے جاتے ہیں۔[2] اپنے زمانہ کے عباد و زہاد اور اہل تصوف

---

[1] ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین۔ ج ۲ از صفحہ ۲۹۰ تا ۳۱۲

[2] ایضاً ج ۳ صفحہ ۳۳۷

کو بھی انھوں نے بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے اور ان کی بڑی باریک باریک کوتاہیوں، لغزشوں، غلطیوں اور خود فریبیوں کو محسوس کیا ہے ان کے بہت سے ظاہری اعمال و رسوم کی تہ میں ان کو نفس پرستی، جاہ طلبی، ریاکاری، ظاہری نقالی اور بے روح رسمیت نظر آئی ہے اور انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ اس کو ظاہر کر دیا۔[1]

اہل دولت اور اغنیاء پر بھی انھوں نے بڑی سخت گرفت کی ہے اور اس سلسلہ میں ان کے قلم سے حقائق نکل گئے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں:-

"اہل دولت متمول میں بہت سے لوگوں کو حج پر روپیہ خرچ کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے، وہ بار بار حج کرتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو بھوکا چھوڑ جاتے ہیں اور حج کرنے چلے جاتے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صحیح فرمایا ہے کہ آخیر زمانہ میں بے ضرورت حج کرنے والوں کی کثرت ہوگی، سفر ان کو بہت آسان معلوم ہوگا، روپیہ کی ان کے پاس کمی نہ ہوگی اور وہ حج سے محروم و تہی دست واپس آئیں گے، وہ خود ریتوں اور چٹیل میدانوں کے درمیان سفر کرتے پھریں گے اور ان کا ہمسایہ ان کے پہلو میں گرفتار بلا ہوگا، اس کے ساتھ کوئی سلوک اور غمخواری نصیب نہ کریں گے"

ابو نصر تمار کہتے ہیں کہ ایک شخص بشر بن الحارث کے پاس آئے اور کہا کہ میرا قصد حج کا ہے آپ کا کچھ کام ہو تو فرمائیے، انھوں نے فرمایا کہ تم نے خرچ کے لئے کیا رکھا ہے؟ اس نے کہا دو ہزار درہم، بشر نے کہا کہ تمہارا حج سے مقصد کیا ہے، اظہار زہد، شوق کعبہ یا طلب رضا؟ اس نے کہا طلب رضا، انھوں نے فرمایا کہ اچھا اگر تمہیں ایسی تدبیر بتلادوں کہ تم گھر بیٹھے اللہ کی رضا حاصل کر لو، دو ہزار درہم خرچ کر دو اور تم کو یقین ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو گئی تو کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ اس نے کہا ہاں کیوں نہیں، فرمایا اچھا تو جاؤ اور اس مال کو ایسے دس آدمیوں کو دے آؤ جو مقروض ہیں، وہ اس سے اپنا قرض ادا کریں، فقیر اپنی حالت درست کرلے، صاحب عیال اپنے بال بچوں کا سامان کرلے، یتیم کا منتظم یتیم کو کچھ دے کر اس کا دل خوش کرے اور

---

[1] ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین ج ۳، از ص ۳۴۵ تا [illegible]

اگر تمہاری غیبت گوارا کرے تو ایک ہی کیا پورا مال دے آؤ اس لئے کہ مسلمان کے دل کو خوش کرنا بیکس کی امداد کسی کی مصیبت دور کرنا کمزور کی اعانت سو نفل حجوں سے افضل ہے، جاؤ جیسا میں نے تم سے کہا ہے ویسا ہی کرکے آؤ ورنہ اپنے دل کی بات ہم سے کہہ دو اس نے کہا کہ شیخ سچی بات یہ ہے کہ سفر کا رجحان غالب ہے۔ بشرؒ ہنس کر مسکرائے اور فرمایا کہ مال جب گندہ اور مشتبہ ہوتا ہے تو نفس تقاضا کرتا ہے کہ اس سے اس کی خواہش پوری کی جائے اور وہ اس وقت اعمال صالحہ کو سامنے لاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عہد فرمایا ہے کہ صرف متقین کے عمل کو قبول فرمائے گا۔[1]

دولت مندوں کا ایک گروہ بربنائے بخل دولت کی حفاظت میں مشغول رہتا ہے اور ایسی بدنی عبادات اس کو کسی پیسہ پھوٹتا ہے جن میں کچھ خرچ نہیں مثلاً دن کا روزہ رات کی عبادت ختم قرآن وغیرہ میں مشغول ہیں اس لئے کہ بخل ان کے باطن پر مستولی ہے اور اس کے ازالہ کے لئے مال کے خرچ کرنے کی ضرورت ہے لیکن وہ ایسے اعمال میں مشغول ہیں جس کی ان کو کوئی خاص ضرورت نہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کے کپڑے کے اندر سانپ گھس گیا ہے اور اس کا کام تمام ہونے والا ہے اور وہ سکنجبین کے تیار کرنے میں مشغول ہے تاکہ صفرا کو تسکین ہو بھلا جو سانپ کا مارا ہے اس کو سکنجبین کی ضرورت کب پڑے گی؟ بشرؒ سے کسی نے کہا کہ فلاں دولت مند کثرت سے روزہ رکھتا ہے اور نمازیں پڑھتا ہے انہوں نے فرمایا کہ بیچارہ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں مشغول ہے اس کے مناسب حال تو یہ تھا کہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا، مسکینوں پر خرچ کرتا یہ اس سے افضل تھا کہ اپنے نفس کو بھوکا رکھتا ہے اور اپنے لئے نفلی نمازیں پڑھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دنیا بھی سمیٹنے میں مشغول ہے اور فقیروں کو محروم رکھتا ہے۔[2]

عوام کے امراض اور خود فریبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۴۱۵

[2] ایضاً ج ۳ ص ۴۱۵

عوام دولت مندوں اور فقراء میں سے کچھ لوگ ہیں جن کو مجالس وعظ کی شرکت سے دھوکا لگا ہے ان کا اعتقاد ہے کہ محض ان مجالس میں شرکت کافی ہے انھوں نے اس کو ایک معمول بنا لیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ عمل اور نصیحت پذیری کے بغیر بھی محض مجلس وعظ میں شرکت باعث اجر ہے وہ بڑے دھوکے میں مبتلا ہیں اس لئے کہ مجلس وعظ کی فضیلت محض اس لئے ہے کہ اس سے خیر کی ترغیب ہوتی ہے اگر اس سے خیر کی آمادگی اور اس کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا تو اس میں کچھ خیر نہیں ترغیب بھی اس لئے محمود ہے کہ وہ عمل کی محرک ہے اگر اس میں عمل پر آمادہ کرنے کی قوت نہیں تو اس میں بھی کوئی خیر نہیں جو چیز کسی مقصد کا ذریعہ ہوتی ہے اس کی قیمت محض مقصد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے ہے اگر وہ مقصد اس سے پورا نہ ہو تو وہ بے قیمت ہے کبھی واعظ سے مجلس وعظ اور گریہ وبکا کی فضیلتیں سن کر اس کا دھوکا ہوتا ہے کبھی کبھی اس پر عورتوں کی طرح ایسی رقت طاری ہوتی ہے اور وہ رونے لگتا ہے لیکن عزم کا کہیں پتہ نہیں ہوتا کبھی کبھی کوئی ڈرانے والی بات سنتا ہے اور وہ تالیاں پیٹتا ہے اور کہتا ہے الٰہی تو بچا خدایا تیری پناہ اور وہ سمجھتا ہے کہ اس نے حق ادا کر دیا حالانکہ وہ وہم کرتا ہے اس کی مثال اس مریض کی سی ہے جو کسی طبیب کے مطب میں بیٹھتا ہے اور نسخے سنتا رہتا ہے لیکن اس سے اس کو صحت نہیں ہو سکتی یا ایک بھوکا آدمی کسی سے کھانے کے انواع و اقسام کی فہرست سنتا ہے اس سے اس کی بھوک نہیں مٹ سکتی اور اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا اسی طرح سے طاعات و اعمال کی تشریح وتفصیل کا سننا اور پڑھنا ان کے بیان کچھ کام نہیں آئے گا اسی طرح سے ہر وعظ جو تمہاری حالت میں ایسا تغیر نہ پیدا کرے جس سے تمہارے اعمال میں تغیر ہو جائے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف انابت اور رجوع اور توبہ (صحیح) پیدا ہو اور دنیا سے بے رغبتی اور اعراض پیدا ہو وہ وعظ تمہارے لئے وبال اور تمہارے خلاف ایک دلیل کا کام دے گا اگر تم خالی وعظ کو وسیلۂ نجات اور ذریعہ مغفرت سمجھتے ہو تو دھوکہ کھایا۔[لہ]

[لہ] احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۳۱۵

ایک اصلاحی و تربیتی کتاب

لیکن احیاء العلوم نری تنقیدی کتاب نہیں ہے، وہ اصلاح و تربیت کی ایک جامع اور مفصل کتاب ہے اس کے مصنف نے ایک ایسی کتاب تالیف کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک طالب حق کے لئے اپنی اصلاح و تربیت اور دوسروں کی تعلیم و تبلیغ کے لئے تنہا کافی ہو سکے اور بڑی حد تک ایک ایسے اسلامی کتب خانہ کی قائم مقامی کر سکے اور دینی زندگی کا دستور العمل بن سکے، اس لئے یہ کتاب عقائد و فقہ[1]، تزکیۂ نفس و تہذیب اخلاق اور حصول کیفیت احسانی (جس کے مجموعہ کا نام تصوف ہے) تینوں شعبوں کی جامع ہے اس کتاب کی ایک نمایاں صفت اس کی تاثیر ہے، مولانا شبلی کے اس تاثر میں ہزاروں پڑھنے والے شریک ہوں گے کہ "احیاء العلوم میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چبھ جاتا ہے، ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے، ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے" اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانہ میں لکھی گئی[2] خود امام صاحب تاثیر کے نشہ میں سرشار تھے

مصنف کے ان حالات و کیفیات کا (جو اس سفر اور کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ان پر طاری تھیں اور جن سے یہ کتاب متاثر ہوئی ہے) پڑھنے والوں پر بعض اوقات یہ اثر پڑتا ہے کہ دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو جاتا ہے، زہد و تقشف کا ایک شدید اور بعض اوقات غیر معتدل رجحان پیدا ہوتا ہے، خوف و خشیت کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو بعض کی صحت و مشاغل پر اثر انداز ہوتی ہے، یہی اس کا نتیجہ ہے کہ خود مصنف پر اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں خشیت کا غلبہ تھا اس لئے بہت سے مشائخ مبتدیوں کو اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ نہیں دیتے، اعتدال کا اصل معیار قرآن ہی ہے، صحیح و معروف سیرت نبوی اور احادیث

---

[1] امام غزالی چونکہ شافعی ہیں اور فقہ شافعی کا اس زمانہ میں زور بھی تھا، اس لئے اس کتاب میں انھوں نے فقہ شافعی کو اختیار کیا ہے۔

[2] الغزالی ص ۴۴

سے مجموعہ کے مطالعہ اور کسی نمونۂ کامل کی صحبت و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

احیاء العلوم اور فلسفۂ اخلاق

امام غزالی صرف ایک بلند پایہ فقیہ، ایک صاحبِ اجتہاد متکلم اور ایک صاحبِ دل صوفی نہیں ہیں، اجتماعیات اسلامی اور فلسفۂ اخلاق کے ایک نامور مصنف اور ایک دقیق النظر اور نکتہ رس ماہرِ اخلاق و نفسیات بھی ہیں، اخلاق اسلامی اور فلسفۂ اخلاق کی کوئی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی[1]، احیاء العلوم اس موضوع پر بھی ان کا ایک کارنامہ ہے، امراضِ قلب اور کیفیاتِ نفسانی پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی دقتِ نظر اور سلامتِ فکر کا نمونہ ہے، یہاں اس کا بھی ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

حبِ جاہ

احیاء العلوم میں "بیان سبب کون الجاہ محبوباً بالطبع حتی لا یخلو عنہ قلب الا بشدید المجاھدۃ" (جاہ انسان کو کیوں طبعی طور پر محبوب ہے، یہاں تک کہ شدید مجاہدہ کے بغیر کسی قلب کا بھی اس سے خالی ہونا مشکل ہے) کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:۔

> معلوم ہونا چاہیے کہ جس بناء پر سونا چاندی اور مال کی بقیہ اقسام محبوب ہیں، بعینہٖ اسی بناء پر جاہ بھی محبوب ہوتا ہے، بلکہ جس طرح سونا چاندی سے زیادہ محبوب ہے، گو وہ مقدار میں برابر کیوں نہ ہوں، اسی طرح جاہ کو زیادہ فوقیت حاصل ہونا چاہیے، ہم آپ کو یہ سمجھا چکے ہیں کہ درہم و دینار کی ذات میں کوئی غرض اور منفعت نہیں، اس لئے نہ وہ کھانے کے کام کے ہیں، نہ پینے کے، نہ شادی بیاہ کے، نہ پوشاک لباس کے، اپنی

---

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ استاذ جامعۃ القاہرہ کی تصنیفات "تاریخ الاخلاق" اور "فلسفۃ الاخلاق فی الاسلام وصلاتہا بالفلسفۃ الاغریقیۃ"

ذات کے لحاظ سے تو وہ اور کنکریاں برابر ہیں لیکن ان دونوں کی کشش اور محبوبیت محض اس بنا پر ہے کہ وہ محبوبات کا ذریعہ اور خواہشات کی تکمیل کا سامان ہیں، یہی معاملہ جاہ کا ہے، اس لئے کہ جاہ دلوں کی تسخیر کا نام ہے، اور جس طرح سے سونے چاندی کی ملکیت ایسی قدرت عطا کرتی ہے جس سے انسان اپنے تمام اغراض و مقاصد تک پہونچ سکتا ہے، اسی طرح سے بندگان خدا کے قلوب کی تسخیر تمام اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر سونا چاندی اور جاہ انسان کو محبوب ہے۔

لیکن محبوبیت میں شریک ہونے کے ساتھ جاہ کو مال پر کئی وجوہ سے ترجیح حاصل ہے، اور اس کی محبوبیت مال کی محبوبیت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، اس کے تین نمایاں اسباب ہیں، پہلا سبب تو یہ کہ جاہ کے ذریعہ سے مال تک پہونچنا مال کے ذریعہ سے جاہ تک پہونچنے کے مقابلہ میں آسان ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک عالم یا زاہد جس کا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے، اگر مال حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں، اس لئے کہ لوگوں کی مال و دولت ان لوگوں کے دلوں کے تابع ہوتے ہیں اب اگر ان کے دل کسی کے تابع ہو جائیں تو ان کے مال بھی اسی کے تابع ہو جائیں گے اور وہ اپنی دولت بھی اسی کے قدموں پر نثار کر دیں گے، اس کے برخلاف ایک کم رتبہ اور ذلیل آدمی جس میں کمال کی کوئی صفت نہیں ہے، اگر اس کو کوئی خزانہ بھی مل جائے اور اس کو وہ جاہ حاصل نہیں ہے جس سے وہ اپنے مال کی حفاظت کر سکے، مگر اس مال کے ذریعہ جاہ تک پہونچنا چاہے گا تو نہیں پہونچ سکے گا اسی لئے کہ جاہ مال کا آلہ اور وسیلہ ہے، جو جاہ کا مالک ہے، وہ بآسانی مال کا بھی مالک بن سکتا ہے، لیکن جو مال کا مالک ہے وہ ہر حالت میں جاہ کا مالک نہیں بن سکتا، اس لئے جاہ مال سے زیادہ محبوب ہوا

دوسرا سبب یہ ہے کہ مال کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی آزمائش میں آ جائے، چوری یا غصب کے ذریعہ تلف ہو جائے، بادشاہ اور ظالم بھی اس کی تاک میں لگے رہتے ہیں، پھر اس کو محافظوں، پہرہ داروں اور محفوظ مستقروں کی ضرورت ہے، پھر بھی اس کے لئے ہزاروں خطرے ہیں، لیکن دل جب کسی کا غلام بن جائیں

قرآن کے لئے کوئی آفت نہیں وہ دراصل محفوظ خزانے ہیں جو چوروں غارت گروں اور غاصبین کی دست رس سے باہر ہیں ملکیتوں میں سب سے محفوظ ملکیت زمین اور جائداد ہے لیکن اس میں بھی غاصبانہ اور ظالمانہ دراندازیوں کا خطرہ بنا رہتا ہے اور حفاظت کی ہر گھڑی ضرورت ہے لیکن دلوں کے خزانے خود ہی محفوظ و مامون ہیں اور جاہ کو کسی غصب یا سرقہ کا خطرہ نہیں ہاں دلوں پر بھی تھوڑا بہت تصرف کیا جا سکتا ہے اور جس سے عقیدت مندی ہے اس کی طرف سے اعتقاد پھیرا جا سکتا ہے اور بدگمانی پیدا کی جا سکتی ہے لیکن اس کا ازالہ مشکل نہیں ہے اور ایسا عمل ہر ایک کے لئے آسان نہیں۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ قلوب کی ملکیت میں از خود اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کے لئے کسی محنت و جفاکشی کی ضرورت نہیں اس لئے کہ قلوب جب کسی شخص کے علم یا عمل کی وجہ سے اس کے مطیع ہو کر اور معتقد ہو جاتے ہیں تو زبانیں اس کے کمالات کا ذکر چھیڑنے لگتی ہیں لوگ دوسروں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور سننے والے دل اس کے معتقد ہو جاتے ہیں اسی بنا پر انسان طبعی طور پر شہرت اور نام وری کا دلدادہ ہے اس لئے کہ جب اس کا چرچا دوسرے شہروں اور ملکوں میں ہوتا ہے تو نئے دل شکار ہوتے ہیں اور اس کے حلقہ بگوش بنتے ہیں اسی طرح اس کی محبت و عظمت ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے اور کہیں جا کر رکتی نہیں برخلاف مال کے کہ جو جتنی مقدار کا مالک ہے اس کا ملک ہے اس میں بغیر محنت اور جانفشانی کے اضافہ نہیں ہو سکتا لیکن جاہ تو خود بخود نمو پذیر ہے اور اس کی کوئی حد نہیں مال میں ٹھہراؤ اور جمود ہے جاہ پھیلتا پھولتا رہتا ہے اسی لئے جب جاہ میں ترقی ہو جاتی ہے اور شہرت عام حاصل ہو جاتی ہے اور لوگ کسی شخص کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں تو مال و دولت اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتی ہے یہ مال کے بجائے جاہ کو ترجیح کے نمایاں اسباب ہیں اگر تفصیل کی جائے تو اور بہت سے وجوہ نکلیں گے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو مال و جاہ سے اسی قدر محبت ہونی

چاہیے کہ ان کے ذریعہ لذتیں حاصل کرکے اپنی کلفتیں دور کرے، اسی لئے کہ مال و جاہ محبوبات کا ذریعہ ہیں اور محبوبات کے حصول کا ذریعہ بھی محبوب ہوتا ہے لیکن یہاں کیا وجہ ہے کہ بات یہیں جا کر نہیں رکتا اور انسان اموال کے جمع کرنے خزانہ پر خزانہ اور ذخیرہ پر ذخیرہ کرنے میں مصروف رہتا ہے یہاں تک کہ وہ ضروریات کی سرحد کو بھی پار کر جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا وہ حال ہو جاتا ہے جو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر بندے کے پاس سونے کی دو گھاٹیاں ہوں تو وہ تیسری کا خواہشمند ہوگا اسی طرح سے انسان جاہ میں وسعت و ترقی کی فکر میں رہتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شہرت ان دور دراز ملکوں تک بھی پہونچ جائے جن کے متعلق وہ قطعی طور پر جانتا ہے کہ وہ ان ملکوں میں کبھی قدم بھی نہیں رکھے گا، اور کبھی وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کی بھی سبیل نہیں کہ ان کی تعظیم سے اس کو خوشی حاصل ہوگی یا وہ اپنی دولت اس پر خرچ کریں گے یا اس کی غرض برآری کریں گے یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کو اس چیز کی خوشی حاصل ہوتی ہے اور دل میں اس کا مزہ لیتا رہتا ہے کہ اس کا ان ملکوں میں چرچا ہوا اور اس کو وہاں جاہ حاصل ہو، بظاہر یہ ایک حماقت کی بات معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسی چیز کی خواہش ہے جس کا دنیا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی جاہ کی ایسی محبت دلوں کی ایک طبعی کیفیت ہے جس کا ازالہ ممکن نہیں اس کے دو سبب ہیں ایک جلی جس کا ادراک سب کرسکتے ہیں ایک خفی جو بڑا سبب ہے لیکن اتنا باریک کہ کوئی ذہین ذکی بھی اس کو بمشکل محسوس کر سکتے ہیں اس لئے کہ اس کا تعلق نفس و طبیعت کی ایک ایسی خاصیت سے ہے جس کا علم باریک بین اور ان اشخاص کو ہے جو طبائع انسانی کی گہرائیوں میں غوطہ لگا سکتے ہیں۔

پہلا سبب تو یہ ہے کہ انسان فطرۃً سب کے بارہ میں بدگمان واقع ہوا ہے اور خطرات کو دور کرنا چاہتا ہے

ع عشق است و ہزار بدگمانی

انسان کی بسر اوقات کے لئے خواہ ضروری سامان موجود ہو لیکن اس کی آرزو یہی ہوتی

حاصل ہوتی ہیں اس کے دل میں بار بار یہ خطرہ گذرتا ہے کہ جو مال فی الحال اس کی ضروریات کے لئے کافی ہے شاید ضائع ہو جائے اور اس کو دوسرے مال کی ضرورت ہو جب اس کے دل میں اس کا خیال آتا ہے تو اس کے دل میں فکر و غم کا جوش اٹھتا ہے یہ تشویش اس وقت ہی دور ہو سکتی ہے جب اس کو دوسرے مال کے مل جانے سے اطمینان حاصل ہو جائے کہ اگر یہ پہلا مال ضائع ہو گیا یا اس پر کوئی آفت آئی تو یہ دوسرا مال موجود ہے۔ آدمی اپنی ذات سے دلچسپی اور زندگی کی محبت کی بنا پر اپنی زندگی کو بہت طویل اندازہ لگاتا ہے اور مستقبل کی ضرورتوں کے پیش آنے کا وہم رکھتا ہے اور نئے نئے خطروں اور نئی نئی آفتوں کو فرض کرتا رہتا ہے اور ان کے تصور سے لرزہ براندام رہتا ہے اس لئے ان خطروں کو زائل کرنے کے وسائل سوچتا رہتا ہے اور ان کا سب سے بڑا وسیلہ اس کی نظر میں یہ ہے کہ مال اتنا کثیر ہو کہ اگر اس کے کسی حصہ پر کوئی آفت پڑے تو دوسرے حصہ سے وہ اپنا کام نکال سکے یہ خوف اور فکرمندی اس کو مال کی کسی مخصوص مقدار پر قانع نہیں ہونے دیتی اور وہ کسی حد پر بھی جا کر نہیں ٹھہرتا یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی ملک بنا لینے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ دو بھوکے ایسے ہیں جو کبھی سیر نہیں ہوتے علم کا حریص اور مال کا حریص یہی حال عظمت دور دراز کے شہروں اور بستیوں کے لوگوں کے دلوں میں اعتقاد اور جاہ پیدا ہونے کی خواہش میں ہوتی ہے، حب جاہ کا مریض بھی ان خیالی خطرات کو سوچتا رہتا ہے جو پیش آ سکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑے، ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اس کے شہر میں آ جائیں اور اس کو ان سے کام پڑ جائے اور جب تک یہ سب کچھ ممکن ہے اور یہ کوئی ناممکن الوقوع بات نہیں ہے کہ اس کو ان کی ضرورت پڑے نفس کو اس بات کی فرحت و لذت ہوتی ہے کہ اس کا اعتقاد اور عظمت ان بعید الوطن لوگوں کے دل میں قائم ہے جن سے کبھی کام پڑ سکتا ہے۔

دوسرا سبب جو زیادہ دقیق ہے وہ یہ ہے کہ روح ایک امر ربانی ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي "امر ربانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ علوم مکاشفہ کے اسرار میں سے ہے اور اس کے اظہار کی اجازت نہیں یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روح کی حقیقت کا اظہار نہیں فرمایا لیکن اس کی حقیقت کا علم حاصل کئے بغیر بھی تم کو اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ قلب میں ایک تو بہیمی صفات (کھانے پینے اور جماع) کا میلان پایا جاتا ہے ایک میلان درندوں کی صفت (قتل و ضرب و ایذا) کا، اور ایک شیطانی صفات (مکر و فریب) کا اور اسی کے ساتھ ایک میلان صفت ربوبیت (کبر و عظمت عزت تجبر اور سربلندی) کا بھی پایا جاتا ہے اس لئے کہ قلب انسانی مختلف اصول و عناصر سے مرکب ہے جس کی شرح و تفصیل میں بڑی طوالت ہے تو قلب میں امر ربانی کا جو حصہ ہے اس کی بنا پر انسان کے اندر طبعی طور پر ربوبیت کی خواہش پائی جاتی ہے ربوبیت کیا ہے؟ کمال میں یکتائی اور مستقل وجود کسی کا شرمندۂ احسان نہ ہونا اس لئے کمال صفات الوہیت میں سے ہے اور وہ انسان کو بالطبع محبوب ہے اور کمال یہی ہے کہ وجود میں یکتا ہو اس لئے کہ وجود میں کسی اور کی شرکت یقیناً ایک نقص ہے آفتاب کا کمال یہ ہے کہ وہی ایک آفتاب ہے اگر کوئی دوسرا آفتاب ہوتا تو یہ اس آفتاب کے چہرۂ کمال کے لئے داغ ہوتا اس لئے کہ وہ اپنی شان آفتابی میں یکتا نہ ہوتا، وجود کی یکتائی اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کو حاصل ہے اس لئے اس کے ساتھ کوئی موجود (حقیقی) نہیں اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے جو اپنے بل بوتے پر نہیں رہ سکتا وہ اسی کے سہارے قائم ہے تو درحقیقت اس کے ساتھ کوئی موجود ہی نہیں اس لئے کہ معیت کے لئے رتبہ کی مساوات ضروری ہے اور رتبہ کی مساوات کمال کے لئے نقص ہے کمال وہی ہے جس کا کوئی ہم مرتبہ نہ ہو اور جس طرح سے آفتاب کے نور کا انبساط آفاق عالم میں آفتاب کا نقص نہیں بلکہ اس کا کمال ہے آفتاب کے لئے نقص تو دوسرے ہم مرتبہ آفتاب کا وجود ہے جبکہ اس کی ضرورت بھی نہیں اسی طرح سے عالم میں ہر چیز کا وجود انوار ربوبیت کی تابش کا نشان

ہے یہ سب عالم میں ظہور تام نہیں پس ربوبیت کی شان وجود کی یکتائی ہے اور یہی کمال ہے، انسان بھی بالطبع اس بات کا خواہشمند ہے کہ وہ کمال میں یکتا ہو، بعض مشائخ صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ہر شخص کے باطن میں وہی بات مضمر ہے جس کو فرعون نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "انا ربکم الاعلیٰ" لیکن اس کو اس کا موقع نہیں ملتا[لہ] محبوبیت نفس اسی لئے نفس پر شان ربوبیت اسی لئے طلب بلا واسطہ ہوتی ہے یہ اسی نسبت ربانی کی وجہ سے ہے جس کی طرف "نفخت فیہ من روحی" میں اشارہ ہے۔

لیکن جب انتہائے کمال تک پہونچنے سے عاجز رہا تو اس کے کمال کی خواہش بالکلیہ زائل نہیں ہوئی اب بھی وہ کمال کا خواہشمند اور محتاج ہے اور اسی کمال سے بالذات لذت حاصل ہوتی ہے کمال کے علاوہ کسی اور مقصود کی خاطر نہیں (جس کا کمال ذریعہ ہو) بلکہ نفس کمال کی خاطر دنیا میں جو بھی موجود ہے اس کو اپنی ذات سے محبت اور اپنی ذات کے کمال سے محبت ہے اور ہر ایک کو حرکت اور فنا نامرغوب ہے اس لئے کہ اس میں اپنی ذات اور اپنی صفات کمال کا فنا سمجھتا ہے کمال تو یہی ہے کہ وجود میں یکتائی حاصل ہو اور تمام موجودات پر غلبہ اور حکمرانی اسی لئے کامل ترین کمال یہ ہے کہ دوسرے کا وجود تمہارا ہی رہین منت ہو اگر وہ تمہارا رہین منت نہیں ہے تو کم از کم اتنا ہو کہ تم اس پر غالب ہو، اسی بنا پر سب پر غلبہ حاصل کرنا انسان کو طبعی طور پر محبوب ہے اس لئے کہ یہ کمال کی ایک قسم ہے ہر موجود جو اپنی ذات کا شناسا ہے وہ اپنی ذات کا عاشق ہے اور اپنی ذات کے کمال کا بھی عاشق ہے اور اس سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے اگر کسی چیز پر غلبہ کے معنی یہ ہیں کہ تم اس پر اثر ڈال سکو اپنے ارادہ کے مطابق اس میں تغیر کر سکو اور اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کرو انسان چاہتا تو یہ تھا کہ اس کو تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہو جائے لیکن موجودات میں سے کچھ موجود ایسے ہیں

[لہ] مولانا روم نے اسی مضمون کو بیان کیا ہے۔

نفس ما را کمتر از فرعون نیست ۔۔۔ لیک او را عون ما را عون نیست

کسی تغیر کو قبول نہیں کرتے جیسے اللہ کی ذات و صفات اور بعض موجود ایسے ہیں جو تغیر کو قبول کرتے ہیں لیکن ان پر مخلوق کی کوئی دسترس نہیں یا جس پر ان کا کوئی زور نہیں چلتا جیسے افلاک کواکب کرے، سماوی نفوس، ملائکہ، جن و شیاطین اور جیسے پہاڑ، سمندر اور ہوا کے بیچ کی چیزیں، تیسری قسم وہ ہے جس میں انسان اپنی قدرت سے تغیر کر سکتا ہے جیسے زمین اور اس کے اجزاء، معدنیات، نباتات، حیوانات اور انہی میں سے انسانوں کے عمل بھی ہیں جو بدن ہی کی طرح نافذ اور تغیر قبول کرتے ہیں۔ جب موجودات کی ایک قسم وہ ہوئی جن پر انسان تصرف کی قدرت رکھتا ہے، جیسے ارضیات اور ایک وہ جن پر قدرت نہیں رکھتا جیسے ذات الٰہی، ملائکہ، افلاک تو انسان کے اندر اس کی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کم سے کم آسمانوں کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے، ان کی حقیقت کو سمجھے اور ان کے اسرار کو تلاش کرے، اس لئے کہ یہ بھی ایک طرح کا غلبہ ہے اس لئے جس کا پورا پورا علم حاصل ہو جاتا ہے وہ علم کے ماتحت ہو جاتا ہے اور عالم ایک طرح سے غالب کی شان رکھتا ہے گویا اس علم سے اس کے جذبہ حکومت و استعلاء کی کسی درجہ میں تسکین ہو جاتی ہے، اسی بناء پر اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت، ملائکہ، افلاک کواکب، عجائب سماوات، سیاروں اور سمندروں کے عجائبات وغیرہ کے علم کا شوق ہوتا ہے اس لئے کہ یہ ایک طرح کا تغلب ہے اور تغلب کمال کی ایک قسم ہے، اسی بناء پر تم دیکھتے ہو گے کہ جو شخص کوئی عجیب چیز بنا نہیں سکتا ہو وہ کم سے کم اس کے بنانے کا طریقہ جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے گویا اس طرح سے وہ صنعت کی خواہش کی تسکین کرتا ہے، جو شطرنج وضع کرنے سے عاجز ہے وہ کم سے کم شطرنج کھیلنے کا طریقہ سیکھ لینا چاہتا ہے اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ شطرنج کیسے بنائی گئی ہے، جو شخص کسی ہندسہ یا شعبدہ یا جرثقیل بنانے کو دیکھتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسا آلہ بنانے سے قاصر ہے تو وہ اس کے بنانے کی کیفیت جاننا چاہتا ہے، اس کو اپنے اس عجز سے تکلیف اور علم کے کمال سے لذت حاصل ہوتی ہے گویا وہ اس کمی کو اس سے پورا کرنا چاہتا ہے۔

دوسری قسم جس پر انسان قدرت حاصل کرسکتا ہے جیسے نباتات وغیرہ تو وہ بھی طبعی طور پر ان پر غلبہ اور اپنی قدرت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ ان میں اپنی اختیار کے مطابق تصرف کرسکے ان کی بھی دو قسمیں ہیں اجسام اور ارواح۔ اجسام تو وہ ہیں جیسے سامان ہے لوہا لکڑی ان میں تو انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو وہ ان کو اٹھا بٹھا سکے جس کو چاہے جس کو چاہے خریدے اس لئے کہ یہ قدرت ہے اور قدرت کمال ہے اور کمال مناسب ربوبیت کے ہے اور ربوبیت بالطبع محبوب ہے اسی لئے اس کو اموال کی محبت ہوتی ہے کہ اس کو اپنے قبضہ میں کرلے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کبھی بھی اس کی ضرورت ہو اسی طرح سے غلام رکھنا اور آزاد شریف لوگوں کو اپنا غلام بنانا خواہ زبردستی اور غلبہ سے ہو یہاں تک کہ ان کے اجسام اور ان کی ذلت میں تصرف کرسکے یعنی بیگار لے سکے چاہے ان کے دل غلام نہ بھی ہوں اسی لئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی غلام کے دل میں اس کا اعتقاد نہیں ہوتا اور اس کو اس سے محبت نہیں ہوتی لیکن پھر بھی محض غلبہ کی محبت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے انسان کو ایسا بھی غلبہ بھی پسندیدہ اور مرغوب ہے جو زبردستی کی بنا پر ہو اس لئے کہ اس میں ایک قسم کا کمال پایا جاتا ہے اور انسان اس کا دلدادہ ہے۔

دوسری قسم آدمیوں کے نفوس اور قلوب ہیں اور یہ روئے زمین کی سب سے زیادہ بیش قیمت اور نفیس چیز ہے اور انسان چاہتا ہے کہ اس کو ان قلوب پر غلبہ و قدرت حاصل ہو جائے تاکہ وہ اس کے لئے مسخر ہو جائیں اور اس کے ایک اشارہ پر کام کریں اس لئے کہ اس میں غلبہ کا کمال پایا جاتا ہے اور صفات ربوبیت کے مناسب ہے قلوب صرف محبت سے مسخر ہوتے ہیں اور محبت کمال کے اعتقاد سے پیدا ہوتی ہے چاہے کوئی کمال حقیقی ہو اور کمال اس لئے محبوب ہے کہ وہ صفات الٰہیہ میں سے ہے اور صفات الٰہیہ سب انسان کو بالطبع محبوب ہیں اس لئے کہ انسان میں ایک نسبت ربانی پائی جاتی ہے اور یہ نسبت غیر زائل ہے نہ موت اس کو ختم کرسکتی ہے اور نہ مٹی اس پر قابو پا سکتی ہے یہی نسبت ہے ایمان و معرفت کا محل ہے وہی جناب الٰہی تک پہنچنے والی ہے اور وہی اس کے لئے کوشش کرنے والی ہے جو اس کے معنی مطلوب کا مشتاق ہے اور جس کے لئے موجب

ہوگئی، اس کو ان پر قدرت و استیلاء حاصل ہوگیا، وہ قدرت و استیلاء کمال ہے اور از قبیل صفات ربوبیت میں سے ہے، اسی لئے اس کی طلب کو محبوب بالطبع ہے، اور کمال ہے تو علم سے حاصل ہو وہ [illegible] مال و جاہ [illegible] موت کا وسیلہ ہیں اور کسب وسیلہ [illegible] باقیات صالحات کی اپنی اصطلاح میں ہے، دولت کی کوئی اہمیت نہیں اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ ایک چیز بھی دنیا میں باقی نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ [illegible] ایک چیز بھی دنیا میں ہے تو وہ یہی ہے جو علم سے حاصل کی جاسکتی ہے [illegible] ورنہ نفس کو زوال نہیں، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو حریص کبھی آسودہ نہیں ہوتے۔[1]

محاسبۂ نفس

کتاب کا موثر ترین حصہ وہ ہے جہاں امام غزالی نصیحت اور ترغیب و ترہیب پر قلم اٹھاتے ہیں، اور دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی عظمت، ایمان و عمل صالح کی ضرورت، اصلاح و تہذیب نفس کی اہمیت اور امراض قلبی و نفسانی کی مضرت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، اس حصہ میں وہ بیک وقت ایک فقیہ، ایک بلیغ واعظ، ایک نکتہ شناس حکیم اور ایک تجربہ کار و ماہر نفسیات مصلح کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جو اپنے مخاطبین کے حالات اور کمزوریوں اور ضرورتوں سے خوب واقف ہے، وہ ان کی طرف سے ان کی بہتر وکالت کرتا ہے اور بڑی قابلیت اور انصاف کے ساتھ ان کے عذر اور دلائل پیش کرتا ہے، پھر ایک ماہر نفس و عالم نفسیات کی طرح ان میں سے ایک ایک کا جواب دیتا ہے، پھر ایک شفیق مصلح اور ایک خیر خواہ مربی کی طرح ان کا علاج تجویز کرتا ہے، اسی لئے ان کے مواعظ صرف واعظانہ تاثیر ہی کا نمونہ نہیں، حکمت و بلاغت کا بھی نمونہ ہیں، ہر دور میں ہزاروں آدمیوں نے ان کے مواعظ و مکاشفات سے فائدہ اٹھایا ہے اور کثیر تعداد آدمیوں کی اصلاح و انقلاب کا ذریعہ بنے ہیں، کتاب کے آخری چوتھائی حصہ (ربع المنجیات) میں اس کا بڑا ذخیرہ ہے، یہاں اس کا ایک اقتباس

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۲۴۳ ، ۲۴۴

پیش کیا جاتا ہے جہاں انھوں نے نفس کو زجر و توبیخ کی ہے اور پڑھنے والوں کو تعلیم دی ہے کہ ان کو اپنے نفس سے کس طرح مکالمہ کرنا چاہیے اور منزل آخرت کے لئے کس طرح اس کو تیار کرنا چاہیے۔ المرابطۃ السادسۃ فی توبیخ النفس ومعاتبتہا کے عنوان کے تحت نفس سے مکالمہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:-

> اے نفس ذرا انصاف کر اگر ایک یہودی تجھ سے کہہ دیتا ہے کہ فلاں لذیذ ترین کھانا تیرے لئے مضر ہے تو تو صبر کرتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے اور اس کی خاطر تکلیف اٹھاتا ہے کیا انبیاء کا قول جن کو معجزات کی تائید حاصل ہوتی ہے اور فرمان الٰہی اور صحف سماوی کا مضمون تیرے لئے اس سے بھی کم اثر رکھتا ہے جتنا کہ اس یہودی کا کہ قیاس و اندازہ عقل کی کمی اور علم کی کمی کے ساتھ خبر دیتا ہے اگر ایک بچہ کہتا ہے کہ تیرے کپڑوں میں بچھو ہے تو بغیر دلیل طلب کئے اور سوچے سمجھے اپنے کپڑے اتار پھینکتا ہے کیا انبیاء علماء و اولیاء اور حکماء کی متفقہ بات تیرے نزدیک اس بچہ کی بات سے بھی کم وقعت رکھتی ہے یا جہنم کی آگ اس کی بیڑیاں اس کے گرز اس کا عذاب اس کا زقوم اور اس کے سانپ بچھو اور زہریلے جانور تیرے نزدیک ایک بچھو سے بھی کم تکلیف دہ ہیں جس کی تکلیف زیادہ سے زیادہ ایک دن یا اس سے کم رہتی ہے یہ عقلمندوں کا شیوہ نہیں اگر کہیں جانوروں کو تیری حالت کا علم ہو جائے تو وہ تجھ پر ہنسیں اور تیری بیوقوفی کا مذاق اڑائیں، پس اگر اے نفس تجھ کو یہ سب چیزیں معلوم ہیں اور ان پر تیرا ایمان ہے تو کیا بات ہے کہ تو عمل میں تساہل اور ٹال مٹول سے کام لیتا ہے حالانکہ موت کمین گاہ میں منتظر بیٹھی ہے کہ تجھے اچک لے جائے۔ اور فرض کر کہ تجھ کو سو برس کی مہلت مل گئی ہے تو کیا تیرا خیال ہے کہ جس کو ایک گھاٹی طے کرنی ہے اور وہ اس گھاٹی کے نشیب میں اطمینان سے اپنے جانور کو کھلا رہا ہے وہ بھی اس گھاٹی کو طے کر سکے گا۔ اگر تو یہ گمان رکھتا ہے تو تو کس قدر نادان ہے ایسے شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جو علم حاصل کرنے کی غرض سے پردیس کا سفر کرتا ہے اور وہاں کئی سال بیکاری اور تعطل میں گزار دیتا ہے اس خیال سے کہ وطن کی واپسی کے سال سب علم حاصل کر لے گا تو اس کی عقل پر ہنستا ہے اور تو

اس وہم کا مذاق اڑاتا ہے کہ علم و تقویٰ تو قلیل مدت میں حاصل ہو جائیں گے یا قضا کا منصب مع علم و تقویٰ کے توکل کی برکت سے ہاتھ آ جائے گا پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ تاخیر کی کوشش مفید ہوتی ہے اور بلند درجات تک پہنچ سکتی ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی آج کا دن تیری عمر کا آخری دن ہو تو اس دن تو اس کام میں کیوں مشغول نہیں ہوتا اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے بتلا بھی دیا ہے کہ تجھے مہلت دے دی گئی ہے تو پھر بھی عجلت کرنے سے کیا چیز مانع ہے اور آج کل لیت و لعل کرنے کی کیا وجہ ہے یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ تجھے اپنی خواہشات نفس کی مخالفت مشکل معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں محنت و مشقت ہے کیا تو اس دن کا منتظر ہے جب خواہشات کی مخالفت تیرے لئے آسان ہو جائے گی ایسا دن تو اللہ تعالیٰ نے مطلق پیدا ہی نہیں کیا اور نہ پیدا کرے گا جنت ہمیشہ ناگواریوں اور مکارہ سے گھری رہے گی اور مکارہ کبھی نفس کے لئے آسان نہیں ہو سکتے ایسا ہونا محال ہے لیکن اب یہ اٹکل لگاتا ہے کہ کل سے یہ کام کریں گے تجھے معلوم نہیں کہ جو کل آ رہی ہے وہ گزشتہ دن کے حکم میں ہے جو کام تو آج انجام نہیں دے سکا کل اس کا انجام دینا تیرے لئے اور بھی مشکل ہے اس لئے کہ شہوت کی مثال ایک تناور درخت کی سی ہے جس کو اکھاڑنا بندے پر فرض ہے فرض کیجئے اگر کوئی اس کے اکھاڑنے سے عاجز ہو گیا اور سوچا کہ کل پر رکھا تو اس کی مثال اس نوجوان کی سی ہے جس سے ایک درخت اکھاڑا نہیں گیا اور اس نے اس کام کو دوسرے سال کے لئے ملتوی کر دیا، وہ یہ جانتا ہے کہ جتنا زمانہ گزرے گا درخت مستحکم ہو گا اور اس کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی جائیں گی اور اکھاڑنے والے کی کمزوری اور ضعف میں اضافہ ہو گا، ظاہر ہے کہ جس کو شباب میں نہیں اکھاڑ سکا اس کو بڑھاپے میں کیا اکھاڑ سکے گا بڑھاپے کی ورزش اور محنت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے بھیڑیئے کی تربیت و اصلاح ایک مدت تک سرسبز شاخ جھک سکتی ہے اور جدھر چاہو بدلی جا سکتی ہے جب یہ سوکھ جائے گی اور ایک زمانہ گزر جائے گا تو اس کا موڑنا ناممکن ہو جائے گا پس اگر اے نفس تو ان حقائق پر ایمان نہیں رکھتا اور انہی باتوں میں سستی سے کام لیتا ہے تو تجھے کیا ہو گیا ہے کہ عقل و دانش کا دعویٰ کرتا ہے؟ اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہو سکتی ہے تاہم تو یہ کہ ان افعال سے

روکنے والی چیز شہوت پرستی اور آرام طلبی ہے، جب یہ بری چیز ہے تو اگر یہی بات ہے تو آخرت کی عبادت کتنی بڑی [illegible] ہے اور دنیا بھی کتنی تنگ ہے، اگر اپنے دل میں جھانک تو لیں الفت کیوں نہیں [illegible] کرنا جو تمام کدورتوں اور آلائشوں سے پاک ہو اور ابد تک کے لئے ہو، اور یہ نعمت جنت ہی میں حاصل ہو سکتی ہے، اگر تو خواہشات کا جائزہ لے تو [illegible] آدمی کی فطرت بھی کچھ نفس کی خواہشات کی مخالفت کی جائے اس لئے کہ بسا اوقات ایک لقمہ کئی لقموں سے محروم کر دیتا ہے جیسا کہ ایک انسان [illegible] طبیب [illegible] تین روز کے لئے ٹھنڈے پانی سے پرہیز بتائے تاکہ وہ صحت یاب ہو سکے پھر زندگی بھر ٹھنڈے پانی کا لطف اٹھائے، اس لئے اس کو خبردار کر دیا ہو کہ ٹھنڈا پانی اس حالت میں تمہارے لئے سخت مضر ہے اگر اس نے پرہیز نہ کیا تو زندگی بھر اس ٹھنڈے پانی سے ہی ہاتھ دھونا پڑے گا، اس وقت یہ بتا کہ عقل کا تقاضا کیا ہے؟ یہی نا کہ تین دن صبر کر لینا چاہئے تاکہ زندگی دوام سے گزرے یا اپنی خواہش پوری کر لینی چاہئے؟ پھر تیری ستر یا اسی برس [illegible] زیادہ سے زیادہ اور اس [illegible] آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلہ میں وہ حقیقت میں [illegible] ابدالآباد کی زندگی کے مقابلہ میں ہے (جو اہل جنت اور اہل جہنم کی مدت ہے) پس غور کر سکتا ہے کہ خواہشات [illegible] سے صبر کرنے کی تکلیف انتقام جہنم یا عذاب نار سے زیادہ سخت اور طویل ہے؟ جو شخص ایک معمولی تکلیف بھی نہیں برداشت کر سکتا وہ عذاب الٰہی کو کیسے برداشت کر سکتا ہے!

میں دیکھتا ہوں کہ تو دو وجہ سے اپنے نفس کو ڈھیل دیتا ہے ایک کفر خفی اور ایک صریح حماقت، کفر خفی یہ ہے کہ روز حساب پر ایمان کمزور ہے اور ثواب و عقاب کی حقیقت سے تو ناواقف ہے اور حماقت اس بات کی ہے کہ [illegible] اور اس [illegible] کا خیال [illegible] عفو و کرم [illegible] اس کے یاد [illegible] [illegible] زبان سے [illegible] کہ [illegible]

نہیں ہوتا بلکہ اس کے حصول کے لئے ہزاروں جتن کرنا پڑتا ہے ایسی حالت کی وجہ سے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہے کہ الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت والعاجز من اتبع نفسہ ھواھا وتمنی علی اللہ الامانی (ہوشیار وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے پیچھے لگائے اور اللہ پر آرزوئیں باندھتا رہے) افسوس اے نفس آخرت کی زندگی کے دوام کو ترک کر دیا جس سے ہوشیار رہنا چاہئے تھا اور شیطان کے فریب میں آگیا، اپنے لئے تھا۔ تجھے اپنے اوپر ترس کھانا چاہئے تجھے اپنی ہی فکر کا حکم دیا گیا ہے دیکھ تیرے اوقات ضائع نہ کر تیرے پاس گنی چنی سانسیں ہیں اگر تیری ایک سانس بھی رائیگاں گئی تو گویا تیرے سرمایہ کا ایک حصہ ضائع ہو گیا، اسے غنیمت سمجھ صحت کو مرض سے پہلے، فراغت کو مصروفیت سے پہلے، دولت کو غربت سے پہلے، شباب کو ضعیفی سے پہلے، زندگی کو موت سے پہلے اور آخرت کے لئے تیاری کر اسی مقدار سے جتنا تجھے وہاں رہنا ہے اے نفس کیا عجب ہے جو موسم سرما سر پر آجاتا ہے تو اس پوری مدت کے لئے تو تیاری نہیں کرتا۔ خوراک کا ذخیرہ لباس کی ضروری مقدار اور ایندھن کو ایک جگہ جمع نہیں کرتا اور تمام ضروری سامان جاڑے کا مہیا کر لیتا ہے اور اس بھروسہ پر نہیں رہتا کہ لباس، جلانے اور ایندھن کے بغیر جاڑا گذر جائے گا اور مجھ میں اس کی طاقت ہے کیا تیرا گمان ہے کہ جہنم کا زمہریر جاڑوں کی سخت سردی سے کم ہے ہرگز نہیں! اور اس کا کوئی امکان نہیں، شدت و برودت میں ان دونوں کے درمیان کوئی تناسب نہیں! کیا تو سمجھتا ہے کہ تو بغیر کسی کے اس سے نجات حاصل کرے گا، جیسے کہ سردی بغیر اونی کپڑے اور آگ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بغیر نہیں جاتی اسی طرح دوزخ کی آگ اور سردی توحید کے قلعہ اور طاعت کی خندق کے بغیر نہیں جا سکتی اور اللہ تعالیٰ کا یہ کرم ہے کہ اس نے تجھے حفاظت کی تدابیر بتا دیں اور اسباب آسان کر دیئے ہیں اس کا کرم یہ نہیں کہ دوسرے سے عذاب کو ٹال دے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ وہ سردی پیدا کرتا ہے تو اس کے لئے آگ بھی پیدا کرتا ہے اور تجھے جلانے کا طریقہ بھی

پیچھے رہ گئی ہے کہ لئے کافی علم ہو جاتا ہے کہ قرآن ترغیب دیتا ہے اور اپنے کو عقل کی جکڑ کرے اور جیسے لوگ اس دنیا اور اولاد کے ذریعے حاصل کرتا ہے، خدا کی ضرورت نہیں انسان کی ضرورت ہے اس پر [illegible] عبادت بھی خدا مستحق ہے اور سب پر فرض ہے کہ اس کے وسیلہ سے نجات حاصل کرے [illegible] من عمل صالحاً فلنفسہ ومن اساء فعلیھا ان اللہ غنی عن العٰلمین (جس نے اچھائی کی تو اپنے نفس کے لئے اور جس نے برائی کی اس کا وبال بھی اسی پر ہے اور اللہ جہان والوں سے بے پرواہ ہے) تیری قربانی ہو، بعض [illegible] اپنی آخرت کو اپنی دنیا پر قیاس کر ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ (تمہارا پیدا کرنا اور تمہارا اٹھانا ایک جان کی طرح ہے) کما بدأنا اول خلق نعیدہ (جیسے ہم نے پیدا کیا تھا پہلے اسی طرح دوبارہ پیدا کریں گے) کما بدأکم تعودون (جیسے اس نے تم کو ابتداء پیدا کیا تھا ویسے ہی پھر تم واپس ہو جاؤ گے)۱؎

احیاء کے ناقد

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے احیاء العلوم پر اجمالی تبصرہ و اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ کلامہ فی الاحیاء غالبہ جید ۲؎ (احیاء میں عموماً ان کا کلام اچھا ہے) اس کے ساتھ وہ چار باتوں میں اس کتاب پر تنقید کرتے ہیں، ان کی پہلی تنقید اس پر ہے کہ اس میں فلاسفہ کے بہت سے اقوال آگئے ہیں اور توحید، نبوت اور معاد کے متعلق ان کے بعض خیالات و بیانات شامل ہو گئے ہیں، ان کے نزدیک امام غزالی فلاسفہ کے اثرات سے ضرور کچھ نہ کچھ متاثر ہوئے ہیں، وہ اگرچہ ان کی تردید کرتے ہیں لیکن ان کی تصنیفات میں ان کے خیالات کی آمیزش کا طور پر کہیں کہیں جھلک آ جاتی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی جس فلسفہ و فلاسفہ کے بارہ میں گہری بحث و نظر ہے اس کے پیش نظر کچھ عجب نہیں کہ ان کے سامنے امام غزالی کی بعض چیزیں فلسفہ سے متاثر ہوں۔

۱؎ احیاء العلوم [illegible] ۲؎ [illegible] شیخ الاسلام ابن تیمیہ [illegible]

دوسری تنقید یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے کلامی مباحث ہیں جو ابن تیمیہ کے نزدیک کتاب و سنت کی رُو سے مطابق نہیں ہیں، اور ان کے مبادی یونانی ہیں[2] آگے تیسری تنقید یہ ہے کہ اس میں اہل تصوف کے بعض متشددانہ اقوال اور مقالات ہیں، چوتھی چیز یہ ہے کہ احیاء میں بہت سی ضعیف احادیث و آثار ہیں بلکہ موضوع روایات تک ہیں[1] اس کے باوجود شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

وفيه مع ذلك من كلام المشايخ الصوفية	اس کے باوجود احیاء میں مشائخ صوفیہ کا جو حصہ
العارفين المستقيمين في اعمال القلوب	عارفین استقامت کے اعمال قلوب کے بارہ میں بہت سا
الموافق للكتاب والسنة ما هو اكثر مما يرد	ایسا ہے جو کتاب و سنت کے موافق ہے اور جو
منه فلهذا اختلف فيه اجتهاد	اکثر حصہ قابل قبول ہے وہ ان مردود باتوں سے زیادہ ہے اسی لیے
الناس وتنازعوا فيه[4]	اس میں لوگ مختلف رائیں رکھتے ہیں اور بحث کرتے ہیں

علامہ ابن جوزی کی بھی بڑی تنقید ضعیف اور موضوع روایتوں پر ہے۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ امام صاحب کا حدیث سے کم اشتغال ہے۔ حافظ زین الدین العراقی (صاحب المغنی) نے جن کی بہت بڑی خدمت احیاء کی یہ ہے کہ اس کی احادیث کی تخریج کی ہے راوی اور حدیث کا درجہ اور اس کی حیثیت بیان کر دی ہے۔

ابن جوزی نے امام غزالی کے بعض تاریخی مسامحات اور فروگذاشتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی طرح ان کو تاریخ سے بھی اشتغال کا موقع نہیں ملا تھا۔[5]

ان کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بعض امراض قلب (ریا و حب جاہ وغیرہ) کے علاج کے سلسلہ میں اور نفس کشی اور اصلاح کے لیے انھوں نے صوفیہ کے بعض ایسے واقعات نقل کر دیے ہیں جو قابل تقلید نہیں ہیں اور فقہی حیثیت سے ان کا جواز بھی ثابت ہونا مشکل ہے[6] ان نقائص کے باوجود وہ

---

[1] فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ص ۹۔ اور التاج المکلل نواب صدیق حسن خاں ص ۲۴

[2] فتاوی ابن تیمیہ ج ۱ ص ۱۹۳ [3] المنتظم ج ۹ ص ۱۶۹-۱۷۰ [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۱۷۰

احیاء العلوم کی اہمیت و مقبولیت کے قائل ہیں اور انھوں نے خود منہاج القاصدین کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے جس میں انھوں نے قابل اعتراض چیزوں کو حذف کر دیا ہے لیکن اس خلاصہ میں اصل کتاب کی روح اور اس کی تاثیر باقی نہیں رہی ہے۔

امام غزالی اور علم کلام

امام غزالی جیسے مجتہدانہ دماغ کے آدمی تھے اس کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ متقدمین کے مباحث و تحقیقات کے ناقل محض یا ترجمان و شارح بن کر رہ جاتے اور ان کی شخصیت نمودار نہ ہونے پائے، بدقسمتی سے چوتھی صدی میں علم کلام کا حال بھی یہی تھا کہ دوسرے علمی اداروں سے زیادہ زمانہ کی عقلی اور علمی سطح سے پیچھے تھا، ضرورت تھی جمود و تقلید کا شکار ہو گیا تھا۔ متکلمین اشاعرہ کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ ان کے نتائج تحقیق اور ان کے عقائد تسلیم کیے جائیں بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ ان عقائد کے ثبوت کے لیے امام ابوالحسن اشعری اور قاضی ابوبکر باقلانی وغیرہ نے جو مقدمات و دلائل قائم کیے ہیں ان کو بھی بعینہ تسلیم کیا جائے اور ان کے علاوہ دوسرے مقدمات و دلائل سے کام نہ لیا جائے۔ امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں مجتہدانہ انداز میں اصول و عقائد پر گفتگو کی اور ان کے ثبوت کے لیے انھوں نے بعض ایسے نئے مقدمات و دلائل قائم کیے جو ان کے نزدیک زیادہ موثر و دلپذیر تھے، صفات الٰہی ...... نبوت، معجزات، تکلیفات شرعیہ، عذاب و ثواب، برزخ، قیامت کے متعلق انھوں نے نئے متکلمانہ انداز سے گفتگو کی۔ ان کے ثبوت کے لیے انھوں نے بہت سے متکلمین کی طرح جدال آفرینیوں، تکلفات اور منطقی مقدمات و نتائج کے بجائے زیادہ عام فہم و وجدانیات پر مبنی دلائل قائم کیے اور اس سلسلہ میں انھوں نے بیشتر متکلمین کے استدلال، ان کی اصطلاحات اور ان کی ترتیب کی پابندی نہیں کی اور اسی طرح اشعری علم کلام کی تقلید کی حدود سے بھی آگے بڑھ گئے جس کے لیے متکلمین ناخوش ہوئے ان کو انھوں نے

ان کی عظیم الشان دینی خدمت کا اعتراف کیا جانا چاہئے تھا، مگر چونکہ انھوں نے یہ کام عام متکلمین کی روش سے ہٹ کر انجام دیا تھا اور کہیں کہیں امام ابو الحسن اشعری اور ان کے متبعین کی تحقیقات سے اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے اشعری مکتب فکر (جس سے خود امام صاحب منسلک اور منسوب تھے) ان کے اس علم کلام اور ان دلائل و مقدمات سے بے چین تھا اور اس حلقہ کے بہت سے پرجوش علماء اس کو بدعت و ضلال اور مسلک سلف سے بعد و انحراف محسوس کرتے تھے، احیاء العلوم کی تالیف اور اس کی غیر معمولی اشاعت و مقبولیت کے بعد اس فکر پر اشعری علماء میں چہ میگوئیاں بہت بڑھ گئیں اور بہت سے لوگوں کو امام صاحب کے عقائد میں شبہات پیدا ہونے لگے، کسی مخلص نے امام صاحب کو خط لکھا اور اس صورت حال کی اطلاع دیتے ہوئے اپنی قلبی تشویش کا اظہار کیا، امام صاحب نے ان کو مفصل جواب دیا، ایک مستقل رسالہ "فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة" کے نام سے موجود ہے، اس کے شروع میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"برادر شفیق! اپنا سینہ کہ گروہ حاسدین کی بعض تصنیفات (متعلق بہ اسرار معاملات دین) پر نکتہ چینی کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ بعض مسائل ان میں ائمہ اسلاف اور مشائخ اہل کلام کے خلاف ہیں اور یہ کہ اشعری عقیدہ سے بال برابر بھی ہٹنا کفر ہے، اس پر تم کو صدمہ ہوتا ہے اور تمہارا دل جلتا ہے میں اس سے واقف ہوں لیکن عزیز من! تم کو صبر کرنا چاہئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاندین کے طعن سے نہ بچ سکے تو میری کیا ہستی ہے؟ جس شخص کا یہ خیال ہے کہ اشعری یا معتزلی یا حنبلی یا دوسرے فرقوں کی مخالفت کفر ہے تو سمجھو کہ وہ اندھا مقلد ہے، اس کی اصلاح کی کوشش میں اپنا وقت ضائع نہ کرو، اس کو خاموش کرنے کے لئے مخالفین کا دعویٰ کافی ہے، اس لئے کہ تمام مذاہب میں امام اشعری سے اختلافات پائے جاتے ہیں، اب اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ تمام تفصیلات و جزئیات میں اشعری کا اتباع ضروری ہے اور ذرا سی مخالفت بھی کفر ہے تو اس سے سوال کرو کہ یہ بات کہاں سے ثابت ہوئی کہ حق اشعری کے ساتھ مخصوص ہے اور انہی کی اتباع پر منحصر ہے، اگر ایسا ہے تو وہ شاید باقلانی کے کفر کا فتویٰ دیں گے

اس لئے کہ صفت بقاء میں ان کو اشعری سے اختلاف ہے، اور ان کا خیال ہے کہ وہ ذات باری سے زائد کوئی صفت نہیں تھا۔ اور پھر سوال یہ ہے کہ باقلانی اشعری کی مخالفت کر کے کیوں کفر کے مستحق ہیں، اشعری باقلانی سے اختلاف کی بنا پر کیوں کفر کے مستحق نہیں؟ اور حق ان میں سے کسی ایک ہی میں کیوں منحصر سمجھا جائے؟ اگر کہا جائے کہ اشعری مقدم ہیں تو خود اشعری سے معتزلہ مقدم ہیں، تو پھر معتزلہ کو برحق ہونا چاہئے، اگر یہ علم و فضل کے تفاوت کی بنا پر ہے تو بتلایئے کہ علم و فضل کا وزن کرنے کے لئے کون سا ترازو اور پیمانہ ہے؟ جس کی رو سے ایک شخص اپنے پیرو کو علم و فضل میں سب سے بلند مرتبہ مانتا ہے۔ اگر باقلانی کو اشعری سے اختلاف کرنے کی اجازت ہے تو باقلانی کے بعد آنے والے اس حق سے کیوں محروم ہیں اور اس میں کسی ایک شخص کی تخصیص کیوں کی جائے؟[۱]

علم کلام پر یہ تبصرہ، گفتگو اور اس میں بے جا انہماک کرنے کے بعد امام غزالی اپنی سلامت طبع، حق پسندی اور ذاتی تجربوں کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ علم کلام کا فائدہ بہت محدود ہے اور بعض اوقات اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہے، یہ ایک وقتی اور ضرورت کی چیز ہے اور ایک دوا ہے جس کی صحیح المزاج اور سلیم الطبع انسانوں کو ضرورت نہیں، عمومی چیز تو ایک صالح غذا کا حکم رکھتی ہے اور جس سے کوئی انسان مستغنی نہیں، وہ قرآن مجید کا طرز بیان اور استدلال ہے جس سے سب کو اپنا اپنا حصہ ملتا ہے اور کوئی اس سے محروم نہیں۔ "الجام العوام عن علم الکلام" میں جو ان کی آخری تصنیف ہے لکھتے ہیں:

فأدلة القرآن مثل الغذاء ينتفع به	قرآن کے دلائل غذا کی طرح ہیں جس سے ہر انسان فائدہ
كل إنسان وأدلة المتكلمين مثل الدواء	اٹھاتا ہے، اور متکلمین کے دلائل دوا کی طرح ہیں جس سے
ينتفع به آحاد الناس ويستضر به الأكثرون	کوئی کوئی فائدہ اٹھاتا ہے اور اکثر آدمیوں کو اس سے
بل أدلة القرآن كالماء الذي ينتفع به	نقصان ہوتا ہے بلکہ قرآنی دلائل پانی کی طرح ہیں کہ بچے

---

[۱] فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ۔

الصبي الرضيع والرجل القوي ،	جس سے دودھ پیتا بچہ اور طاقتور آدمی یکساں فائدہ
وسائر الأدلة كالأطعمة التي ينتفع	اٹھاتے ہیں اور دلائل کھانے کی طرح ہیں جن سے توانا
بها الأقوياء مرة ويمرضون بها أخرى	آدمی ایک مرتبہ فائدہ اٹھاتے ہیں دوسری مرتبہ بیمار پڑ جاتے
ولا ينتفع بها الصبيان أصلاً۔[1]	ہیں اور بچوں کے لئے وہ مطلقاً کارآمد نہیں۔

علم کلام سے جو نقصان پہنچتا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنا مشاہدہ اور تجربہ بیان کرتے ہیں۔

والدليل على تضرر الخلق به المشاهدة	لوگوں کو علم کلام سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی
والعيان والتجربة وما ثار من الشر	دلیل تو مشاہدہ اور تجربہ ہے اور تجربہ بتاتا ہے کہ
منذ نبغ المتكلمون وفشت صناعة الكلام مع	جب سے متکلمین پیدا ہوئے اور علم کلام کا چرچا ہوا
سلامة العصر الأول من الصحابة عن مثل	کیسی مصیبت آئی اور حالانکہ صحابہ کا پہلا دور اس
ذلك۔[2]	خرابی سے محفوظ تھا۔

تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام غزالی کی معذرت

ذوالقعدہ ۴۹۹ھ میں امام غزالی نے نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ کی مسند درس کو دوبارہ آباد کیا تھا یہ سنجر سلجوقی (ابن ملک شاہ) کی سلطنت اور فخر الملک (ابن نظام الملک) کی وزارت عظمیٰ کا زمانہ تھا۔ (فخر الملک محرم سنہ ۵۰۰ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ سے شہید ہوا) اس کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد امام نے مدرسہ نظامیہ کی تدریس سے کنارہ کشی کی، اور اپنے وطن طوس میں سکونت اختیار کی، گھر کے پاس ہی ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی جہاں تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔

سنہ ۵۰۴ھ میں سلطان محمد بن ملک شاہ نے جب نظام الملک کے بڑے بیٹے احمد کو وزیر اعظم مقرر کیا تو

---

[1] احیاء العلوم بحث علم کلام ج ۱ [2] ایضاً

اس لئے امام صاحب کو پھر بغداد میں بلانا چاہا۔ امام غزالی کی جگہ مدرسہ نظامیہ میں اگرچہ پُر ہو گئی تھی مگر خالی تھی، امام غزالی کا جانشین پورے عالم اسلامی میں ملنا مشکل تھا، مدرسہ نظامیہ سلطنت عباسیہ کی زینت اور بغداد کی آبرو تھی، اس نقصان کا احساس سب کو تھا، دربار خلافت سے بھی اس کی تحریک ہوئی کہ امام غزالی مدرسہ نظامیہ کو پھر زینت بخشیں، قوام الدین نظام الملک وزیر اعظم نے خود خط لکھا، اور مدرسہ نظامیہ کی اہمیت اور مرکزیت بیان کی، اور خود خلیفہ عباسی کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ وہ لکھتا ہے:

"و دیگر از سرائے عزیز مقدس نبوی (یعنی ایوان خلافت) اشارت نمودند و مزید التفات فرمودند

و ایں خطاب صادر شد تا صدر الدین[1] محمد بن فخر خواجہ اجل زین الدین حجۃ الاسلام فرید الزمان ابو حامد

بن محمد الغزالی ادام اللہ تمکنہ از تمام سنگیر و ار د بجانب بغداد قدوۂ عالم و انگشت نمائے روزگار است"

اس فرمان پر دربار خلافت کے تمام ارکان کے دستخط ثبت تھے اور یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ خلیفہ اور سارے اعیان اور ارکان سلطنت سب امام صاحب کی آمد کے لئے چشم براہ ہیں، احمد بن نظام الملک نے خود امام صاحب کو جو خط لکھا اس کا ماحصل یہ تھا کہ اگرچہ آپ جہاں تشریف رکھیں گے وہی جگہ درسگاہ و مقام بن جائے گی لیکن جس طرح آپ مقتدائے روزگار ہیں تو آپ کی قیام گاہ بھی وہی شہر ہونا چاہئے جو عالم اسلام کا مرکز اور قبلہ گاہ ہو تاکہ تمام دنیا کے ہر حصہ کے لوگ بآسانی وہاں پہونچ سکیں اور ایسا مقام صرف دار السلام بغداد ہے۔"

امام صاحب نے ان خطوط و فرامین کے جواب میں ایک طویل خط لکھا اور بغداد میں نہ آنے کے متعدد عذر لکھے، ایک یہ کہ یہاں (طوس میں) ڈیڑھ سو مستعد طلبہ مصروف تحصیل ہیں جن کو بغداد جانے میں زحمت ہوگی، دوسرے یہ کہ جب میں پہلے بغداد میں تھا تو میرے اہل و عیال نہ تھے اب بال بچوں کا جھگڑا ہے اور یہ لوگ ترک وطن کی زحمت نہیں اٹھا سکتے۔ تیسرے یہ کہ میں نے مقام خلیل پر عہد کیا ہے کہ کبھی مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا اور بغداد میں مباحثہ کے بغیر چارہ نہیں، اس کے سوا دربار خلافت میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہونا ہوگا اور

---

[1] صدر الدین محمد بن نظام الملک طوسی کا پوتا اور سلطان سنجر کا وزیر اعظم تھا۔ جس کی حکومت میں طوس واقع تھا۔

میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا، سب سے بڑھ کر یہ کہ میں مشاہرہ اور وظیفہ قبول نہیں کر سکتا، اور بغداد میں میری کوئی جائداد نہیں" غرض خلافت و سلطنت کی طرف سے کوشش بہت کچھ ہوئی، لیکن امام صاحب نے صاف انکار کیا اور گوشۂ عافیت سے باہر نہ نکلے۔[1]

بقیہ زندگی اور وفات

امام غزالی نے یہ زمانہ علمی و دینی اشتغال میں گزارا، ان میں اب بھی طالب علمانہ روح تھی وہ حدیث کی طرف ایسی توجہ نہیں کر سکے تھے جیسی انھوں نے علوم عقلیہ اور بعض علوم نقلیہ کی طرف کی تھی، اس زمانہ میں ان کو اپنی اس کمی کو پورا کرنے کا خیال ہوا، چنانچہ ایک مشہور محدث حافظ عمر بن ابی الحسن الرواسی کو اپنے یہاں مہمان رکھ کر ان سے صحیح بخاری و صحیح مسلم کا درس لیا اور اس کی سند حاصل کی، یہ آخر زمانہ ان کا حدیث کے مطالعہ اور اشتغال میں گزرا، ابن عساکر لکھتے ہیں:-

وکانت خاتمۃ امرہ اقبالہ علی حدیث	ان کی زندگی کا آخری کام یہ تھا کہ وہ حدیث نبوی
المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ومجالسۃ	کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور علماء حدیث
اھلہ ومطالعۃ الصحیحین البخاری ومسلم	کی ہم نشینی اختیار کی اور صحیحین (بخاری و مسلم) کا
الذین ھما حجۃ الاسلام۔[2]	مطالعہ شروع کیا جو اسلام میں سند کا درجہ رکھتی ہیں

انتقال سے ایک سال پہلے ۵۰۴ھ میں انھوں نے "المستصفیٰ" لکھی جو اصولِ فقہ کے ارکانِ ثلثہ[3] میں شمار کی جاتی ہے اور علماء نے اس کے ساتھ بڑی اعتنا کی ہے، یہ ان کی آخری تصنیف ہے۔

امام غزالی نے طابران میں ۱۴ جمادی الاخریٰ ۵۰۵ھ کو ۵۵ سال کی عمر میں انتقال کیا اور

---

[1] الغزالی ص ۲۱ [2] تبیین کذب المفتری ص ۲۹۶۔ [3] تین کتابیں جو اصول فقہ کے تین ستون سمجھے جاتے ہیں حسب ذیل ہیں، ابو الحسین البصری کی "المعتمد"، امام الحرمین کی "البرہان" اور امام غزالی کی "المستصفیٰ"۔

یہ گنج گراں مایہ اسی خاک میں ودیعت ہوا۔ ابن جوزی نے ان کے انتقال کا واقعہ ان کے بھائی احمد غزالی کی روایت سے اس طرح بیان کیا ہے:-

> "دو شنبہ کے دن وہ صبح کے وقت بستر خواب سے اٹھے، وضو کر کے نماز پڑھی، پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر کہا آقا کا حکم سر آنکھوں پر، یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیئے، لوگوں نے دیکھا تو روح پرواز کر چکی تھی"![1]

امام غزالی کی دو ممتاز خصوصیتیں

امام غزالی کی دو خصوصیتیں بڑی ممتاز ہیں، اخلاص، علو ہمت۔ ان کے اخلاص کا اعتراف موافق و مخالف سب کو ہے اور وہ ان کی تصنیفات کے لفظ لفظ سے ٹپکتا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اگرچہ ان کے ناقدین میں ہیں اور ان کی بہت سی چیزوں سے ان کو اختلاف ہے لیکن اس کے باوجود وہ ان کو کبار مخلصین میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی کتابوں کی تاثیر اور مقبولیت کی اصل وجہ ان کا یہی اخلاص ہے۔ اسی اخلاص نے ان سے اقلیم علم کی مسند شاہی ترک کروائی اور برسوں دشت و بیاباں کی خاک چھنوائی اور باوجود طلب و اصرار کے بادشاہوں کے دربار اور اپنے وقت کے سب سے بڑے اعزاز سے روگرداں اور بے نیاز رکھا۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آخری چیز جو صدیقین کے قلب سے نکلتی ہے وہ حب جاہ ہے۔ ان کی آخری زندگی شہادت دیتی ہے کہ وہ اس مقام سے محروم نہیں رہے۔

علو ہمت ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے۔ انھوں نے علم و عمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے معاصرین کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی، وہ علم و عمل کے جس ترقی یافتہ مقام پر پہنچے ان کی زبان پر یہی صدا آئی کہ

ع مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

علوم نقلیہ میں بھی وہ اپنے زمانہ اور اپنے معاصرین کی عام سطح سے بہت بلند تھے، فقہ و اصول فقہ میں

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین (شرح احیاء العلوم) ص ۱۱

انھوں نے جو تصنیفات کیں صدیوں تک علما ان کی شرح و تحشیہ میں مشغول رہے پھر اپنے زمانے کے رواج اور علمائے نقلیات کے دستور کے خلاف انھوں نے علوم عقلیہ کی طرف توجہ کی اور منطق و فلسفہ کا اس طرح مطالعہ کیا کہ بقول قاضی ابوبکر بن العربی فلسفہ کے جگر اور فلاسفہ کے شکم میں اتر گئے اور پھر ان کی تنقید و تردید میں ایسی کتابیں لکھیں جن سے اس کی عمارت ایک صدی تک متزلزل رہی۔

عمل کے سلسلہ میں اپنی ذہنی، علمی، اخلاقی اور روحانی ترقی و تکمیل کا انھوں نے کوئی گوشہ فروگذاشت نہیں کیا، علمی تبحر اور جامعیت و کمال کے ساتھ اپنے وقت کے ایک مخلص و جوہر شناس شیخ طریقت شیخ ابوعلی فارمدی (م ۴۷۷ھ) سے بیعت کی اور تصوف کی تعلیم حاصل کی پھر اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے اس کے مقاصد و غایات کو پہنچے، اور اذواق صحیحہ سے لذت آشنا ہوئے۔

اصلاح و انقلاب کے سلسلہ میں صرف تصنیف و تالیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک نئی اسلامی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے میں بھی ان کا ہاتھ ہے، مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

"امام صاحب کو ان باتوں پر قناعت نہ تھی، وہ دیکھتے تھے کہ موجودہ سلطنتوں کا سرے سے خمیر ہی بگڑ گیا ہے اس لئے جب تک اسلامی اصول کے موافق ایک نئی سلطنت نہ قائم کی جائے اصل مقصد نہیں حاصل ہو سکتا لیکن امام صاحب کو ریاضت و مجاہدہ اور درس و تدریس سے اتنی فرصت نہ تھی کہ ایسے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکتے اتفاق یہ کہ جب دنیا اسلام میں تنزل شروع ہوئی [illegible] میں اسپین میں علی بن یوسف بن تاشفین نے جو اسپین کا بادشاہ تھا تعصب و تنگ نظری سے امام کی کتب کے جلانے کا حکم دیا[1] [illegible] قلمرو میں [illegible] گئی، امام صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو سخت رنج ہوا، اسی اثنا میں اسپین سے ایک شخص امام صاحب کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے آیا جس کا نام محمد بن عبداللہ تومرت تھا، یہ ایک بربری [illegible] خاندان کا آدمی تھا [illegible]

---

[1] شرح احیاء العلوم۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] امام صاحب [illegible]

[illegible]

محمد بن عبداللہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

---

[1] چونکہ محمد بن عبداللہ نے ایک عظیم الشان سلطنت [illegible] اس لئے اس کا ایک مختصر سا حال [illegible] لکھا جاتا ہے۔

محمد بن عبداللہ اقصائے مغرب کا [illegible] تحصیل علم [illegible] امام غزالی [illegible] مغرب کی طرف روانہ [illegible] امر بالمعروف کی خدمت انجام [illegible] شاہی خاندان سے [illegible] بادشاہ وقت علی بن یوسف تاشفین نے اس کو دربار میں طلب کیا [illegible] کے علماء نے [illegible] بادشاہ کی حکومت [illegible] محمد بن عبداللہ نے نہایت [illegible] بادشاہ [illegible] سلطنت کی بنیاد [illegible]

الدولة ولم توصف بما كان السلطان
بالجامع الاعظم للعقد والحل بعد ... مسائلة
عن إذن من العلماء والفقہ شئ الذی
تکون بها لاعزاز والمنعة ۔

میں محفوظ و باقی تھا اور کوئی ایسا سلطان موجود
نہ تھا جو امت کو قابو کر سکے اور دین اس کو
قائم رکھ سکے لیکن جب وہ اٹھ گئے اور ان کی جگہ پر بیٹھا ہے
پاس اتنا لشکر سامان اور ہیبت تھا جس سے
قوت اور حفاظت ہو سکے ۔

غرض محمد بن عبد اللہ بن تومرت نے واپس جا کر امر بالمعروف کے شعار سے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو مدت تک قائم رہی اور موحدین کے لقب سے پکاری جاتی تھی۔ علی بن یوسف کی حکومت میں جور و تعدی بہت پھیل گئی تھی فوج کے لوگ علانیہ لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے تھے اور عفت مآب خاتونوں کے ناموس کو برباد کرتے تھے علی بن یوسف کے خاندان میں ایک مدت سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ مرد منہ پر نقاب ڈالے رہتے تھے اور عورتیں کھلے منہ پھرتی تھیں اسی بنا پر یہ لوگ ملثمین کہلاتے تھے محمد بن تومرت نے اول اول ہی دونوں بدعتوں کے مٹانے پر کمر باندھی اور رفتہ رفتہ اسی سلسلہ میں ملثمین کی حکومت برباد ہو کر ایک نئی سلطنت قائم ہو گئی۔ تومرت نے خود فرمانروائی کا قصد نہیں کیا بلکہ ایک لائق شخص کو جس کا نام عبد المومن تھا منتخب کیا عبد المومن اور اس کے خاندان نے جس طرز پر حکومت کی وہ بالکل اس اصول کے موافق تھی جو امام غزالی کی تمنا تھی ابن خلدون کتاب ثالث اخبار بربر فصل ثالث میں عبد المومن اور اس کی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ان کی حکومت کا یہ انداز تھا کہ علما کی عزت کی جاتی تھی اور تمام ملکی اور سلطنتی معاملات میں ان سے مشورہ لیکر کام کیا جاتا تھا اور خواہش کی قدر کی جاتی تھی رعایا پر جو ظلم کرتے تھے ان کو سزا دی جاتی تھی ظالم کا ہاتھ روک دیا گیا تھا شاہی ایوانوں میں مدرسے تعمیر کی گئی تھیں تمام سرحدیں آگے جہاں یورپ کا اندیشہ تھا فوجی طاقت سے مضبوط کر دیے گئے تھے اور غزوات و فتوحات کا روز افزوں سلسلہ جاری تھا"۱

---

۱ الغزالی صفحہ ۱۱۴ ۔

امام غزالی کا عالم اسلام پر اثر

ان علمی و عملی کمالات، ذاتی تنوع اور جامع شخصیت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے عالم اسلام پر بڑا گہرا اثر ڈالا، ان کی عہد آفریں تصنیفات اور مباحث نے علمی حلقوں میں ایک ذہنی تموج اور فکری حریت پیدا کردی اور ان کو نئی غذا اور طاقت پہنچائی، اسلام کی جو چند شخصیتیں صدیوں تک عالم اسلام کے دل و دماغ پر اور اس کے علمی و فکری حلقوں پر حاوی رہی ہیں، ان میں سے ایک امام غزالی کی شخصیت بھی ہے، جن کی اثر آفرینی، علمی پایہ، ان کی تصنیفات کی اہمیت اور تاثیر مخالف اور موافق سب کو تسلیم رہی ہے، صدہا انقلابات کے بعد ان کا نام اور کام آج بھی زندہ ہے، اور ان کی تصنیفات ایک بڑے حلقہ میں مقبول و متداول ہیں اور پڑھنے والوں کو آج بھی متاثر کرتی ہیں۔

عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت، اصلاح عام اور بغداد کے داعی الی اللہ

امام غزالی کی مؤثر شخصیت ان کے علمی و اصلاحی کارناموں کی عظمت کے باوجود عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت باقی تھی، مسلمانوں کی بڑی تعداد علمی شبہات اور خصوصی امراض کے بجائے عام اخلاقی کمزوریاں، عملی کوتاہیوں اور غفلت اور دنیا پرستی کا شکار تھی اور اس کا علاج سادہ اور ضروری تھا، اس لئے فوری طور پر ایک سحر بیان خطیب اور ایک ایسی بلند روحانی شخصیت کی ضرورت تھی جس کا عوام سے زیادہ ربط ہو اور جو اپنی دعوت و مواعظ، تزکیہ و اصلاح سے جمہور اہل اسلام میں دینی روح اور نئی ایمانی زندگی پیدا کردے، مطلق العنان حکومت نے چار سو برس تک مسلمانوں کے اخلاق کو متاثر کیا تھا اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جس کا مقصد زندگی حصول دولت یا جاہ و عزت تھا، اور جو اگرچہ اعتقادی طور پر خدا و آخرت کا منکر نہ تھا، مگر عملاً خدا فراموش، آخرت سے غافل اور عیش پرست تھا، عجمی تہذیب و معاشرت

نے بھی اسلامی زندگی میں اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے اور عجمی عادات اور جاہلی رسوم و تمدن کی عیش پسند زندگی کا معیار بہت بلند ہو گیا تھا، معاشی مطالبات بہت بڑھ گئے تھے، حکام میں مزاج شناس بوقلموں پرست لوگوں کی ایک مستقل قوم پیدا ہو گئی تھی، متوسط طبقہ امراء کے نقش قدم پر تھا، اور عوام اور محنت کش متوسط طبقہ کے اخلاق و عادات سے متاثر ہو رہے تھے، جن کو وسائل معیشت حاصل تھے وہ غلط طریقہ پر ان کو استعمال کرتے تھے اور زندگی سے تمتع اور لطف اندوزی میں مصروف تھے، جو امیر اور تعیشات سے محروم تھے وہ کوفت میں مبتلا تھے اور پیسے کو پیٹ سے بڑھ کر سمجھتے تھے، اہل دولت ایثار و ہمدردی اور جذبۂ شکر سے خالی اور تنگ حال اور محنت کش صبر و قناعت اور تلقین و خودداری سے محروم ہوتے جا رہے تھے، اس طرح زندگی ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا تھی، اس وقت ایک ایسی دعوت کی ضرورت تھی جو دنیا طلبی کے بخار کو کم کرے، ایمان کو بیدار کرے اور آخرت کے یقین کو ابھارے، خدا طلبی کا ذوق پیدا کرے، اللہ تعالیٰ کی سچی معرفت، اس کی بندگی اور رضامندی پر عالی ہمتی اور بلند حوصلگی سے کام لے اور اس راستہ میں مسابقت کرنے کی دعوت دے، توحید کامل کو واشگاف بیان کیا جائے، اہل دنیا و ارباب دولت کی بے وقعتی اور اسباب کی کمزوری کو طاقت اور وضاحت سے بیان کیا جائے۔

داعی کی علمی صلاحیتیں

پانچویں صدی تاریخ اسلام میں علوم و فنون کی ترقی میں خاص امتیاز رکھتی ہے، اس صدی میں دینی عقلی اور ادبی علوم میں بڑے بڑے باکمال اور ائمہ فن پیدا ہوئے ہیں، اسی صدی کے آخر میں علامہ ابو اسحٰق شیرازی (م ۴۷۶ھ) اور امام غزالی (م ۵۰۵ھ) جیسے متبحر عالم اور صاحب فنون ابوالوفا ابن عقیل (م ۵۱۳ھ) جیسے فقیہ اور محقق عبدالقاہر جرجانی (م ۴۷۱ھ) جیسے صاحب ذوق ادیب و محقق اور ابوزکریا تبریزی (م ۵۰۲ھ) جیسے لغوی اور نحوی، ابوالقاسم حریری (م ۵۱۶ھ) جیسے نثار اور صاحب طرز نظم گو پیدا ہوئے جنہوں نے صدیوں دماغوں اور زبانوں پر حکومت کی ہے، اس مردم خیز عہد اور بغداد جیسی شاداب سرزمین میں

وسیع دینی خدمت کے لئے اور ذہنوں اور طبیعتوں کا رخ موڑنے کے لئے اعلیٰ علمی صلاحیتوں اور جامع کمالات شخص کی ضرورت تھی جو اس عصر کے تمام مروجہ علوم میں بلند پایہ رکھتا ہو اور جس کی ہمہ دانی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کے علم و فضیلت کی بھی تحقیر ممکن نہ ہو، وہ اس زمانہ کی معیاری اور علمی زبان میں گفتگو کرتا ہو، اس کی مجلس میں ہر فن کے لوگوں کو حظ حاصل ہو اور کوئی اس کو عامی و جاہل یا واعظ بے علم کہہ کر نظر انداز نہ کرسکے، پھر ضعیف الایمان لوگوں کو اس کی مجلس وعظ اور حلقۂ درس میں یقین کی قوت، ایمان کی حرارت، اہل شک و ارتیاب کو شرح صدر کی دولت، مضطرب و بے چین طبیعتوں اور مجروح دلوں کو سکون قلب کی نعمت، حقائق و معارف کے طالبین و شائقین کو دقیق علوم اور لطیف مضامین کا خزانہ، بے عملوں اور افسردہ دلوں کو جذبات اور دل کے محرکات اور قوت عمل حاصل ہو۔

بغداد کے دو داعی

اس پر از کمالات دور میں اللہ تعالیٰ نے دین کی دعوت اور مسلمانوں میں از سر نو ایمانی حرکت و حرارت اور توبہ و انابت کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے دو ہستیوں کو پیدا کیا جن کی ذات سے دین کو بڑی قوت حاصل ہوئی، ان میں سے ایک کا نام نامی سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہے، دوسرے عبدالرحمن بن الجوزی ہیں، ذوق و رجحان طبع کے اختلاف کے باوجود دونوں نے اپنے زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دین کو ان سے بڑا نفع پہنچایا، اس میں بھی خدا کی بڑی حکمت تھی کہ بغداد جو خلافت کے قیام و دعوت کا مرکز تھا، جو عالم اسلام کا مرکز اعصاب اور اس کا علمی و سیاسی دار السلطنت تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو خدمت کے لئے طویل عمر اور وسیع میدان بھی عطا فرمایا۔

مذہب حنبلی کے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ دونوں صاحبوں کا تعلق اسی مذہب کی فقہ و اصول سے ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

تعلیم و تکمیل

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی ولادت گیلان[1] میں ۴۷۰ھ[2] میں ہوئی، آپ کا نسب چند واسطوں سے سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے، ۱۸ سال کی عمر میں ۴۸۸ھ میں بغداد تشریف لائے، یہی وہ سال ہے جس سال امام غزالیؒ نے تلاش حق و حصول یقین کے لئے بغداد کو خیرباد کہا تھا، یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک جلیل القدر امام سے جب بغداد محروم ہوا تو دوسرا جلیل القدر مصلح و روحانی امام کا وہاں ورود ہوا، آپ بغداد میں پوری عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول ہو گئے، عبادت و مجاہدات کی طرف طبعی کشش کے باوجود آپ نے تحصیل علم میں قناعت و زہد سے کام نہیں لیا، ہر علم کو اس کے باکمال استادوں اور صاحب فن عالموں سے حاصل کیا اور اس میں پوری دستگاہ پیدا کی، آپ کے اساتذہ میں ابوالوفاء ابن عقیل، محمد بن الحسن الباقلانی اور ابو زکریا تبریزی جیسے نامور علماء و ائمۂ فن کے نام

---

[1] جیلان یا گیلان کو دیلم بھی کہا جاتا ہے، یہ ایران کے شمالی مغربی حصہ کا ایک صوبہ ہے، اس کے شمال میں روسی سرزمین [illegible] واقع ہے، جنوب میں بڑا پہاڑی سلسلہ ہے جو اس کو آذربائیجان اور عراق عجم سے علیحدہ کرتا ہے، جنوب میں مازندران کا مشرقی حصہ ہے، ورشتان میں بحر خزر و دین کا مغربی حصہ وہ ایران کے بہت خوبصورت علاقوں میں شمار ہوتا ہے [illegible]

[2] ابن کثیر ج ۱۲ ص ۲۵۲ [3] البدایہ والنہایہ (مختصراً) ج ۱۲ ص ۱۴۹

تصوف آداب طریقت کی تعلیم شیخ ابو الخیر حماد بن مسلم الدباس[1] سے حاصل کی اور قاضی ابو سعید مخرمی[2] سے تکمیل کی اور اجازت حاصل کی[3]۔

اصلاح و ارشاد اور رجوع عام

ظاہری و باطنی تکمیل کے بعد اصلاح و ارشاد کی طرف متوجہ ہوئے، مسند درس اور مسند ارشاد کو بیک وقت زینت دی۔ اپنے استاد و شیخ مخرمی کے مدرسہ میں تدریس اور وعظ کا سلسلہ شروع کیا۔ بہت جلد مدرسہ کی توسیع کی ضرورت پیش آگئی، مخلصین نے عمارت میں اضافہ کر کے اس کو آپ کی مجالس کے قابل بنا دیا، لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ مدرسہ میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی، سارا بغداد آپ کے مواعظ پر ٹوٹ پڑا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسی وجاہت و قبولیت عطا فرمائی جو بڑے بڑے بادشاہوں کو نصیب نہیں۔ شیخ موفق الدین ابن قدامہ صاحب المغنی کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کی آپ سے بڑھ کر دین کی وجہ سے تعظیم ہوتے نہیں دیکھی، بادشاہ اور وزراء آپ کی مجالس میں نیازمندانہ حاضر ہوتے اور ادب سے بیٹھ جاتے، علماء و فقہاء کا کچھ شمار نہ تھا، ایک ایک مجلس میں چار چار سو دواتیں شمار کی گئی ہیں جو آپ کے ارشادات قلمبند کرنے کے لئے لائی جاتیں۔

محامد و اخلاق

باایں رفعت و منزلت حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے، ایک بچہ اور ایک لڑکی بھی

---

[1] ابن جوزی نے لکھا ہے کہ زہد و دنیا کی تربیت میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا [illegible] ۵۲۵ھ میں انتقال ہوا۔ طبقات الحنابلہ [illegible] [2] اصل نام مبارک بن علی بن الحسین ہے، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ فقہ و حدیث کا سماع ہوا تھا، مذہب حنبلی کے فقیہ [illegible] بہت صاحب ثروت تھے، ۵۱۳ھ میں وفات پائی۔ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ذیل طبقات الحنابلہ لابن رجب

بچے، لونڈی کی کھڑے ہو کر سنتے اور ان کا کام کرتے، غریبوں اور فقراء کے پاس بیٹھتے اور ان کے کپڑوں کو صاف کرتے، جوئیں نکالتے، لیکن اس کے برخلاف کسی معزز آدمی اور ارکان سلطنت کی تعظیم میں کھڑے نہ ہوتے، خلیفہ کی آمد ہوتی تو قصداً دولت خانہ میں تشریف لے جاتے، یہاں تک کہ خلیفہ آکر بیٹھ جاتا، پھر برآمد ہوتے تاکہ تعظیماً کھڑا نہ ہونا پڑے، کبھی کسی وزیر یا سلطان کے دروازہ نہیں گئے۱؎۔

آپ کے دیکھنے والے اور آپ کے معاصرین آپ کے حسن اخلاق، حلم و حوصلہ، تواضع و انکسار، سخاوت و ایثار اور اعلیٰ اخلاق و اوصاف کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، ایک بزرگ (جرادہ) جنہوں نے بڑی طویل عمر پائی اور بہت سے بزرگوں اور ناموروں کو دیکھا اور ان کی صحبت اٹھائی، فرماتے ہیں:۔

ما رأت عيناي أحسن خلقاً ولا أوسع	میری آنکھوں نے حضرت شیخ عبد القادر سے بڑھ کر
صدراً ولا أكرم نفساً ولا ألطف قلباً	کوئی خوش اخلاق، فراخ حوصلہ، کریم النفس، نرم دل اور
ولا أحفظ عهداً وودّاً من سيدنا الشيخ	محبت اور تعلقات کا پاس کرنے والا نہیں دیکھا، آپ
عبد القادر ولقد كان مع جلالة قدره	عظمت اور علو مرتبت اور وسعت علم کے باوجود چھوٹے
وعلو منزلته وسعة علمه يقف	کی رعایت فرماتے، بڑے کی توقیر کرتے، سلام میں سبقت
مع الصغير ويوقر الكبير ويبدأ بالسلام	فرماتے، کمزوروں کے پاس اٹھتے بیٹھتے، غریبوں کے ساتھ
ويجالس الضعفاء ويتواضع للفقراء	تواضع و انکسار سے پیش آتے حالانکہ آپ کسی
وما قام لأحد من العظماء ولا الأعيان	سربرآوردہ یا رئیس کے لئے تعظیماً کھڑے نہیں ہوئے
ولا ألمّ بباب وزير ولا سلطان۲؎	نہ کبھی کسی وزیر یا حاکم کے دروازہ پر گئے۔

الامام الحافظ ابو عبد اللہ محمد بن یوسف البرزالی الاشبیلی ان الفاظ میں آپ کی تعریف کرتے ہیں۔

كان مجاب الدعوة سريع الدمعة	آپ مستجاب الدعوات تھے، اکثر ذکر کرتے، بہت اور

۱؎ الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۱۲۷ ۲؎ ایضاً ص ۱۲۸ ۳؎ ایضاً ص ۱۲۸ ۴؎ ایضاً

دائم الذکر کثیر الفکر فی حق الذنب	رقت کی بات کہی جاتی تو جلد ہی آنکھ میں آنسو
دائم الشکر له یحیا لنفسه حتی البدء	آجاتے ہمیشہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے، بڑے متقی
غزیر العلم شریف الاخلاق طیب	القلب تھے قدم ثابت، شگفتہ رو، کریم النفس
الاعراق مع قدم راسخ فی العبادۃ	فراخ دست، وسیع العلم، بلند اخلاق، ملنسار
والاجتہاد[1]	عبادات اور مجاہدہ میں آپ کا پایہ بلند تھا۔

مفتی عراق محی الدین ابو عبد اللہ محمد بن حامد البغدادی لکھتے ہیں:۔

ابعد الناس عن الفحش واقرب	غیر مناسب بات سے اجتناب، رواداری اور عفو
الناس الی الحق شدید الغضب	سے بہت قریب، اگر احکام خداوندی اور
اذا انتهک من محارم الله عز وجل	حدود الٰہی میں سے کسی کی بے حرمتی ہوتی تو آپ کو
لا یغضب لنفسه ولا ینتصر لغیر ربه	جلال آجاتا، خود اپنے معاملہ میں کبھی غصہ نہ آتا، اللہ
	عزوجل کے علاوہ کسی چیز کے لئے انتقام نہ لیتے
	کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کرتے خواہ بدن کا
	کپڑا ہی کیوں نہ اتار کر دینا پڑے۔

بھوکوں کو کھانا کھلانے اور ضرورت مندوں پر بے دریغ خرچ کرنے کا خاص ذوق تھا، علامہ ابن النجار آپ کا قول نقل کرتے ہیں کہ "اگر ساری دنیا کی دولت میرے قبضہ میں ہو تو میں بھوکوں کو کھانا کھلا دوں" یہ بھی فرماتے "مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری ہتھیلی میں سوراخ ہے، کوئی چیز اس میں ٹھہرتی نہیں، اگر ہزار دینار میرے پاس آئیں تو رات نہ گزرنے پائے"[2] صاحب قلائد الجواہر لکھتے ہیں "آپ کا حکم تھا کہ رات کو وسیع دسترخوان بچھے، خود مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، کمزوروں اور غریبوں کی ہم نشینی فرماتے۔"

---

[1] قلائد الجواہر ص ۸ [2] ایضاً

طلبہ کی باتوں کو برداشت کرتے اور تحمل فرماتے، ہر شخص یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر کوئی ان کا مقرب اور ان کے یہاں معزز نہیں، ساتھیوں میں سے جو غیر حاضر ہوتا اس کا حال دریافت فرماتے اور اس کی فکر رکھتے، تعلقات کا بڑا پاس اور لحاظ تھا، غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر کرتے، اگر کوئی کسی بات پر قسم کھا لیتا تو اس کو مان لیتے اور جو کچھ حقیقت حال جانتے تھے اس کا اخفا فرماتے۔[1]

مردہ دلوں کی مسیحائی

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی کثرت کرامت پر مورخین کا اتفاق ہے، شیخ الاسلام عز الدین بن عبدالسلامؒ اور امام ابن تیمیہ کا قول ہے کہ شیخ کی کرامات حد تواتر کو پہنچ گئی ہیں، ان میں سب سے بڑی کرامت مردہ دلوں کی مسیحائی تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب کی توجہ اور زبان کی تاثیر سے لاکھوں انسانوں کو نئی ایمانی زندگی عطا فرمائی، آپ کا وجود اسلام کے لئے ایک باد بہاری تھا جس نے دلوں کے قبرستان میں نئی جان ڈال دی اور عالم اسلام میں ایمان و روحانیت کی ایک نئی لہر پیدا کر دی، شیخ عمر کیسانی کہتے ہیں کہ کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں یہودی اور عیسائی اسلام نہ قبول کرتے ہوں، اور رہزن، خونی اور جرائم پیشہ توبہ سے مشرف نہ ہوتے ہوں، فاسد الاعتقاد اپنے غلط عقائد سے توبہ نہ کرتے ہوں۔[2]

جبائی کا بیان ہے کہ مجھ سے حضرت شیخ نے ایک روز فرمایا کہ میری تمنا ہوتی ہے کہ زمانۂ سابق کی طرح صحراؤں اور جنگلوں میں رہوں، نہ مخلوق مجھے دیکھے نہ میں اس کو دیکھوں، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا نفع منظور ہے، میرے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی مسلمان ہو چکے ہیں، عیاروں اور جرائم پیشہ لوگوں میں سے ایک لاکھ سے زائد توبہ کر چکے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔[3]

مورخین کا بیان ہے کہ بغداد کی آبادی کا بڑا حصہ حضرت کے ہاتھ پر توبہ سے مشرف ہوا اور

---

[1] قلائد الجواہر ص ۸ [2] ذیل طبقات الحنابلہ ابن رجب جلد ۱ ص ۲۹۵ [3] قلائد الجواہر و مختلف کتب تذکرہ

بکثرت یہودی، عیسائی اور اہل ذمہ مسلمان ہوئے[1]

تعلیمی مشاغل و خدمات

اعلیٰ مراتب ولایت پر فائز ہونے اور نفوس و اخلاق کی اصلاح و تربیت میں ہمہ تن مشغول ہونے کے ساتھ آپ درس و تدریس، افتاء اور تصحیح اعتقاد اور مذہب اہل سنت کی نصرت و حمایت سے غافل نہ تھے، عقائد و اصول میں امام احمد اور محدثین کے مسلک پر تھے، مذہب اہل سنت اور سلف کے مسلک کو آپ سے بڑی تقویت حاصل ہوئی، اور اس کے مقابلہ میں اعتقادی و عملی بدعات کا بازار سرد ہو گیا۔ ابن السمعانی کہتے ہیں: مسلکِ سنت کی شان آپ کی وجہ سے بڑھ گئی اور ان کا پلہ بھاری ہو گیا۔[2]

مدرسہ میں ایک سبق تفسیر کا، ایک حدیث کا، ایک فقہ کا اور ایک اختلاف ائمہ اور ان کے دلائل کا پڑھاتے تھے، صبح و شام تفسیر، حدیث، فقہ، مذاہب ائمہ، اصول فقہ اور نحو کے اسباق ہوتے، ظہر کے بعد تجوید کی تعلیم ہوتی، اس کے علاوہ افتاء کی مشغولیت تھی، آپ مذہب شافعی اور مذہب حنبلی کے مطابق فتویٰ دیتے، علماء عراق آپ کے فتاویٰ سے بڑے متعجب ہوتے اور بڑی تعریف کرتے۔[3]

ایک مرتبہ استفتاء آیا کہ ایک شخص نے قسم کھائی ہے کہ وہ کوئی ایسی عبادت کرے گا جس میں عبادت کے وقت کوئی دوسرا شخص شریک نہ ہو، اگر اس نے قسم پوری نہیں کی تو اس کی بیوی کو تین طلاق، علماء یہ استفتاء سن کر حیرت میں پڑ گئے کہ ایسی کون سی عبادت ہو سکتی ہے جس میں وہ بالکل تنہا ہو، اور روئے زمین پر کوئی شخص بھی اس وقت وہ عبادت نہ کر رہا ہو، حضرت شیخ کے پاس استفتاء آیا تو آپ نے فی الفور لکھا کہ مطاف اس کے لئے خالی کر دیا جائے اور وہ سات چکر کر کے طواف تنہا مکمل کرے، علماء نے یہ جواب سن کر بے ساختہ داد تحسین دی اور کہا کہ یہی ایک صورت ہے کہ وہ بلا شرکت غیرے عبادت کرے اور اپنی

---

[1] قلائد الجواہر بحوالہ کتب مذکورہ
[2] الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۱۲۸
[3] ذیل طبقات الحنابلہ ابن رجب

قسم پوری کرے، اس لئے کہ طواف بیت اللہ پر موقوف ہے، اور مطاف اس شخص کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اب اس عبادت میں کہیں بھی شرکت کا امکان نہیں۔[1]

استقامت و تحقیق

حضرت شیخ استقامت کا پہاڑ تھے، اتباع کامل، علم راسخ اور تائید غیبی نے آپ کو اس مقام پر پہونچا دیا تھا کہ حق و باطل، نور و ظلمت، الہام صحیح اور کید شیطانی میں پورا امتیاز پیدا ہو گیا تھا، آپ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی تھی کہ شریعت محمدی کے احکام اور حلال و حرام میں قیامت تک کے لئے تغیر و تبدل کا امکان نہیں، جو اس کے خلاف دعویٰ کرے وہ شیطان ہے، ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک بڑی عظیم الشان روشنی ظاہر ہوئی جس سے آسمان کے کنارے بھر گئے، اس سے ایک صورت ظاہر ہوئی، اس نے مجھ سے خطاب کر کے کہا کہ اے عبدالقادر! میں تمہارا رب ہوں، میں نے تمہارے لئے سب محرمات حلال کر دیئے ہیں، میں نے کہا دور ہو مردود، یہ کہتے ہی وہ روشنی ظلمت سے بدل گئی اور وہ صورت دھواں بن گئی، اور ایک آواز آئی کہ عبدالقادر! خدا نے تم کو تمہارے علم و تفقہ کی وجہ سے بچا لیا، ورنہ اس طرح میں ستر صوفیوں کو گمراہ کر چکا ہوں، میں نے کہا کہ اللہ کی مہربانی ہے، کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کیسے سمجھے کہ یہ شیطان ہے؟ فرمایا اس کے کہنے سے کہ میں نے حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا۔[2]

یہ بھی آپ کا ارشاد ہے کہ اگر حدود الٰہی (احکام شرعی) میں سے کوئی حد ٹوٹتی ہو تو سمجھو کہ تم فتنہ میں پڑ گئے ہو، اور شیطان تم سے کھیل رہا ہے، فوراً شریعت کی طرف رجوع کرو، اس کو مضبوط تھام لو، نفس کی خواہشات کو جواب دو، اس لئے کہ ہر وہ حقیقت جس کی شریعت تائید نہیں کرتی باطل ہے۔[3]

---

[1] الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۱۲۶، و طبقات الحنابلہ (ابن رجب) [2] ایضاً ص ۱۲۵ [3] ایضاً۔

تفویض و توحید

تسلیم و تفویض اور توحید کامل حضرت کا خصوصی حال تھا، کبھی کبھی تعلیماً اس حال اور اس مقام کی تشریح فرماتے تھے، وہ دراصل آپ کا حال ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں　　گفتہ آید در حدیث دیگراں

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"جب بندہ کسی بلا میں مبتلا کیا جاتا ہے تو پہلے وہ خود اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اگر نجات نہیں پاتا تو مخلوقات میں سے اوروں سے مدد مانگتا ہے مثلاً بادشاہوں یا حاکموں یا دنیاداروں یا امیروں سے اور دردوں کو طبیبوں سے، جب ان سے بھی کام نہیں نکلتا اس وقت اپنے پروردگار کی طرف دعا اور گریہ و زاری و حمد و ثنا کے ساتھ رجوع کرتا ہے، دیکھئے جب تک اپنے نفس سے مدد مل جاتی ہے خلق سے رجوع نہیں کرتا، اور جب تک خلق سے مدد مل جاتی ہے خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، پھر جب خدا کی طرف سے بھی کوئی مدد نظر نہیں آتی تو پڑا رہتا ہے بیکس خدا کے آستانہ میں پڑا رہتا ہے اور ہمیشہ سوال و دعا اور گریہ و زاری اور عاجزی و اظہار حاجت مندی، امید و بیم کے ساتھ کیا کرتا ہے پھر خدا اس کو دعا سے بھی تھکا دیتا ہے اور قبول نہیں کرتا یہاں تک کہ کل اسباب منقطع ہو جاتے ہیں اور وہ سب سے علیحدہ ہو جاتا ہے، اس وقت اس میں (احکام) قضا و قدر کا نفاذ ہوتا ہے اور اس کے اندر (خدا اپنا) کام کرتا ہے تب بندہ کل اسباب و حرکات سے بے پروا ہو جاتا ہے اور روح محض رہ جاتا ہے اسے فعل حق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور وہ ضرورۃً صاحب یقین موحد ہو جاتا ہے، قطعی طور پر جانتا ہے کہ درحقیقت خدا کے سوا نہ کوئی (کچھ) کرنے والا ہے اور نہ حرکت و سکون دینے والا، نہ کسی کے ہاتھ میں اچھائی اور برائی، نفع و نقصان، بخشش و حرمان، کشائش و بندش، موت و زندگی، عزت

وقت فنا و فقر) اس وقت (احکام قضا و قدر) میں بندہ کی یہ حالت ہوتی ہے جیسے شیر خوار بچہ دایہ کی گود میں یا مردہ غسال کے ہاتھ میں یا (پولو کا) گیند سوار کے قبضہ میں کہ الٹا پلٹا جاتا ہے اور بگاڑا بنایا جاتا ہے اس میں اپنی طرف سے کوئی حرکت نہیں نہ اپنے لئے نہ کسی اور کے لئے یعنی بندہ اپنے مالک کے فعل میں اپنے نفس میں غائب ہو جاتا ہے اور اپنے مالک و مولیٰ کے فعل کے سوا نہ کچھ دیکھتا سنتا ہے نہ کچھ سوچتا سمجھتا اگر دیکھتا ہے تو اس کی صنعت اور اگر سنتا ہے تو اسی کا کلام اس کے علم سے (ہر چیز کو) جانتا ہے اس کی نعمت سے لطف اٹھاتا ہے اس کے قرب سے سعادت پاتا ہے اس کی تقریب بہانے سے آراستہ پیراستہ ہوتا ہے اس کے وعدہ سے خوش ہوتا ہے سکون پاتا اور اطمینان حاصل کرتا ہے اس کی باتوں سے انس ہوتا ہے اور اس کے غیر سے وحشت و نفرت کرتا ہے اس کی یاد میں سرنگوں ہوتا اور جی لگاتا ہے اس کی ذات پر اعتماد و بھروسہ کرتا ہے اس کے نور معرفت سے ہدایت پاتا اور اس کا زیور و لباس پہنتا ہے اس کے علوم عجیبہ پر اور مطلع ہوتا ہے اس کی قدرت کے اسرار سے حضرت حق تعالیٰ اس کی ذات پاک سے (ہر بات) سنتا اور اسے یاد رکھتا ہے پھر ان (نعمتوں) پر حمد و ثنا و شکر و سپاس کرتا ہے۔[1]

خلق خدا پر شفقت

عامۃ الناس اور امت محمدیہ کے ساتھ آپ کو جو تعلق ہوگا اور اس کے حال پر جو شفقت تھی اور جو نائبین رسول اور مقبولین کی خاص علامت ہے اس کا اندازہ آپ کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے جس میں آپ نے بازار میں جانے والوں کے احوال و مراتب بیان کئے ہیں ان میں آخری مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں اور در اصل حدیث دیگراں میں اپنا ہی حال اور مقام بیان کرتے ہیں۔

«اور پانچواں وہ شخص ہے کہ جب بازار میں داخل ہوتا ہے تو ترس سے اس کا دل بھر جاتا ہے خدا کے لوگوں پر

---

[1] فتوح الغیب مقالہ (۲۳) ترجمہ مولوی محمد عالم صاحب کاکوروی (اردو فتوح الغیب) صفحہ ۱۲۱، ۱۲۲

رحمت کرنے لگتا ہے اور یہ رحمت اسے کچھ بھی ہونے نہیں دیتی کہ ان لوگوں نے کس طرح کا برتاؤ کیا ہے وہ اپنے داخلے کے وقت سے باہر نکلنے کے وقت تک بازار والوں کے لئے دعا و استغفار و شفاعت میں اور ان پر رحمت و شفقت میں مشغول رہتا ہے اس کا دل ان لوگوں کے لئے ان کے حال پر جلتا رہتا ہے اور آنکھیں روتی رہتی ہیں اور زبان ان نعمتوں پر جو خدا نے ان لوگوں کو اپنے فضل سے دی ہیں خدا کا شکر اور اس کی حمد و ثنا کرتی رہتی ہے۔[1]

حضرت شیخ کا عہد اور ماحول

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بغداد میں ۷۳ سال گزارے اور عباسی خلفاء میں پانچ ان کی نظروں کے سامنے یکے بعد دیگرے مسند خلافت پر بیٹھے، جس وقت وہ بغداد میں رونق افروز ہوئے اس وقت خلیفہ مستظہر باللہ ابو العباس (م ۵۱۲ھ) کا عہد تھا، ان کے بعد بالترتیب مسترشد، راشد، المقتفی لامر اللہ، والمستنجد باللہ تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔

شیخ کا یہ عہد بہت اہم تاریخی واقعات سے لبریز ہے، سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء کی باہمی کشمکش اس زمانہ میں اپنے عروج پر تھی، یہ سلاطین عباسی حکومت پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے دل و جان سے کوشاں تھے، کبھی خلیفہ کی رضامندی کے ساتھ، اور کبھی اس کی مخالفت و ناراضی کے باوجود، کبھی کبھی خلیفہ اور سلطان کے لشکروں میں باقاعدہ معرکہ آرائی بھی ہوتی تھی، اور مسلمان ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہاتے۔

اسی طرح کے واقعات مسترشد کے زمانہ میں کئی مرتبہ پیش آئے، یہ عہد عباسی کا سب سے زیادہ طاقتور اور معقول خلیفہ تھا،[2] اور اکثر معرکوں میں فتح بھی اسی کو حاصل ہوتی، لیکن ۱۰ رمضان ۵۲۹ھ میں سلطان مسعود

---

[1] فتوح الغیب مقالہ ۱، ترجمہ مولوی محمد عالم صاحب کاکوروی موسوم بہ رموز الغیب ص ۱۹
[2] ابن اثیر نے اس کے مناقب میں لکھا ہے کہ مسترشد بہت شجاع، بلند ہمت، فصیح و بلیغ، شیریں کلام، اور بہت عبادت گزار خلیفہ تھا، اور رعب و داب کا مالک تھا۔

اور اس کے درمیان جو معرکہ ہوا اس میں اس کو شکست فاش ہوئی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:-

> سلطان مسعود کو فتح ہوئی، خلیفہ قید کر لیا گیا، اہل بغداد کی املاک کو لوٹ لیا گیا اور یہ خبر دوسرے تمام صوبوں میں پھیل گئی، اہل بغداد اس الم ناک خبر سے بہت متاثر ہوئے، اور وہاں کے باشندوں میں ماتم برپا ہو گیا، اس پر مستزاد ایک زلزلہ آگیا، عوام نے مسجد کے منبروں تک کو توڑ ڈالا اور جماعتوں میں شرکت کرنا بھی چھوڑ دیا، عورتیں سر سے دوپٹہ پھینک کر نوحہ و ماتم کرتی ہوئی باہر نکل آئیں اور خلیفہ کی قید، اور اس کی پریشانیوں و مصیبتوں کا ماتم کرنے لگیں، دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے اور اس کے بعد یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ تمام بلاد و امصار اس سے متاثر ہو گئے۔ ملک سنجر نے یہ احوال دیکھ کر اپنے بھتیجے مسعود کو اس کی ذلت اور اہمیت سے آگاہ اور خبردار کیا، اور اس کو حکم دیا کہ خلیفہ کو بحال کرے، ملک مسعود نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن خلیفہ کو باطنیوں نے قید خانہ کے اندر قتل کر دیا۔[1]

یہ تمام الم انگیز واقعات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نگاہوں کے سامنے گزرے، انھوں نے مسلمانوں کے باہمی افتراق و خانہ جنگی اور دشمنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کی محبت کی خاطر اور ملک و سلطنت اور جاہ و منصب کے حصول کے لئے لوگ سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہیں، دینی زعماء کو صرف دربار کی شان و شوکت سے دلچسپی باقی رہ گئی ہے، وہ اہل سلطنت کو تقدس کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں اور صوبوں اور شہروں کی حکومت حاصل کرنے کے لئے عمر و عزت کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا دامن ان رجحانات و واقعات سے علیحدہ اور دور رہا ہو لیکن اپنے شعور و احساس کے ساتھ وہ اس آگ میں جل رہے تھے اور اسی سوز دروں نے ان کو پوری ہمت، طاقت اور اخلاص

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۰۶) سب کی امیدوں کا مرکز و محبوب تھا، وہ آخری خلیفہ تھا جس نے خطبہ دینے کی رسم برقرار رکھی، ۵۲۹ھ میں [illegible] لشکر کے درمیان اس کو شہید کر دیا گیا، اس کی مدت خلافت [illegible] (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۲۰۷)

کے ساتھ وعظ و ارشاد و دعوت و تربیت اصلاح نفوس اور تزکیۂ قلوب کی طرف توجہ کیا اور اعراض نفاق اور حب دنیا کی تحقیر و تذلیل ایمانی شعور کے احیاء عقیدۂ آخرت کی تذکیر اور اس سرائے فانی کی بے ثباتی کے مقابلہ میں اس حیات جاودانی کی اہمیت، تہذیب اخلاق، توحید خالص اور اخلاص کامل کی دعوت پر سارا زور صرف کر دیا۔

مواعظ و خطبات

حضرت شیخ کے مواعظ دلوں پر بجلی کا اثر کرتے تھے اور وہ تاثیر آج بھی آپ کے کلام میں موجود ہے، فتوح الغیب اور الفتح الربانی کے مضامین اور آپ کی مجالس کے وعظ کے الفاظ آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں، ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے تابعین اور عارفین کاملین کے کلام کی طرح یہ مضامین بھی ہر وقت کے مناسب اور سامعین اور مخاطبین کے حالات و ضروریات کے مطابق ہوتے تھے، عام طور پر لوگ جن بیماریوں میں مبتلا اور جن مغالطوں میں گرفتار تھے انہیں کا ازالہ کیا جاتا تھا، اس لئے ہر حاضر آپ کے ارشادات میں اپنے زخم کا مرہم اپنے مرض کی دوا، اور اپنے سوالات و شبہات کا جواب پاتا تھا اور تاثیر و عام نفع کی یہ ایک بڑی وجہ تھی، پھر آپ زبان مبارک سے جو فرماتے تھے وہ دل سے نکلتا تھا اسی لئے دل پر اثر کرتا تھا، آپ کے کلام میں بلا کی شوکت و عظمت بھی ہے اور دل آویزی اور حلاوت بھی اور صدیقین کے کلام کی یہی شان ہے۔

توحید خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی

اس وقت ایک عالم کا عالم اہل حکومت اور اہل دولت کے دامن سے وابستہ تھا، لوگوں نے مختلف انسانوں اور مختلف ہستیوں کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ لیا تھا، اسباب کو ارباب کا درجہ دے دیا گیا

تھا اور قضا و قدر کو بھی اپنے جیسے انسانوں سے متعلق سمجھ لیا گیا تھا ایک ایسی فضا میں حضرت شیخ فرماتے ہیں:

"کل مخلوقات کو اس طرح سمجھو کہ بادشاہ نے جس کا ملک بہت بڑا اور حکم سخت اور جس کی ہیبت دل ہلا دینے والی ہے، ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں بیڑی ڈال کر ایک صنوبر کے درخت میں ایک نہر کے کنارے جس کی موجیں زبردست، پاٹ بہت بڑا، تھاہ بہت گہری، بہاؤ بہت تند ہے، لٹکا دیا ہے اور خود ایک عظیم اور بلند کرسی پر کہ اس تک پہنچنا مشکل ہے تشریف فرما ہے اور اس کے پہلو میں تیر و پیکان، نیزہ و کمان اور ہر طرح کے اسلحہ کا انبار ہے جن کی مقدار بادشاہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اب ان میں سے جو چیز چاہتا ہے اٹھا کر اس لٹکے ہوئے قیدی پر چلاتا ہے تو کیا (یہ تماشا) دیکھنے والے کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ سلطان کی طرف سے نظر ہٹا لے اور اس کا خوف و امید ترک کر دے اور لٹکے ہوئے قیدی سے امید و خوف رکھے؟ کیا جو شخص ایسا کرے عقل کے نزدیک بے عقل نہیں، دیوانہ، چوپایہ اور انسانیت سے خارج نہیں ہے؟ خدا کی پناہ بینائی کے بعد نابینائی اور وصول کے بعد جدائی اور قرب و ترقی کے بعد تنزل اور ہدایت کے بعد گمراہی اور ایمان کے بعد کفر سے"[1]

ایک دوسری مجلس میں توحید و اخلاص اور ماسوائے اللہ سے انقطاع کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں:۔

"اس پر نظر رکھو جو تم پر نظر رکھتا ہے، اس کے سامنے رہو جو تمہارے سامنے رہتا ہے، اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرتا ہے، اس کی بات مانو جو تم کو بلاتا ہے، اپنا ہاتھ اسے دو جو تم کو گرنے سے سنبھال لے گا اور تم کو جہل کی تاریکیوں سے نکال لے گا اور ہلاکتوں سے بچا لے گا، تمہاری نجاستیں دھو کر میل کچیل سے پاک کرے گا، تم کو تمہاری سڑاند اور بدبو اور پست ہمتی اور نفس بدکار و رفیقان گمراہ و گمراہ کن سے نجات دے گا، جو شیاطین ہیں تمہارے اور تمہارے جاہل دوست ہیں خدا کی راہ کے رہزن اور ہر عزیز و نفیس اور ہر عمدہ اور بیش بہا چیز سے محروم رکھنے والے، کب تک عادت؟ کب تک مخلوق؟ کب تک خواہش؟ کب تک

---

[1] رموز الغیب ترجمہ فتوح الغیب مقالہ (۱۴) ص ۴۹

رعونت ہو کب تک دنیا! کب تک آخرت! کب تک اسوائے حق! کہاں چلے تم! (اس خدا کو چھوڑ کر جو) ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور بدلنے والا ہے اول ہے آخر ہے ظاہر ہے باطن ہے۔ پھر دلوں کی محبت، روحوں کا اطمینان، گرانیوں سے سبکدوشی، بخشش و احسان ان سب کا رجوع اسی کی طرف ہے اور اسی کی طرف سے اس کا صدور ہے[1]

ایک دوسری مجلس میں اسی توحید کے مضمون کو اس طرح و شگفتہ بیان فرماتے ہیں:۔

ساری مخلوق عاجز ہے نہ کوئی تجھ کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، بس حق تعالیٰ اسی کو ان کے ہاتھوں کرا دیتا ہے اسی کا فعل ہے جو تیرے اندر اور مخلوق کے اندر تصرف فرماتا ہے جو کچھ تیرے لئے مفید ہے یا مضر ہے اس کے متعلق اللہ کے علم میں قلم چل چکا ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، جو موحد اور نیکوکار ہیں وہ باقی مخلوق پر اللہ کی حجت ہیں، بعض ان میں سے ایسے ہیں جو ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے دنیا سے برہنہ ہیں گو دولت مند ہیں، حق تعالیٰ ان کے باطنوں پر دنیا کا کوئی اثر نہیں پاتا، یہی قلوب ایسے ہیں جو صاف ہیں جو شخص اس پر قادر ہوا اس کو مخلوقات تک کی بادشاہت مل گئی وہ بہادر پہلوان ہے، بہادر وہی ہے جس نے اپنے قلب کو ماسوائے اللہ سے پاک بنایا، اور قلب کے دروازہ پر توحید کی تلوار اور شریعت کی شمشیر لے کر کھڑا ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس میں داخل نہیں ہونے دیتا، اپنے قلب کو مقلب القلوب سے وابستہ کرتا ہے شریعت اس کے ظاہر کو تہذیب سکھاتی ہے اور توحید و معرفت باطن کو مہذب بناتی ہیں[2]

معبودانِ باطل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

آج تو اعتماد کر رہا ہے اپنے نفس پر، مخلوق پر، اپنے دیناروں پر، اپنے درہموں پر، اپنی خرید و فروخت پر، اور اپنے شہر کے حاکم پر، ہر چیز کہ جس پر تو اعتماد کرے وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص

---

[1] فتوح الغیب مقالہ (۲۰) [2] [illegible] الفتح الربانی مجلس ۱۳ صفحہ

جس سے تو خوف کرے یا توقع رکھے وہ تیرا معبود ہے اور ہر شخص جس پر نفع اور نقصان کے متعلق تیری نظر ہے اور تو یوں نہ سمجھے کہ حق تعالیٰ ہی اس کے ہاتھ میں اس کا جاری رکھنے والا ہے تو وہ تیرا معبود ہے"[1]

ایک دوسرے موقع پر خدا کی غیرت، شرک سے نفرت اور انسان کی محبوب چیزوں کے سلب اور ضائع ہو جانے کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

"اکثر تم کہتے ہو گے اور کہو گے کہ میں جس سے محبت کرتا ہوں اس میں میری محبت رہنے نہیں پاتی اور بیچ پڑ جاتا ہے یا تو جدائی ہو جاتی ہے یا وہ مر جاتا ہے یا دشمنی ہو جاتی ہے اور مال سے اگر محبت کرتا ہوں تو وہ ضائع ہو جاتا ہے اور ہاتھ سے نکل جاتا ہے تب تم سے کہا جائے گا کہ اے خدا کے محبوب اے وہ کہ جس پر خدا کی عنایت ہے اور وہ خدا کا منظور نظر ہے اے وہ جس کے لئے اور جس پر خدا کی غیرت آتی ہے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ غیور ہے اس نے تم کو اس لئے پیدا کیا اور تم غیر کے ہو رہنا چاہتے ہو کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے اور وہ اسے" اور یہ ارشاد کہ "میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں" کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ "خدا جب کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اسے مبتلا کرتا ہے پھر اگر وہ صبر کرتا ہے تو اسے رکھ چھوڑتا ہے" عرض کیا گیا یا رسول اللہ رکھ چھوڑنے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا "اس کے مال و اولاد کو باقی نہیں رکھتا" اور یہ مصلحت اس لئے ہے کہ جب مال و اولاد ہوں گے تو اسے ان کی محبت بھی رہے گی اور خدا سے جو محبت ہے متفرق اور ناقص اور تقسیم ہو کر حق اور غیر حق میں مشترک ہو جائے گی، اور خدا شریک کو قبول نہیں کرتا وہ غیور ہے، ہر چیز پر غالب زبردست ہے تو وہ اپنے شریک کو ہلاک معدوم کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنے بندہ کے دل کو خالص کرے خاص اپنے لئے بغیر شرکت کے، اس وقت اس کا یہ ارشاد صادق آ جاتا ہے کہ "وہ ان لوگوں کو

---

[1] فیوض یزدانی مجلس ۲۰، ص ۱۳۲

دوست رکھتا ہے اور وہ لوگ اسے پہلے تنگ کرتے جب (خدا کی ان معنوی) فقیروں اور برابری کرنے والوں سے جو اہل دنیا ہیں دولت و لذت اور خواہشیں ہیں نیز ولایت و ریاست کرامات و عادات منازل و مقامات بعضوں اور درجات اور قرب و نزدیکی کی طلب پاک صاف ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی ارادہ اور آرزو باقی نہیں رہتی۔ اور وہ مثل سوراخ دار برتن کے ہو جاتا ہے جس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی کیونکہ وہ خدا کے فعل سے ٹوٹ جاتا ہے جب اس میں کوئی ارادہ پیدا ہوتا ہے خدا کا فعل اور اس کی غیرت اس کو توڑ ڈالتی ہے۔ تب اس کے دل کے گرد عظمت و جبروت و ہیبت کے پردے ڈال دیئے جاتے ہیں اور اس کے گرد کبریائی اور سطوت کی خندقیں کھودی جاتی ہیں کہ ارادہ کسی چیز کا دل میں گھسنے نہیں پاتا۔ اس وقت دل کو اسباب یعنی مال اور اہل و عیال و اصحاب اور کرامات و حکم و بیانات کچھ ضرر نہیں ہوتے کیونکہ یہ سب دل سے باہر رہتے ہیں تب اللہ تعالیٰ ان کے غیرت نہیں کرتا بلکہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے بندہ کے لئے بطور لطف و کرامت و رزق و نعمت کے ہوتی ہیں اور جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں انھیں نفع پہنچانے کے لئے ہیں۔[1]

شکستہ دلوں کی تسکین

حضرت شیخ کے زمانہ میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اپنے اعمال و اخلاق اور ایمانی کیفیت کے لحاظ سے پست لیکن دنیاوی حیثیت سے بلند اور ہر طرح سے اقبال مند تھا۔ اس کے برخلاف دوسرا طبقہ معاشی حیثیت سے پست، دنیاوی ترقیات سے محروم، بے بضاعت و تہی دست لیکن اعمال و اخلاق کے لحاظ سے بلند اور ایمانی کیفیات و ترقیات سے بہرہ مند تھا۔ وہ پہلے طبقہ کی کامیابیوں اور ترقیات کو بعض اوقات رشک کی نگاہ سے دیکھتا، اور اپنے کو کسی وقت محروم و نامراد سمجھنے لگتا تھا۔ حضرت شیخ اس شکستہ دل

---

[1] فتوح الغیب مقالہ ۱۰ : صفحہ ۲۳

طلب کی دعوئی فرماتے ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی جو عنایات ہیں ان کا ذکر فرماتے ہوئے اس امتیاز و فرق کی حکمت بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اے خدا! ہاں تو تعریف والا ہے کہ مجھ سے تمام دنیا برگشتہ ہو گئی اے میرے پیارے تجھے بلکہ جیسے جو خدا اے میرے سید قرابت سے نکالے ہوئے ہیں اور سے جھٹکائے ہوئے ہیں وہ کہیں دور سے محروم جتا ہے پڑا ہے اے وہ کہ سب کے دل میں اس کی محبت آرزوؤں اور ارمانوں کے رنگ میں رکھی ہے ابھی جگہ نہیں ہے کہ کہ خدا نے مجھ کو مرتع کر دیا۔ دنیا کو مجھ سے پھیر دیا۔ مجھے پامال کر دیا۔ چھوڑ دیا ہے۔ دشمنی کی مجھے پریشان کیا اور حبیب بنا کر مجھے ذلیل کیا اور میرے باپ سے میری کفالت نکال کتنا مرکبا اور غم میں وہ میرے بھائیوں میں میرا ذکر ختم کیا اور میری اپنی تمام نعمتیں چھپا دی ہیں جس میں اس کی رات دن گزرتے ہیں اسے مجھ پر اور میرے دو یاروں پر فضیلت دی حالانکہ وہ بھی مسلمان ہے اور میری طرح ایک ہی باپ آدم و حوا کی اولاد میں دونوں ہیں۔ (اے خدا) پھر تیرا فضل تیرے ساتھ ہے۔ تو اس نے کہا کہ تیری سرشت مٹیالی زمین کی شکل ایک ریت ہے اور محبت حق کا بار جس پر رکھو وہ دب جاتی ہیں۔ از قسم صبر و رضا و یقین و قناعت و علم اور ایمان و توحید کے انوار تیرے گرد ہیں۔ تو تیرے بیان کا درخت اور اس کی جڑ اللہ بیج اپنی جگہ پر مضبوط ہے۔ وہ گلے نہ پھل دار ہے۔ وہ بڑھ رہا ہے شاخیں پھیلا رہا ہے سایہ دے رہا ہے بلند ہو رہا ہے دور دراز تک ادراک و فہم میں ہے اس کے پھل اور پرورش کرنے پانی اور کھاد دینے کی ضرورت نہیں اس بارہ میں خداوند تعالیٰ تیرے علم سے فارغ ہے اگر وہ خود تیری ضروریات کو پورا کر جاتا ہے۔ اس نے آخرت میں تجھ کو مقام بخشا ہے اور اس میں تجھ کو مالک بنایا ہے اور عقبیٰ میں تیرے لئے اتنی کثرت سے بخششیں رکھی ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کان نے سنیں نہ کسی انسان کے دل میں گزریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے چھپا رکھی گئی ہے اس کا بدلہ ہے جو وہ کرتے تھے یعنی جو کچھ دنیا میں ان لوگوں نے

احکام کی بجا آوری منہیات کے ترک پر صبر مقدورات میں تفویض و تسلیم اور کل احوال میں خدا کی موافقت کی ہے ۔

اور وہ چیز جسے خدا نے دنیا عطا فرمائی اور (مال دنیا کا) مالک کیا ہے اور نعمت دنیاوی دی گئی اور اس پر اپنا فضل فرمایا اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا ہے کہ اس کے ایمان کی جگہ تپتی اور تھوڑی زمین ہے کہ اس میں پانی ٹھہرتا اور درخت اگتا اور کھیتی اور پھل کا پیدا ہونا دقت سے خالی نہیں تو اس زمین پر کھاد وغیرہ ڈالی جاتی ہے جس سے پودوں اور درختوں کی پرورش ہو اور وہ کھاد وہی اسکا سامان ہے تاکہ اس سے درخت ایمان اور دنیاوی اعمال کی جو اس زمین میں لگے ہیں حفاظت ہو اگر یہ چیزیں اس سے علیحدہ کر دی جائے تو پودے اور درخت سوکھ جائیں گے اور پھل جاتے رہیں گے پس گھر ہی اجڑ جائے گا حالانکہ خداوند تعالیٰ اس کے بنانے کا ارادہ رکھتا ہے تو اے فقیر دولتمند آدمی کا درخت ایمان کمزور جڑ کا ہے اور اس کی زمین تنگ خالی جو تیرے درخت ایمان میں بھری ہوئی ہے اسکی مضبوطی اور اس کا استحکام انہی چیزوں سے ہے جو مال دنیا اور طرح طرح کی نعمتیں اس کے پاس تجھ کو نظر آتی ہیں اگر درخت کی کمزوری میں یہ چیزیں اس سے الگ کر دی جائیں تو ایمان کا درخت سوکھ کر کفر و انکار (پیدا) ہو جائے گا اور وہ شخص منافقین و مرتدین و کفار میں شامل ہو جائیگا البتہ اگر خداوند تعالیٰ دولت مند کی طرف صبر و رضا و یقین علم و طرح طرح کی معرفت کے لشکر بھیجے اور اس سے اس کا ایمان قوی ہو جائے تو پھر اس کو تونگری اور نعمتوں کے علیحدہ ہو جانے کی کیا پرواہ رہے گی۔[1]

دنیا کی صحیح حیثیت

حضرت شیخؒ کے یہاں رہبانیت کی تعلیم نہیں وہ دنیا کے استعمال اور اس کے بقدر ضرورت

---

[1] رموز الغیب مقالہ (۵۰) ص۶۴-۶۵

انتفاع سے منع نہیں فرماتے، اس کی پرستش اور غلامی اور اس سے قلبی تعلق اور عشق سے منع فرماتے ہیں، ان کے مواعظ درحقیقت حدیث نبوی ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرۃ (بیشک دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی (یعنی تمہاری لونڈی ہے) اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے) کی تفسیر ہیں، ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

> "دنیا ہی سے اپنا مقسوم اس طرح مت کھاؤ کہ وہ بیٹھی ہوئی ہو اور تم کھڑے ہو بلکہ اس کو بادشاہ کے دروازہ پر اس طرح کھاؤ کہ تم بیٹھے ہوئے ہو اور وہ طباق اپنے سر پر رکھے ہوئے کھڑی ہو، دنیا خدمت کرتی ہے اس کی جو حق تعالیٰ کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے اور جو دنیا کے دروازہ پر کھڑا ہوا ہوتا ہے اس کو ذلیل کرتی ہے، کھا حق تعالیٰ کے ساتھ عزت اور تونگری کے قدم پر"[1]

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے۔

> "دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، کسی اچھی نیت سے اس کو جمع رکھنا جائز، باقی قلب میں رکھنا جائز نہیں، (کہ دل سے اس کی محبت کرنے لگے) دروازہ پر اس کا کھڑا ہونا جائز، باقی دروازہ سے آگے گھسنا نہ جائز ہے نہ تیرے لئے عزت ہے"[2]

خلفاء اور حکام وقت پر تنقید

حضرت شیخ صرف مواعظ و پند و نصیحت اور ترغیب و تشویق ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، جہاں ضرورت سمجھتے تھے بڑی صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے، حکام و سلاطین اور خلیفۂ وقت پر بھی تنقید اور ان کے غلط افعال اور فیصلوں کی مذمت سے بھی باز نہیں رہتے تھے اور اس بارہ میں کسی کی وجاہت اور اثر و نفوذ کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

---

[1] فیوض یزدانی مجلس ۱۲ ص۱۲۴ [2] ایضاً ۔ مجلس ۱۵ ص۱۳۳

كان يأمر بالمعروف وينهى عن المنكر	آپ خلفاء وزراء سلاطین قضاۃ خواص وعوام
للخلفاء والوزراء والسلاطين والقضاة	سب کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرماتے اور بڑی
والخاصة والعامة يصدع بذلك	صفائی اور جرأت کے ساتھ ان کو بھرے مجمع میں اور
على رؤس الاشهاد ورؤس المنابر وفي	برسر منبر علی الاعلان ٹوک دیتے جو کسی ظالم کو حاکم
المحافل وينكر على من يولي الظلمة	بناتا اس پر اعتراض کرتے اور حق کے معاملہ میں
ولا تأخذه في الله لومة لائم[1]	کسی ملامت کرنے والے کی آپ کو پرواہ نہ ہوتی۔

صاحب قلائد الجواہر لکھتے ہیں کہ جب خلیفہ مقتفی لامر اللہ نے قاضی ابو الوفا یحییٰ بن سعید بن یحییٰ بن المظفر کو قاضی بنایا جو ابن المزحم الظالم کے لقب سے مشہور تھا تو حضرت نے برسر منبر خلیفہ کو مخاطب کرکے فرمایا۔

وليت على المسلمين اظلم الظالمين	تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے جو
ما جوابك غداً عند رب العالمين	اظلم الظالمین ہے کل کو قیامت کے روز تم رب
ارحم الراحمين۔	العالمین کو جو ارحم الراحمین ہے کیا جواب دوگے؟

مؤرخ موصوف کا بیان ہے کہ خلیفہ یہ سن کر لرزہ براندام ہو گیا اور اس پر گریہ طاری ہو گیا اور اس نے اسی وقت قاضی کو اس عہدہ سے ہٹا دیا۔[2]

حضرت شیخ ان درباری سرکاری علماء اور مشائخ کی بھی پرزور تردید اور پردہ دری فرماتے تھے جنھوں نے سلاطین اور ناخدا ترس حکام کی مصاحبت اختیار کر لی تھی اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا ان کا شعار تھا جس کی وجہ سے ان سلاطین و حکام کو زیادہ جرأت اور بے خوفی پیدا ہو گئی تھی، ایک مجمع میں اسی طبقہ کو خطاب کرکے فرماتے ہیں۔

اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو! تم کو ان سے کیا نسبت؟ اے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنو!

اے بندگان خدا کے ڈاکوؤ! تم کھلے ظلم اور کھلے نفاق میں مبتلا ہو، یہ نفاق کب تک رہے گا[3]

---

[1] قلائد الجواہر ص ۸ [2] ایضاً

اور اے زاہدو! شاہان وسلاطین کے لئے کب تک منافق بنے رہوگے کہ ان سے دنیا کا مال اور اس کی شہوات ولذات لیتے رہو تم اور اکثر بادشاہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اس کے بندوں کے متعلق ظالم اور خائن بنے ہوئے ہیں بار الٰہا! منافقوں کی شوکت توڑ دے اور ان کو ذلیل فرما یا ان کو توبہ کی توفیق دے اور ظالموں کا قلع قمع فرما، اور زمین کو ان سے پاک کردے یا ان کی اصلاح فرما۔[1]

ایک دوسرے موقع پر اسی طبقہ کے ایک فرد کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

• تجھے شرم نہیں آتی کہ تیری حرص نے تجھ کو ظالموں کی خدمت گاری اور حرام خوری پر آمادہ کر دیا تو کب تک حرام کھاتا اور دنیا کے ان (ظالم) بادشاہوں کا خدمت گار بنا رہیگا جن کی خدمت میں لگا ہوا ہے ان کی بادشاہت عنقریب مٹ جائے گی اور تجھے حق تعالیٰ کی خدمت میں آنا پڑےگا جس کی ذات کو کبھی زوال نہیں۔[2]

دین کے لئے دلسوزی اور فکرمندی

حضرت شیخ دینی اور اخلاقی انحطاط کو (جس کا سب سے بڑا مرکز خود بغداد تھا) دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے اور عالم اسلام میں جو ایک عام دینی زوال رونما تھا اس کے آثار دیکھ کر ان کے سینے میں حمیت اسلامی اور غیرت دینی کا جوش اٹھتا تھا، وہ اپنے اس قلبی احساس اور درد کو بعض اوقات چھپا نہیں سکتے، اور یہ درد ان کے خطبات اور مواعظ میں امنڈ آتا ہے۔

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

• جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں پے در پے گر رہی ہیں اور اس کی بنیاد بکھری جاتی ہیں اے باشندگانِ زمین آؤ اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کردیں اور جو ڈھے گیا ہے اس کو درست

---

[1] فیوض یزدانی مجلس ۵۱ ص ۳۳۳ [2] ایضاً ۔ مجلس ۲۵ ص ۱۶۳

کرلیں یہ چیز ایک سے پوری نہ ہوگی تو سب مل کر کام کرنا چاہیے اسی صورت اسے چاہئیے دو لاکھ روز

تم سب آؤ۔[1]

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:۔

"اسلام رو رہا ہے اور دین کا سقوط ہو رہا ہے، بدعتوں، گمراہیوں، مکر کے گڑھے بیٹھے والوں اور اس کی باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے (ظلم) سے جو اُن میں موجود ہیں یہ اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد کر رہا ہے معتقدین اور نظر کے سامنے والوں کی طرف غور کر کے امید بھی کرتے تھے وہ کھاتے پیتے بھی تھے اور روٹی مشغول ہو کر ایسے ہوگئے گویا بہرے ہی نہ تھے تیرا دل کس قدر سخت ہے آج کیا بھی شکار کرنے اور کھیتی اور مویشی کی نگہبانی اور ملک کی حفاظت کرنے میں سب مالک کی خیرخواہی کرتا ہے اور اسے دیکھ کر زرتوں کے مانے کھاریاں کرتا ہے بلکہ وہ اس کو شام کے وقت صرف ایک دفعہ ایک مقدار کھانا دیا کرتا ہے اور تو ہر وقت مشغولِ طعام اور فکر میں ہو کر کھاتا رہتا ہے مگر ان نفسوں کے بیٹے سے جن کا مقصود ہے نہ تو اس کو دور کرتا ہے اور نہ ان کا جان کا ترا ہے بلکہ اس کے برعکس ان کا حکم نہ کرتا ہے اور نہ ان کی حدود و شریعت کی حفاظت نہیں کرتا۔"[2]

بیعت و تربیت

ان پُر تاثیر اور انقلاب آفریں مواعظ سے اگرچہ اہلِ بغداد کو عظیم الشان روحانی اور اخلاقی نفع پہونچا اور ہزارہا انسانوں کی زندگی میں اس سے تبدیلی پیدا ہوگئی لیکن زندگی کے گہرے تغیرات ہمہ گیر اصلاح اور مستقل تربیت کے لئے صاحبِ دعوت سے مستقل اور گہرے تعلق اور مسلسل اصلاح و تربیت کی ضرورت تھی مجالسِ دعوت و ارشاد مدارس کی طرح منضبط اور مستقل تربیت گاہیں بھی ضروری تھیں جہاں

---

[1] ملفوظات صفحہ ۱۳۹ ([illegible]) [2] ایضاً صفحہ ۱۶۶ ([illegible])

طالبین کی تسلسل و انضباط کے ساتھ تعلیم و تربیت اور نگرانی کی جائے، ان مجالس کے شرکا اور سامعین آزاد ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ وعظ سن کر چلے جائیں پھر کبھی نہ آئیں یا ہمیشہ آتے رہیں لیکن اپنی حالت پر قائم رہیں اور ان کی زندگی میں بدستور بڑے بڑے خلا اور دینی اور اخلاقی شگافات باقی رہیں۔

اسلامی آبادی کا پھیلاؤ، روزمرہ کی زندگی کی ذمہ داریاں اور معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ مدارس کے ذریعہ سے (جن کو بہت سی رسوم و قیود کا پابند ہونا پڑتا ہے) عمومی اصلاح و تربیت کا کام نہیں لیا جا سکتا تھا اور کسی بڑے پیمانہ پر کسی دینی و روحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرکے دینی ذمہ داریوں اور پابندیوں کو شعور و احساس ذمہ داری کے ساتھ دوبارہ قبول کرے، اس میں پھر ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اس کے افسردہ و مردہ دلوں میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو اور اس کے معطل قوتوں میں پھر حرکت اور نشاط پیدا ہو، اس کو کسی مخلص خدا شناس پر اعتماد ہو اور اس سے وہ اپنے امراض روحانی و نفسانی میں علاج اور دین میں صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے، ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ خلافت جس کا اصلی فرض تھا (جیسا کہ جس نبی کی نیابت و نسبت پر یہ خلافت قائم تھی بقول سیدنا عمر ابن عبدالعزیزؒ وہ ہدایت کے لیے مبعوث ہوا تھا جبایت (تحصیل وصول) کے لیے نہیں) نہ صرف اس فریضہ سے غافل اور کنارہ کش ہو چکی تھی بلکہ اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کام کے لیے معذور اور اس کے راستہ میں مزاحم تھی، دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان، توہم پرست اور شکی واقع ہوئی تھی کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں وہ قیادت اور سیاست کی آمیزش پاتی، برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس کو فوراً کچل دیتی۔

ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی، نیا نظم و ضبط اور نئے سرے سے حرکت و عمل پیدا کرنے کے لیے اس کے علاوہ اور کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ایمان و عمل اور اتباع شریعت کے لیے بیعت لے اور مسلمان اس کے ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی

سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں، اور پھر وہ نائب پیغمبر ان کی دینی نگرانی اور تربیت کرے، اپنی کیمیا اثر صحبت، اپنے شعلۂ محبت، اپنی استقامت اور اپنے نفسِ گرم سے ایمانی حرارت، اللہ کی محبت، اخلاص وللہیت، جذبۂ اتباعِ سنت اور شوقِ آخرت پیدا کرے، ان کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کہ انھوں نے ایک نئی زندگی سے توبہ کی ہے اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے، وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح و تربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہے اور اس محبت و اعتماد کا جو یہ رشتہ قائم ہو گیا ہے، پھر اپنے تجربہ و اجتہاد اور کتاب و سنت کے اصول و تعلیمات کے مطابق ان میں صحیح روحانیت و تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان و احتساب، اخلاص اور ان کے اعمال و عبادات میں کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہی حقیقت ہے اس بیعت و تربیت کی جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں احیا و تجدید دین اور اصلاحِ مسلمین کا کام لیا ہے اور لاکھوں بندگانِ خدا کو حقیقتِ ایمان اور درجۂ احسان تک پہونچا دیا ہے، اس سلسلۂ زریں کے سرِ حلقہ اور گلِ سرسبد حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کا نام اور کام اس طبِ نبوی کی تاریخ میں سب سے زیادہ روشن اور نمایاں ہے، الفاظ و اصطلاحات اور علمی بحثوں سے الگ ہو کر اگر واقعات و حقائق پر بنیاد رکھی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس دورِ انتشار میں (جو ابھی تک قائم ہے) اصلاح و تربیت کا اس سے زیادہ سہل اور عمومی اور اس سے زیادہ موثر اور کارگر ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت شیخ سے پہلے دین کے داعیوں اور مخلص خادموں نے اس راستہ سے کام لیا ہے اور ان کی تاریخ محفوظ ہے، لیکن حضرت شیخ نے اپنی محبوب و مؤثر شخصیت، علم اور روحانی کمالات، فطری صلاحیتوں اور ملکۂ اجتہاد سے اس طریقہ کو نئی زندگی بخشی، وہ نہ صرف اس سلسلہ کے ایک نامور امام اور ایک مشہور سلسلہ (قادریہ) کے بانی ہیں، بلکہ اس فن کی نئی تدوین و ترتیب کا سہرا آپ ہی کے

ہے، آپ سے پہلے وہ اتنا مدوّن و مرتب اور مکمل و منضبط نہ تھا، نہ اس میں اتنی عمومیت اور وسعت ہوئی تھی جتنی آپ کی مقبولیت اور عظمت کی وجہ سے پیدا ہو گئی، آپ کی زندگی میں لاکھوں انسان اس طریقہ سے فائدہ اٹھا کر ایمان کی حلاوت سے آشنا اور اسلامی زندگی اور اخلاق سے آراستہ ہوئے اور آپ کے بعد آپ کے مخلص خلفاء اور با عظمت اہل سلسلہ نے تمام ممالک اسلامیہ میں دعوت الی اللہ اور تجدید ایمان کا یہ سلسلہ جاری رکھا جس سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بیان نہیں کر سکتا، یمن، حضرموت اور ہندوستان میں پھر حضرمی مشائخ و تجار کے ذریعہ جاوا اور سماٹرا میں اور دوسری طرف افریقہ کے بر اعظم میں لاکھوں آدمیوں کی تکمیل ایمان اور لاکھوں غیر مسلموں کے قبول اسلام کا ذریعہ بنا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ و ارضاہ و جزاہ عن الاسلام خیر الجزاء۔

زمانہ پر اثر

حضرت شیخ کا وجود اس مادیت زدہ زمانہ میں اسلام کا ایک زندہ معجزہ تھا اور ایک بڑی دلیل الٰہی۔ آپ کی ذات، آپ کے کمالات، آپ کی تاثیر، اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کی مقبولیت کے آثار اور خلق اللہ میں قبولیت و وجاہت کے کھلے ہوئے مناظر، آپ کے تلامذہ اور تربیت یافتہ اصحاب کے اخلاق اور ان کی سیرت و زندگی سب اسلام کی صداقت کی دلیل اور اس کی زندگی کا ثبوت تھا، اور اس حقیقت کا اعلان تھا کہ اسلام میں سچی روحانیت، تہذیب نفس اور تعلق مع اللہ پیدا کرنے کی سب سے بڑی صلاحیت ہے اور اس کا خزانہ عامرہ کبھی جواہرات و نوادرات سے خالی نہیں۔

وفات

ایک طویل مدت تک عالم کو اپنے کمالات ظاہری و باطنی سے مستفید کر کے اور عالم اسلام میں ایک

روحانیت اور رجوع الی اللہ کا عالمگیر ذوق پیدا کر کے ۵۶۱ھ میں ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی ،

صاحبزادہ حضرت شرف الدین عیسیٰؒ آپ کی وفات کا حال بیان کرتے ہیں :۔

” جب آپ اس مرض میں بیمار ہوئے کہ جس میں انتقال فرمایا تو آپ کے صاحبزادے شیخ عبدالوہاب نے آپ سے عرض کی کہ مجھے کچھ وصیت فرمائیے کہ آپ کے بعد میں اس پر عمل کروں فرمایا ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہو اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو اور نہ اس کے سوا کسی سے امید رکھو اور اپنی تمام ضروریات اللہ کے سپرد کر دو صرف اسی پر بھروسہ رکھو اور سب کچھ اسی سے مانگو خدا کے سوا کسی پر وثوق اور اعتماد نہ رکھو اور توحید اختیار کرو کہ توحید پر سب کا اجماع ہے اور فرمایا جب دل خدا کے ساتھ درست ہو جاتا ہے تو کوئی چیز اس سے چھوٹتی نہیں ہے اور نہ کوئی چیز اس سے باہر نکل کر جاتی ہے اور فرمایا میں مغز بے پوست ہوں اور اپنے صاحبزادوں سے فرمایا میرے گرد سے ہٹ جاؤ میں ظاہر میں تمہارے ساتھ ہوں اور باطن میں دوسروں کے ساتھ ہوں میرے پاس تمہارے سوا اور لوگ (فرشتے) حاضر ہیں ان کے لئے جگہ خالی کرو اور ان کے ساتھ ادب کرو یہاں بڑی رحمت نازل ہے ان کے لئے جگہ تنگ نہ کرو اور آپ بار بار فرماتے تھے تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں اللہ میری اور تمہاری مغفرت کرے اور میری اور تمہاری توبہ قبول کرے بسم اللہ آؤ اور واپس نہ جاؤ اور یہ آپ ایک دن ایک رات برابر فرماتے رہے اور فرمایا تم پر افسوس ہے مجھے کسی چیز کی پروا نہیں نہ کسی فرشتہ کی نہ ملک الموت کی اے ملک الموت ! ہمارے کارساز نے تم سے زیادہ ہم کو بہت کچھ دے رکھا ہے اور اسی دن جس کی شب کو آپ نے رحلت فرمائی ایک بڑی سخت چیخ ماری تھی اور آپ کے دو صاحبزادے شیخ عبدالرزاق و شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ بار بار دونوں ہاتھ اٹھا کر پھیلاتے تھے اور فرماتے تھے تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور برکتیں حق کی طرف رجوع کرو اور صف میں داخل ہو میں ابھی تمہارے پاس آتا ہوں اور آپ یہی فرماتے تھے کہ نرمی کرو پھر آپ پر امر حق آیا اور موت کے نشے نے غلبہ کیا اور آپ نے فرمایا میرے اور تمہارے اور

تمام خلق کے درمیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے مجھے کسی پر قیاس نہ کرو اور نہ کسی کو مجھ پر پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ کی تکلیف اور حال دریافت کیا تو فرمایا مجھ سے کوئی نہ پوچھے میں علم الٰہی میں پلٹے کھا رہا ہوں اور آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ کے مرض کو پوچھا تو فرمایا میرے مرض کو نہ کوئی جانتا ہے اور نہ کوئی سمجھتا ہے نہ انسان نہ جن نہ فرشتہ، خدا کے علم سے خدا کا علم نہیں ٹوٹتا، حکم بدل جاتا ہے اور علم نہیں بدلتا، حکم منسوخ ہو جاتا ہے علم منسوخ نہیں ہوتا اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصلی تحریر ہے جو کچھ وہ کرتا ہے اس سے باز پرس نہیں ہوتی اور خلق سے باز پرس ہوتی ہے صفات کی خبریں گزر رہی ہیں جیسی آئی ہیں پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالجبار نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے جسم میں کہاں تکلیف ہے؟ فرمایا میرے کل اعضاء مجھے تکلیف دے رہے ہیں مگر میرے دل کو کوئی تکلیف نہیں اور وہ خدا کے ساتھ صحیح ہے پھر آپ کا وقت اخیر آیا تو آپ فرمانے لگے میں اس خدا سے مدد چاہتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ پاک و برتر ہے اور زندہ ہے جسے فوت ہونے کا اندیشہ نہیں پاک ہے وہ جس نے اپنی قدرت سے عزت ظاہر کی اور موت سے بندوں پر غلبہ کیا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں اور آپ کے صاحبزادہ شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ نے لفظ "تعزز" فرمایا اور یہ لفظ صحت کے ساتھ آپ کی زبان سے ادا نہ ہوا تب آپ بار بار اسے دہراتے تھے یہاں تک کہ آپ نے آواز بلند اور سخت کر کے لفظ "تعزز" اپنی زبان سے ٹھیک ٹھیک فرمایا پھر (تین بار) اللہ اللہ اللہ فرمایا اس کے بعد آپ کی آواز غائب ہو گئی اور زبان تالو سے چپک گئی اور روح مبارک رخصت ہو گئی۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ[1]

حضرت شیخ اس دنیا سے تشریف لے گئے لیکن اپنے پیچھے دین کے داعیوں اور نفوس و اخلاق کے مربیوں

---

[1] الکلام رموز الغیب صفحہ ۱۴۲-۱۴۳

کی ایک جماعت چھوڑ گئے جس نے آپ کے کام کو جاری رکھا اور جو تشنگی پیدا ہوئی اس کی تربیت اور حفاظت کا انتظام کرتی رہی

آپ حضرت شیخ کے بعد آپ کے خلفاء و مخلصین نے دعوت دینی اور تربیت نفوس کا کام پوری طاقت اور جمعیت کے ساتھ جاری رکھا اور غفلت اور دنیاپرستی کا مقابلہ بڑی طاقت و اخلاص سے کیا اور مرض کا علاج کیا، ان میں حضرت شیخ کے خلیفہ یا شاگرد شیخ حماد و شیخ ابوالنجیب سہروردی کے بھتیجے اور مرید شیخ الشیوخ ابو حفص شیخ شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲ھ) سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز تھے جو طریقہ سہروردیہ کے بانی اور تصوف کی مقبول کتاب عوارف المعارف کے مصنف ہیں۔

ابن خلکان لکھتے ہیں لم یکن فی آخر عمرہ فی عصرہ مثلہ وکان شیخ الشیوخ ببغداد "(آخر عمر میں اپنے زمانہ میں ان کی نظیر نہ تھی اور وہ بغداد کے سب سے بڑے شیخ اور اپنے فن میں مرجع تھے)" انتہت الیہ الریاسۃ فی تربیۃ المریدین ودعاء الخلق الی اللہ تعالیٰ[1] (تربیت مریدین اور دعوت الی اللہ کے کام میں وہ مرجع خلائق تھے) ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ان کے زمانہ کے مشائخ دور دور سے ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور استفادہ کرتے رہتے تھے[2]، شیخ کے مواعظ سے خلق اللہ کو بہت نفع ہوا، ابن خلکان کے الفاظ ہیں وکان لہ مجلس وعظ وعلی وعظہ قبول کثیر ولہ نفس مبارک[3] (وہ بڑے اہتمام سے وعظ فرمایا کرتے تھے، ان کے وعظ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قبولیت عطا فرمائی، اور ان کے انفاس مبارکہ سے لوگوں کو بڑا نفع تھا)

تصوف کو بدعات سے پاک کرنے اور کتاب و سنت کو اس کا معیار بنانے کی کوشش میں حضرت شیخ کا تجدیدی حصہ ہے، ان کی کتاب عوارف المعارف کو اگر اس فن کی قدیم کتابوں سے مقابلہ کرکے دیکھا جائے تو ان کی اس تجدیدی کام کا اندازہ ہوتا ہے[4]۔

اللہ تعالیٰ نے شیخ شہاب الدین کو بڑے بلند پایہ اور باکمال و مستعد خلفاء عطا فرمائے جنہوں نے دعوت و تربیت کا کام بڑی قوت و وسعت کے ساتھ انجام دیا، ان کے مشہور خلیفہ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہندوستان میں جو فیض پہنچا اور خلق اللہ کو ہدایت ہوئی وہ ان کی جلالت قدر اور عظمت شان کے لیے کافی ہے۔

(مطبوعہ علی الحاشیہ) [1] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۱۹ (الطبعۃ المصریۃ) [2] مرآۃ الجنان یافعی ج ۴ ص

[3] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۲۰ [4] نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں: در تصوف بہترین کتاب عوارف

است (تقصار جیود الاحرار ص)

علامہ ابن جوزیؒ

عبدالرحمن ابن جوزیؒ دعوت و اصلاح کا ایک دوسرا نمونہ ہیں، وہ اپنے زمانہ کے یکتائے روزگار مفسر، محدث، مورخ، نامور مصنف اور خطیب ہیں، اور ان میں سے ہر موضوع پر ان کی ضخیم تصنیفات اور علمی کارنامے ہیں۔

ابتدائی حالات اور تحصیل علم

۵۰۸ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، گویا حضرت شیخؒ سے ۳۸ سال چھوٹے ہیں، بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو ماں نے مشہور محدث ابن ناصر کی مسجد میں چھوڑ دیا، ان سے حدیث سنی، قرآن مجید حفظ کیا، اور تجوید میں مہارت پیدا کی، شیوخ حدیث سے حدیث کی سماعت اور کثرت کی، اور بڑی محنت و انہماک اور جفاکشی سے علم کی تحصیل کی، اپنے صاحبزادہ سے اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔۔

> ”مجھے خوب یاد ہے کہ میں چھ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوا، بڑی عمر کے طلبہ میرے ہم سبق تھے، مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی راستہ میں بچوں کے ساتھ کھیلا ہوں یا زور سے ہنسا ہوں، سات برس کی عمر میں جامع مسجد کے سامنے کے میدان میں چلا جایا کرتا تھا، وہاں کسی مداری یا شعبدہ باز کے حلقہ میں کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے کے بجائے محدث کے درس حدیث میں شریک ہوتا، وہ حدیث و سیرت کی جو بات کہتا، وہ مجھے زبانی

یاد ہو جاتی، بچپن ہی سے مجھ کو اس کا اتنا شوق تھا کہ دوسرے لڑکے دجلہ کے کنارے کھیلا کرتے تھے اور میں کسی کتاب کے اوراق لے کر کسی دور جگہ چلا جاتا اور الگ تھلگ بیٹھ کر مطالعہ میں مشغول ہو جاتا۔

میں اساتذہ و شیوخ کے حلقوں میں حاضری دینے میں اس قدر جلدی کرتا تھا کہ دوڑنے کی وجہ سے میری سانس پھولنے لگتی تھی، صبح و شام ایسی حالت گزرتی کہ کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مخلوق کا احسان مند ہونے سے بچا لیا۔[۱]

کتابت حدیث میں انہماک

حدیث کی سماعت و کتابت میں اتنا اشتغال رہا اور اپنے ہاتھ سے روایات حدیث کی اتنی کتابت کی کہ بعض مورخین کا بیان ہے کہ انہوں نے انتقال کے وقت وصیت کی کہ ان کے غسل کا پانی اس کترن اور برادہ سے گرم کیا جائے جو حدیث کے لکھنے کے لئے قلم بنانے سے جمع ہو گیا تھا، چنانچہ وہ اتنا نکلا کہ پانی گرم ہو گیا اور وہ بچ بھی گیا۔[۲]

ذوق مطالعہ

مطالعہ کا ذوق اور اس کی حرص بچپن ہی سے بڑھی ہوئی تھی، بغداد عظیم الشان کتب خانوں اور وسیع کتب خانوں سے مالا مال تھا، ابن جوزی کا محبوب مشغلہ کتابوں کا مطالعہ تھا، ان کا مطالعہ کسی خاص فن یا موضوع سے مخصوص نہ تھا، وہ ہر موضوع کی کتابیں پڑھتے تھے اور ان کو آسودگی نصیب نہ ہوتی تھی۔ صید الخاطر میں جو ان کے خیالات و تاثرات کا کشکول ہے، لکھتے ہیں:

"میں اپنا حال عرض کرتا ہوں، میری طبیعت کتابوں کے مطالعہ سے کسی طرح سیر نہیں ہوتی، جب کوئی نئی کتاب نظر پڑ جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا، اگر میں کہوں کہ میں نے بیس ہزار

---

[۱] لفتۃ الکبد فی نصیحۃ الولد صفحہ [illegible]   [۲] ابن خلکان ج [illegible] ص [illegible]

کتابوں کا مطالعہ کیا ہے تو بہت زیادہ معلوم ہوگا، اور یہ طالب علمی کا ذکر ہے، مجھے ان کتابوں کے مطالعہ سے سلف کے حالات و اخلاق، ان کی عالی ہمتی، قوت حافظہ، ذوق عبادت اور علوم نادرہ کا ایسا اندازہ ہوا جو ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہوسکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کی سطح پست معلوم ہونے لگی اور اس وقت کے طلبۂ علم کی کم ہمتی منکشف ہوگئی۔[1]

تصنیف و تالیف اور تبحر علمی

علامہ ابن جوزی تصنیف و تالیف کی طرف نو عمری ہی سے متوجہ ہوئے، روزانہ چار جزو لکھنے کا زندگی بھر معمول رہا، حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ میں نے ان کی تالیفات شمار کیں تو ہزار تک پہنچیں، حدیث میں ایسا بلند پایہ رکھتے تھے کہ زبان سے کہتے تھے کہ ہر حدیث کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ صحیح ہے یا حسن یا محال ہے، ادب و انشا و خطابت میں بغداد میں ان کی نظیر نہ تھی۔

تقویٰ اور ذوق عبادت

ان علمی کمالات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دیانت و تقویٰ اور ذوق عبادت کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، ان کے نواسہ ابو المظفر کہتے ہیں کہ وہ ہر ہفتہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے، کبھی کسی سے مذاق نہیں کیا، بچپن میں کسی بچے کے ساتھ کھیلے نہیں، کبھی کوئی مشتبہ چیز نہیں کھائی، ساری عمر یہی حال رہا، ابن النجار کہتے ہیں کہ ان کو اوراد صحیحہ حاصل تھے اور حلاوت مناجات و لذت دعا کے ذوق آشنا تھے، ابن القادسی کا بیان ہے کہ شب بیدار تھے اور ذکر اللہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے، ان کی تصنیفات اور حالات و اشارات سے خود معلوم ہوتا ہے کہ چشم بینا اور دل بیدار رکھتے تھے اور جمعیت خاطر اور تعلق

---

[1] صید الخاطر ج ۳ ص [illegible]

مع اللہ کو سرمایۂ زندگی سمجھتے تھے اور اسی کی آرزو نے ان کو بے چین و مضطرب بنا رکھا تھا۔ شیخ نوریؒ اپنی ایک حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ابتدائے عمر ہی سے میرے اندر طریقِ زہد اختیار کرنے کی رغبت اور استعداد کا تقاضا تھا، وضع اور زینت کا اہتمام یا احترام تھا۔ وہ جہانی مرغوب تھی، اس وقت میرے دل کی بڑی اچھی حالت تھی، میری چشمِ بصیرت روشن اور سرمایۂ اوراد تھی، عمر کا جو لحظہ بغیر طاعت کے گزر جاتا اس پر افسوس ہوتا۔ ایک ایک گھڑی کی غنیمت معلوم ہوتی اور زیادہ سے زیادہ عمل اور خدا کی رضا کا کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا۔ مجھے اللہ کے ساتھ ایک تعلق اور اُنس اور دعا میں لذت و حلاوت محسوس ہوتی۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ بعض احکام و ارکانِ سلطنت میری حسنِ تقریر اور وعظ سے متأثر ہوئے اور انہوں نے مجھے اپنی طرف مائل کیا اور طبیعت بھی کچھ ان کی طرف مائل ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حلاوت جو دعا و مناجات میں محسوس ہوتی تھی جاتی رہی۔ پھر دوسرے عالم نے اپنی طرف مائل کیا۔ مشتبہ چیزوں کے قریب رہنے لگے، حتیٰ کہ اور کھانے پینے سے بچتا تھا اور میری حالت کچھ بدلی ہوئی تھی، پھر رفتہ رفتہ دل کا دروازہ کھل گیا اور میں نے مباحات میں آزادی سے کام لیا، اور وہ سادگی کی کیفیت جاتی رہی جو پہلے ان عالموں سے ملتا اور ان کو ناواقف سمجھتا تھا، قلب کی تاریکی بڑھتی جاتی یہاں تک یہ محسوس ہوا کہ وہ روشنی بجھ گئی اور قلب تاریک ہو گیا۔ اس صورتِ حال سے میری طبیعت میں ایک بے چینی پیدا ہوئی۔ اس بے چینی کا اثر مجلسِ وعظ کے سامعین پر پڑا، وہ بھی بے چین اور متاثر ہونے لگے، میری بے چینی کا اثر تھا کہ ان کو کثرت سے توبہ و اصلاح کی توفیق ہوتی اور میں خالی ہاتھ کا عامل، تو چھپایا کیا اس سے اور بدبختی کو دیکھ کر میرا اضطراب اور بڑھتا، لیکن کوئی علاج بن نہ آیا۔ آخر میں نے صالحین کی قبروں کی زیارت کی۔ اور اللہ سے اپنے دل کی اصلاح کی دعا کی۔ بالآخر اللہ کے لطف و کرم نے میری دستگیری کی۔ اور مجھے انسان کی طرح خلوت کی طرف مائل کیا جیسا

کچھ وحشت تھی ، وہ وہاں جو صبر یا قوت نقل کی ہے وہ عبرت انگیز ہے ، ان پر یہ سخت گھڑیاں بہت اچھی طرح گزریں ، ان کا سب کچھ یہ ظاہر ہوا [illegible] اسی خوف و ضعف سے بیمار ہو [illegible] اور وہاں پانچ برس تک مقیم رہے [illegible] دل کھول کر شکر ادا کیا۔[1]

ظاہری محاسن و اوصاف

ابن جوزی اس لازوال دولت کے ساتھ دولت دنیا ، دولت عافیت اور دولت جمال سے بھی بہرہ مند تھے۔ موفق عبد اللطیف کہتے ہیں کہ وہ نہایت خوش پوشاک ، خوش خوراک ، خوش مذاق اور نفیس جسم تھے۔ ابن الدبیثی کہتے ہیں کہ وہ شیریں زبان ، شستہ بیان ، خوش آواز ، موزوں قامت اور خوش اندام تھے ، ان کو اللہ تعالیٰ نے بہت فراغ دست اور باعزت رکھا ، اپنی صحت اور اعتدال مزاج کا بڑا اہتمام رکھتے اور ایسی چیزوں کا استعمال رکھتے جو ذکاوت و لطافت پیدا کریں ، بعض تصنیفات میں جا بجا صحت کی حفاظت ، اعتدال مزاج اور پرہیز کی تدبیر کرنے کی تلقین کی ہے ، تلبیس ابلیس میں زہد کے مبالغہ آمیز اور متشددانہ رجحانات پر جا بجا تنقید کی ہے۔

بلند ہمتی اور جامعیت کا شوق

ان کی خاص صفت ان کی عالی ہمتی اور کسب کمالات اور جامعیت کا شوق ہے جس کا اظہار انھوں نے اپنے حالات میں جا بجا کیا ہے ، انھوں نے جب کبھی مشہور حوصلہ مندوں اور بلند ہمتوں کا جائزہ لیا ہے ان کی حوصلہ مندی اپنی بلند ہمتی کے سامنے پست اور محدود نظر آئی ہے ، صید الخاطر میں ایک جگہ تفصیل سے لکھتے ہیں:

"انسان کے لئے سب سے بڑی بلا اس کی [illegible] ہے۔ میں نے جس کی ہمت بلند ہوتی ہے وہ

---

[1] [illegible] ج ۱ ص ۴۲۰-۲۲

بلند سے بلند مرتبہ کو انتخاب کرتا ہے پھر کبھی زمانہ مساعد نہیں ہوتا، کبھی وسائل مفقود ہوتے ہیں تو ایسا شخص ہمیشہ کرب میں رہتا ہے۔ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے بلند حوصلہ عطا فرمایا ہے اور اس کی وجہ سے میں بھی تکلیف میں ہوں لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ کاش مجھے یہ بلند حوصلہ نہ عطا ہوتا اس لئے کہ زندگی کا پورا لطف اور بے فکری بے حسی اور بے حسی کے بغیر نہیں اور صاحب عقل یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی عقل کم کر دی جائے اور زندگی کا لطف بڑھا دیا جائے۔ میں نے کتنے آدمیوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بلند ہمتی کا بڑی اہمیت سے ذکر کرتے ہیں لیکن غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی ساری بلند ہمتی صرف ایک ہی صنعت اور شعبہ میں ہے اس کے علاوہ دوسرے شعبوں میں اور بعض اوقات ان کے شعبہ سے زیادہ اہم ہوتے ہیں ان کو اپنی کمی یا پستی کی کوئی پروا نہیں۔ شریف رضی نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے کہ ہر جسم کی لاغری کا ایک سبب ہے اور میرے جسم کی مصیبت میری بلند ہمتی ہے لیکن میں نے اس کے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ حکومت کے سوا اس کا کوئی مطمح نظر نہ تھا۔ ابو مسلم خراسانی اپنی جوانی کے زمانہ میں سوتا کم تھا، کسی نے اس سے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ دماغ روشن، ہمت بلند نفس بلندیوں کا حریص، اس سب کے ہوتے ہوئے پست اور کمزور زندگی، بھلا نیند کس طرح آئے؟ کسی نے کہا کہ تمہاری تسکین کس طرح ہو سکتی ہے؟ کہا کہ صرف اسی طرح کہ سلطنت حاصل ہو جائے، تو کسی نے کہا کہ پھر اس کی کوشش کرو، اس نے کہا کہ خطروں میں پڑے اور جان کی بازی لگائے بغیر ممکن نہیں، لوگوں نے کہا کہ پھر خطرہ مول لو، کہا کہ عقل روکتی ہے، لوگوں نے کہا کہ پھر کیا ارادہ ہے؟ کہا کہ پھر عقل کو مشورہ قبول نہیں کروں گا اور نادانی کے ساتھ ہی آگے بڑھوں گا اور نادانی سے خطرہ مول لوں گا اور اپنی عقل کو زنجیر کر کے ہمت کے پیچھے چلاؤں گا، اپنی عقل سے کام لوں گا، اس نے کہا ہی کر دکھایا، غرض ابو مسلم میں میں نے اسی قریب غور کیا، جو حوصلہ مند ابو مسلم کے حالات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس نے سب سے مسئلہ یہ ہے کہ پیش قدمی کی اور وہ مسئلہ آخر ہے۔ یہ وہ حکومت کی طلب پیدا ہوا اور اسی کی خاطر

اس نے کتنا خون بہایا، کتنے بے گناہ بندگانِ خدا کو قتل کیا، یہاں تک کہ اس کو دنیا کی لذتوں کا ایک تھوڑا حصہ حاصل ہوا جو اس کا مطلوب تھا، لیکن اس کو آٹھ سال سے زیادہ اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ ملا، اس کو دھوکہ سے قتل کر دیا گیا۔ وہ اپنی عقل سے اپنا کوئی بندوبست نہ کر سکا اور دہقانوں کے ہاتھوں ہلاک ہو کر دنیا سے بڑی بری حالت میں رخصت ہو گیا، اس طرح متنبی نے اپنی بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کا بڑا اثر دکھایا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ اس کو محض دنیا کی بھوک تھی۔

لیکن میری عالی ہمتی کا معاملہ عجیب ہے، میں علم کا وہ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں جہاں تک مجھے یقین ہے کہ سوچ بھی نہیں سکوں گا، اس لئے کہ میں تمام علوم کا حصول چاہتا ہوں خواہ ان کا تنوع ہو، پھر ان میں سے ہر علم کی تکمیل اور احاطہ چاہتا ہوں، اور اس مقصد کے ایک حصہ کا حصول بھی اس چھوٹی سی عمر میں ناممکن ہے، پھر میرا یہ حال ہے کہ اگر کسی فن میں کسی کو کمال حاصل ہوتا ہے اور دوسرے فن میں وہ ناقص ہوتا ہے تو مجھے وہ ناقص نظر آتا ہے، مثلاً محدث فقہ سے بے بہرہ ہو یا فقیہ حدیث سے بے خبر، میرے نزدیک علم کا نقص ہمت کی پستی کا نتیجہ ہے، پھر علم سے میرا مقصود پورا پورا عمل ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ مجھ میں بشر حافی کی احتیاط اور معروف کرخی کا زہد جمع ہو جائے، پھر یہ بات تصانیف کے مطالعہ، عادات انسانی اور بندگانِ خدا کو تعلیم و افادہ اور ان کے ساتھ رہنے سہنے کے مشاغل کے ساتھ بہت مشکل ہے، پھر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ مخلوق سے مستغنی رہوں، بجائے ان کا احسان لینے کے ان پر احسان کرنے کے قابل بن سکوں، دوسری طرف علم کے ساتھ اشتغال کسب معاش سے مانع ہے، دوسروں کا ممنون ہونے اور ان کے تحائف و ہدایا کو قبول کرنے کو میری ہمت گوارا نہیں کرتی، پھر مجھے اولاد کی بھی خواہش ہے، اور بلند پایہ تصانیف کا بھی شوق ہے تاکہ یہ سب میری یادگار اور دنیا سے جانے کے بعد میرے قائم مقام ہوں، اس کا اہتمام کیا جائے تو دل کی یکسوئی اور محبوب مشغلہ خلوت و تنہائی میں فرق آتا ہے، اور طبیعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے، پھر مجھے طیبات

مستحبات سے جائز لطف لینے کا بھی شوق ہے لیکن اس میں انہماک کی سدِّ راہ ہے پھر اگر اس کا سامان بھی ہو جائے تو جمعیت خاطر رخصت، اسی طرح میں ان غذاؤں اور ایسے کھانے پینے کا بھی شائق ہوں جو جسم کے موافق اور اس کے لئے مفید ہوں اس لئے کہ میرا جسم نفاست پسند اور شائق واقع ہوا ہے لیکن مال کی کمی اس میں بھی رکاوٹ بنتی ہے یہ سب درحقیقت اضداد کو جمع کرنے کی کوشش ہے بھلا اس حال میں کا مقابلہ وہ لوگ کیا کر سکتے ہیں جن کو صرف دنیا مطلوب ہے، مجھے یہی خواہش بھی ہے کہ دنیا کا حصول اس طرح ہو کہ میرے دین پر آنچ نہ آئے اور وہ بالکل محفوظ رہے اور نہ میرے علم و دل پر کوئی اثر پڑے میری اس بے چینی کا کون کیا اندازہ کر سکتا ہے، ایک طرف مجھے شب بیداری، عزیمت، احتیاط و تقویٰ کا اہتمام ہے، دوسری طرف علم کی اشاعت، درس و افادہ اور تصنیف و تالیف اور جسم کے مناسب غذائیں بھی مطلوب ہیں اور دیر تک قلب کی مشغولیت کے ساتھ خواہش ہے، ایک طرف لوگوں سے ملنا جلنا اور ان کی تعلیم بھی ضروری ہے دوسری طرف خلوت و تنہائی اور دعا و مناجات کی حلاوت میں کمی ہو تو اس پر سخت تأسف و رنج ہوتا ہے، مشتغلین کے لئے قوت لا یموت کا انتظام کیا جائے تو ورع و احتیاط کے معیار میں فرق آتا ہے لیکن میں نے اس ساری تکلیف اور کلفت کو گوارا کر رکھا ہے اور راضی بہ رضا ہو گیا ہوں اور شاید میری اصلاح و ترقی اسی تکلیف و کشمکش میں ہے اس لئے کہ بلند ہمت انسان عالی مقاصد کی فکر میں رہتے ہیں جو خدا کے یہاں باعث تقرب ہیں، میں اب اتنا اس کی حفاظت کرتا ہوں اور اس سے اجتناب کرتا ہوں اور اس سے احتیاط کرتا ہوں کہ ایک ساعت بھی کسی دنیوی کام میں صرف ہو اگر میرا مطلوب حاصل ہو گیا تو سبحان اللہ ورنہ نیۃ المؤمن خیر من عملہ۔"[1]

مجالس وعظ اور تاثیر

ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے انقلاب انگیز مواعظ اور مجالس درس ہیں، ان مجالس

---

[1] صید الخاطر ج ۲ ص ۳۳۳-۳۳۴

نے سارے بغداد کو زیر و زبر کر رکھا تھا، خلفاء و سلاطین، وزراء اور اکابر علماء ان میں بڑے اہتمام اور شوق سے شرکت کرتے، ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک ایک لاکھ آدمی ایک ایک وعظ میں شمار کئے گئے ہیں، دس پندرہ ہزار آدمیوں سے تو کسی طرح بھی کم نہ ہوتے[1]، تاثیر کا یہ عالم تھا کہ لوگ غش کھا کھا کر گر جاتے، وجد و شوق میں گریبان پھاڑ لیتے، لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں، آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، توبہ کرنے والوں کا کچھ شمار نہ تھا، اندازہ کیا گیا ہے کہ بیس ہزار یہودی، عیسائی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اور ایک لاکھ آدمیوں نے توبہ کی[2]۔

ابن جوزی نے اپنی مجالس وعظ میں بدعات و منکرات کی کھل کر تردید کی، عقائد صحیحہ اور سنت کا اظہار کیا، اپنی بے مثل خطابت، زبردست شخصیت اور عام رجوع کی وجہ سے اہل بدعت کو ان کی تردید کا حوصلہ نہ ہوا، سنت کو ان کے مواعظ و دروس اور تصنیفات سے بہت فروغ ہوا، خلیفۂ وقت اور امراء بھی امام احمد کے (جو اس زمانہ میں مسلک سلف اور طریقۂ سنت کی نشانی سمجھے جاتے تھے) معتقد اور ان کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔

ان کی ناقدانہ تصانیف

ابن جوزی نے زبانی وعظ و تقریر پر اکتفا نہیں کی، انھوں نے متعدد کتابیں ایسی لکھیں جنھوں نے علمی طبقہ پر اثر ڈالا اور غلط رجحانات کی اصلاح کی۔

کتاب الموضوعات

یہ موضوعات حدیث پر ان کی ایک کتاب ہے جس میں انھوں نے ان حدیثوں کی حقیقت بیان کی ہے جن سے اس زمانہ کے اہل بدعت یا ضعیف العلم متصوفین استدلال کرتے تھے اور وہ لوگوں کی گمراہی اور

---

[1] صید الخاطر ص ۱۰۱

[2] ایضاً

مصدر، غلط فہمیوں کا باعث بنی تھیں، اس طرح انھوں نے اس تشریح پر تیشہ چلایا، جس پر اہلِ بدعت نے آشیانہ بنایا تھا، اگرچہ اس میں ان سے خود کہیں کہیں بے اعتدالی ہوئی ہے اور انھوں نے کہیں کہیں سخت فیصلہ صادر کیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب نے ایک مفید خدمت انجام دی۔

تلبیس ابلیس

ان کی دوسری نادر تصنیف تلبیس ابلیس ہے جو ان کی نقاد طبیعت اور مصلحانہ ذوق کا اعلیٰ نمونہ ہے، اس کتاب میں انھوں نے اپنے زمانہ کی پوری مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لیا ہے اور مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر جماعت کو سنت و شریعت کے معیار سے دیکھا ہے اور ان کی کمزوریوں، بے اعتدالیوں اور غلط فہمیوں کی نشاندہی کی ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ شیطان نے کس کس طرح سے اس امت کو دھوکا دیا ہے اور کن کن راہوں سے اس کے عقائد، اعمال اور اخلاق میں رخنہ اندازی کی ہے، انھوں نے اس کتاب میں کسی طبقہ اور کسی شخص کی رعایت نہیں کی اور کسی کو معاف نہیں کیا ہے، اس میں علماء و محدثین، فقہاء و واعظین، ادباء، شعراء، سلاطین و حکام، عباد و زہاد، صوفیہ، اہلِ دین اور عوام کی علیحدہ علیحدہ کمزوریاں، غلط رسوم و عادات، مغالطے اور بے اعتدالیاں بیان کی ہیں، یہ کتاب ان کی وسعتِ نظر، زندگی سے واقفیت، باریک بینی اور دقیقہ رسی کا کامیاب نمونہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شیطان کی نفسیات و سیاست کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور مذاہب کی تاریخ اور گمراہ فرقوں کے عقائد سے وہ بہت باخبر تھے۔

مختلف طبقات پر تنقید

اس کتاب میں اگرچہ کہیں کہیں وہ اپنی تنقید میں حد سے بڑھ گئے ہیں اور انھوں نے فیصلہ کرنے میں عجلت اور شدت سے کام لیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب میں بڑی کارآمد چیزیں، بڑے بیش قیمت

اقتباسات اور بہت کی صحیح تنقیدیں ملتی ہیں، اور اکثر جگہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کی گرفت صحیح اور ان کی تنقید حق بجانب ہے۔ یہاں پر اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

اپنے زمانہ کے ان علماء پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جو فقہ کے مسائل و جزئیات میں دن رات منہمک تھے اور اس فن میں موشگافیاں کرتے رہتے تھے۔

> "ان فقہاء کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان کا سارا انہماک اسی جزو فقہ میں ہے انھوں نے اپنے فن میں ان چیزوں کو شامل نہیں کیا ہے جن سے قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے مثلاً قرآن مجید کی تلاوت، حدیث وسیرت کی سماعت اور صحابۂ کرام کے حالات کا مطالعہ و بیان، سب جانتے ہیں کہ محض ازالۂ نجاست اور ماء متغیر کے مسائل کے بار بار دہرانے سے قلوب میں نرمی اور خشیت نہیں پیدا ہو سکتی، قلوب کو تذکیر اور مواعظ کی ضرورت ہے تاکہ آخرت طلبی کی ہمت اور شوق پیدا ہو، اختلافی مسائل اگرچہ علوم شریعت سے خارج نہیں، مگر حصول مقصد کے لئے کافی نہیں ہیں، جو سلف کے حالات و ان کے حقائق و اسرار سے واقف نہیں، اور جن کے مذہب کو اس نے اختیار کیا ہے ان کے حالات سے باخبر نہیں وہ ان کے راستہ پر کیسے چل سکتا ہے؟ اور دیکھنا چاہئے کہ طبیعت چور ہے، اگر اس کو اسی زمانہ کے لوگوں کے ساتھ چھوڑ دیا جائے گا تو وہ اہل زمانہ کے طبائع سے اخذ کرے گی، اور انہی کی طرح ہو جائے گی، اور اگر متقدمین کے حالات و طریقوں کا مطالعہ کیا جائے گا تو ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کی جائے گی، اور ان کا رنگ اور ان کے سے اخلاق پیدا ہوں گے، سلف میں سے ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ ایک حدیث جس سے میرے دل میں رقت پیدا ہو قاضی شریح کے سو فیصلوں سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔"[1]

واعظین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

---

[1] تلبیس ابلیس صفحہ ۱۱۹-۱۲۰

ان میں سے اکثر لوگ بڑی زنانہ اور بن ٹھن کر عورتیں ہوتی ہیں جن کے آگے مجلس ہوتی ہے اس مجمع میں واعظ کا بیان حضرت موسیٰ و طور و یوسف و زلیخا کے قصوں سے مشغول ہوتا ہے فرائض کا بہت کم تذکرہ آتا ہے اسی طرح گناہ سے بچنے کا ذکر بھی نہیں ہوتا ایسے واعظ سے ایک زانی ایک سود خوار کو توبہ کرنے کی ترغیب اور توفیق کیسے ہو سکتی ہے اور کب عورت کو شوہر کے حقوق ادا کرنے اور اپنے تعلقات درست کرنے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ واعظ ان مضامین سے خالی ہوتے ہیں افسوس انہوں نے شریعت کو پس پشت ڈال دیا ہے اسی لئے ان کا بازار خوب گرم ہے اسی لئے کہ لوگ جیسے مجنون ہو جاتے ہیں اور وجد میں آ جاتے اور بلبلا کر قہقہے لگواتے[1]

آگے لکھتے ہیں:-

"کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واعظ سچا اور خیر خواہ ہوتا ہے لیکن ریا و طلب جاہ اس کے دل میں سرایت کر گئی ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ اسی کی عزت و تعظیم کی جائے اور اس کی علامت یہ ہے کہ اگر دوسرا واعظ اس کی قائم مقامی کرے یا اصلاح خلق کے کام میں اس کی مدد کرنا چاہے تو اس کو ناگوار ہوتا ہے حالانکہ اگر یہ مخلص ہوتا تو اس کو اس سے کبھی ناگواری نہ ہوتی۔"[2]

نیز مصنف ان کی علما پر بھی تنبیہ کرتے:-

"اگر طلبہ کسی اور عالم یا محدث کے پاس چلے جائیں جو علم میں اس سے فائق ہے تو اس عالم کو اس سے بڑی گرانی ہوتی ہے یہ مخلص کی شان نہیں ہے اس لئے کہ مخلص علماء اور محدثین کی مثال ایسی ہی ہے جو بوجہ اللہ مخلوق کا علاج کرتے ہیں اس لئے اگر کسی مریض کو کسی طبیب کے ہاتھ سے شفا ہو جائے تو دوسرا خوش ہوتا ہے۔"[3]

حکام و سلاطین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

---

[1] تلبیس ابلیس ص۱۲۴ [2] ایضاً [3] تلبیس ابلیس ص۱۲۵ (تلبیس ابلیس کی علماء کو تلبیس)۔

یہ حضرات شریعت کے مقابلہ میں اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں کبھی اس شخص کا ہاتھ کاٹتے ہیں جس کا ہاتھ کاٹنا جائز نہیں اور کبھی اس کو قتل کرتے ہیں جس کا قتل حلال نہیں، ان کو یہ دھوکہ ہے کہ یہ سیاست ہے جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ شریعت ناقص ہے اس کو تکملہ و تتمہ کی ضرورت ہے اور ہم اپنی رائے سے اس کی تکمیل کرتے ہیں یہ شیطان کا بہت بڑا فریب ہے اس لئے کہ شریعت سیاست الٰہی ہے اور محال ہے کہ خدا کی سیاست میں کوئی خلل یا کمی ہو جس کی وجہ سے اس کو مخلوق کی سیاست کی ضرورت ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی) اور ارشاد ہے لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ (اس کے حکم کو کوئی مٹانے والا نہیں) تو جو اس سیاست کا قائل ہے وہ در اصل شریعت میں خلل اور کمی کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ کفر کی بات ہے۱؎

ان حکام و امراء اور سلاطین کی ایک دوسری کمزوری اور مغالطہ کا ذکر کرتے ہیں:-

سیاسی بااثر لوگوں کے ساتھ ساتھ ان کو صلحاء کی ملاقات کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے اور ان سے وہ اپنے حق میں دعائیں کراتے ہیں، شیطان ان کو سمجھاتا ہے کہ اس سے گناہوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے گا حالانکہ اس غیر سے اس جرم کا دفعیہ نہیں ہو سکتا، کہتے ہیں کہ ایک تاجر کا ایک محصول وصول کرنے والے کے پاس سے گزر ہوا، اس چنگی والے نے اس کی کشتی روک لی، وہ تاجر اپنے زمانہ کے مشہور درویش مالک بن دینار کے پاس آیا اور ان سے واقعہ بیان کیا، مالک بن دینار چنگی والے کے پاس گئے اور اس تاجر کی سفارش کی، اس نے ان کی بڑی تعظیم کی اور کہا کہ آپ نے کیوں زحمت فرمائی، وہیں سے کہلوا دیا ہوتا، ہم تعمیل کرتے، پھر اس نے ان سے دعا کی درخواست کی، انہوں نے اس برتن کی طرف اشارہ کر کے جس میں وہ چنگی کا ناجائز روپیہ جمع کر کے رکھتا تھا، فرمایا کہ اس برتن سے کہو کہ وہ تمہارے لئے دعا کرے، پھر فرمایا کہ میں تمہارے حق میں کیا دعا کروں جبکہ ہزار آدمی تمہارے لئے بد دعا کر رہے ہیں، کیا ایک آدمی کی دعا لی جائے گی اور ہزار کی نہیں لی جائے گی۲؎

۱؎ نقد مسلک الولاۃ والسلاطین ص ۱۳۱ ۲؎ ایضاً ص ۱۳۲

بے تکلف ان کا ذکر کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں دنیاداروں کو علماء و فقہاء سے زیادہ خلافِ شرع پیروں اور گدی نشینوں اور صوفیوں سے عقیدت و محبت ہوتی ہے اور ان پر بڑی فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں جبکہ اہل علم پر ایک پیسہ خرچ کرنا ان کو بار ہوتا ہے اس لیے کہ علماء طبیب کی طرح ہیں اور دوا میں خرچ کرنا انسان کو بار معلوم ہوتا ہے لیکن ان پیروں اور قوالوں پر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسا مغنیات (گانے والی عورتوں) پر خرچ کرنا یہ بیچارے گویوں اور سازندوں کی طرح سامان تفریح اور لذت اندوزی کا باعث ہیں۔[1]

اسی طرح سے یہ لوگ بناوٹی زاہدوں اور تارک الدنیا درویشوں کے بڑی جلدی معتقد ہوتے اور ان کو علماء پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ اگر کسی بڑے جاہل کے جسم پر درویشی کا لباس دیکھ لیں تو فوراً معتقد ہو جائیں اور اگر وہ سر کو جھکائے اور کسی مخصوص حال کا اظہار کرے تو فریفتہ ہونے میں دیر نہیں لگتی اور کہتے ہیں کہ بھلا اس درویش اور فلاں عالم کا کیا مقابلہ، یہ تارک الدنیا اور وہ طالب دنیا، یہ کچھ نہیں کھاتا ہے نہ شادی کرتا ہے حالانکہ یہ محض جہالت ہے اور شریعت محمدی کی تحقیر ہے کہ ایسے زاہد کو عالم پر ترجیح دی جائے، خدا کا بڑا احسان ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھے ورنہ اگر آپ کو شادیاں کرتے، پاک صاف چیزیں کھاتے اور میٹھے اور شہد کی رغبت رکھتے ہوئے پاتے تو آپ سے بھی بد اعتقاد ہو جاتے۔[2]

عوام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> شیطان نے بہت سے عوام کو یہ دھوکہ دے رکھا ہے کہ وہ ذکر کی مجالس میں شریک ہونا اور متاثر ہو کر رونا ہی سب کچھ ہے وہ سمجھتے ہیں کہ مقصود محض مجلس میں شرکت اور رقت ہے اس لیے کہ وہ واعظوں سے اس کے فضائل سنتے رہتے ہیں اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ مقصود عمل ہے تو یہ سننا اور عمل نہ کرنا ان کے لیے گرفت کا باعث اور وبال جان ہے۔ میں ذاتی طور پر بہت سے آدمیوں کو

---

[1] نقد مسالک العلماء والصالحین ص۲۸۷ [2] تلبیس ابلیس علی العوام ص ۳۹۸ - ۳۹۹

جانتا ہوں جو سالہا سال سے مجلس وعظ میں شریک ہوتے ہیں اور روتے بھی ہیں متاثر ہوتے ہیں لیکن نہ سود لینا چھوڑتے ہیں نہ تجارت میں دھوکہ دینے سے باز آتے ہیں ارکان صلوٰۃ سے جیسے وہ بے خبر ہوں پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں مسلمانوں کی غیبت، والدین کی نافرمانی میں جس طرح پہلے مبتلا تھے اسی طرح اب بھی مبتلا ہیں۔ شیطان نے ان کو یہ پٹی پڑھا رکھی ہے کہ مجلس وعظ کی حاضری و گریہ و بکا اُن کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔ بعض کو یہ سمجھا رکھا ہے کہ علماء و صالحین کی صحبت ہی مغفرت کا ذریعہ ہے۔[1]

دولت مندوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان میں سے بہت سے لوگ مساجد اور پلوں کی تعمیر میں بہت کچھ خرچ کرتے ہیں مگر ان کا مقصود ریا اور شہرت ہوتی ہے اور یہ کہ ان کا نام چلے اور یادگار رہے۔ چنانچہ وہ اس تعمیر پر اپنا نام کندہ کرا دیتے ہیں اگر رضائے الٰہی مقصود ہوتی تو اس کو کافی سمجھتے کہ اللہ دیکھتا اور جانتا ہے ایسے لوگوں سے اگر صرف ایک دیوار بنانے کو کہا جائے جس پر ان کا نام کندہ نہ ہو تو وہ منظور نہ کریں گے۔

اسی طرح یہ رمضان مبارک میں شہرت کے لئے موم بتیاں بھیجتے ہیں حالانکہ ان کی مسجدیں میں سال بھر اندھیرا پڑا رہتا ہے اس لئے کہ روزانہ تھوڑا تھوڑا سا تیل مسجدوں میں دینے سے وہ شہرت اور ناموری حاصل نہیں ہوتی جو رمضان میں ایک موم بتی بھیجنے سے حاصل ہوتی ہے۔"[2]

صید الخاطر

صید الخاطر ایک کشکول ہے جس میں مصنف نے اپنے قلبی تاثرات، بے تکلف خیالات، زندگی کے تجربات اور منتشر افکار و حوادث قلمبند کئے ہیں اور اپنی بہت سی کمزوریاں اور غلطیوں کا بے تکلف

---

[1] تلبیس ابلیس علی العوام ص۳۹۱-۳۹۲ [2] تلبیس ابلیس علی اصحاب الاموال ص۴۹۵

اعتراف کیا ہے، اس کتاب میں جا بجا نفس سے دلچسپ سوال و جواب، ذہنی کشمکش کی روداد، معاشرتی زندگی کے تجربے، عورتوں، نوکروں، دوستوں کے متعلق تجربہ کی باتیں، اور مفید ہدایات، روزمرہ کے واقعات کی تحلیل، امراض نفسانی کا بیان، مختلف طبقات پر تنقید، نفس کا احتساب اور صاحب کمال کی تعریفیں ہیں، اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت صداقت اور سادگی و بے تکلفی ہے، پوری کتاب اپنے زمانہ کے ادباء و مصنفین کے طرز کے خلاف نہایت رواں، بے تکلف عبارت میں لکھی گئی ہے اور اپنے موضوع پر غالباً ایک عرب عالم و مصنف کی پہلی کتاب ہے۔

عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج

ابن جوزی اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے واقعات اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں، اور یہی ایک عامی اور ایک صاحب نظر میں فرق ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> میں نے دو مزدوروں کو دیکھا کہ ایک بھاری شہتیر اٹھا کر لے جا رہے ہیں، اور دونوں کچھ گا رہے ہیں، ایک شعر پڑھتا ہے دوسرا ترنم کے ساتھ اس کا جواب دیتا ہے، ایک پڑھتا ہے تو دوسرا کان لگا کر سنتا ہے، پھر دوسرا اس کو دہراتا ہے یا اسی طرح کے شعر سے جواب دیتا ہے، مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کو مشقت اور بوجھ کا احساس زیادہ ہو، لیکن اس ترکیب سے ان کا کام آسان ہو جاتا ہے، میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ذہن اتنی دیر دوسرے کام میں لگ کر سستا لیتا ہے، اور کچھ سرور حاصل کر لیتا ہے، اور جواب کی فکر میں مشغول ہو کر اس میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے، اور اس طرح راستہ طے ہو جاتا ہے اور بوجھ کے احساس سے غفلت ہو جاتی ہے، اس سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ انسان نے شرعی ذمہ داریوں اور فرائض کا بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے، اور سب سے بڑا بوجھ اپنے نفس کی سیاست ہے، بڑا کام یہ ہے کہ اس کو

اس کے [illegible] سے مردہ کا باپ [illegible] ثابت نہیں ان پر [illegible] کرتے ہو کھانا بانٹ [illegible] لازم ہے کے راستے آسانی اور نفس کی [illegible] تحقیق کیا باتیں جب اکبر شاہ نے کہا ہے کہ رات بھر چلنے سے [illegible] فرمایا کہ اب تو صبح کی روشنی کی امید ہو اور دن چڑھے آرام کرنے کا وعدہ کرو۔

اسی طرح کی حکایت شیخ جمالی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ [illegible] کے ایک ساتھی [illegible] تھے ساتھی کو پیاس لگی اس نے کہا کہ [illegible] شیخ [illegible] نے کہا کہ آگے کنویں سے پانی پئیں گے جب وہ کنواں آیا تو [illegible] کنویں کی طرف [illegible] وہاں تک صبر کرو [illegible] طرح [illegible] ہوتے بہت دور نکل گئے [illegible] دنیا کا سفر طے ہو جاتا ہے [illegible] اس نکتہ کو سمجھ لیا وہ اپنے نفس کو بہلانے کے طور پر اس کی دلجوئی کرے گا اور اس سے وعدہ کرتا ہے تاکہ وہ اپنے بوجھ کو [illegible] سکے وہ اس پر صبر کرے [illegible] سلف فرماتے [illegible] تیرے مرغوب چیز [illegible] صفت اور قوت [illegible] نے اپنے نفس کو خدا کی طرف بڑھنے دیا [illegible] اس کی طرف بڑھنے لگا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ نفس کی خاطر داری اور ملاطفت ضروری ہے اور راستہ اسی طرح طے ہوتا ہے۔ [1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

میں نے دیکھا ہے کہ [illegible] جب [illegible] کنویں کے پاس سے گزرتے ہیں تو [illegible] بھر گئے ہیں اور بہت تھوڑا پانی [illegible] اور ان کے پیچھے [illegible] کہ ان کنووں کا پانی [illegible] ہے ان پر [illegible] پڑی ہے تو [illegible] کے خلاف [illegible] نہیں کرتے اور ان کو [illegible] نہیں لاتے اور ان کے [illegible]

---

[1] صیدا انقلاب ج ۱ ص ۳۴-۱۴۲

جو کہ شکاری کتے ہیں گویا ان کتوں کی قوم ہی میں سے نہیں ہیں اس لئے کہ معمولی کتے موٹے موٹے بدن اور بھدّے اعضاء کے ہیں ان میں امانت کی صفت نہیں لیکن شکاری کتے نازک اور پھرتیلے ہیں اور جیسا ان کا بدن نازک اور پھرتیلا ہے اسی طرح ان کے عادات مہذب ہیں وہ جب شکار کرتے ہیں تو کیا مجال ہے کہ اس کو خود کھائیں یہ مالک کے ڈر سے یا اس کے احسانات کے شکریے میں وہ اس شکار کو جوں کا توں پہنچا دیتے ہیں اس سے ایک بات تو یہ سمجھ میں آئی کہ بدن اور اخلاق میں خاص مناسبت ہوتی ہے اگر وہ لطیف ہے تو روح بھی لطیف ہی، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ آدمی کو اس پر حسد نہیں آتا جس کو وہ اپنے طبقہ یا اپنی سطح کا نہیں سمجھتا اسی طرح جس کو اللہ تعالیٰ ایمان و عقل کی دولت سے سرفراز کرے اس کو اپنے اس معاصر پر حسد نہیں ہوتا جو ایمان و عقل سے محروم ہو اور وہ اس کو قابلِ التفات نہیں سمجھتا اس لئے کہ وہ دوسرے عالم میں ہے اور یہ دوسرے عالم میں، وہ دنیا کی بنا پر حسد کرتا ہے اور اس کا مطمحِ نظر آخرت ہے اور دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔[1]

واقعاتِ زندگی اور نفس سے مکالمہ

وہ واقعات کی پوری تحلیل کرتے ہیں اور خود اپنی زندگی کے واقعات میں نفس سے حکیمانہ مکالمہ کرتے ہیں، ایک مرتبہ انھوں نے دعا کی ایک دوسرے صالح بزرگ دعا میں شریک تھے دعا قبول ہوئی لیکن کس کی دعا قبول ہوئی، اس پر ان کا اپنے نفس سے مکالمہ ہوا۔

مجھے ایک مرتبہ ایسا معاملہ پیش آیا جس میں اللہ سے مانگنے اور دعا کی ضرورت تھی میں نے دعا کی اور اللہ سے سوال کیا، ایک صاحب صلاح اور اہلِ خیر بھی میرے ساتھ دعا میں شریک ہو گئے پھر قبولیت کے آثار دیکھے، میرے نفس نے کہا کہ یہ اس بزرگ کی دعا کا نتیجہ ہے تمہاری دعا کا نتیجہ نہیں، میں نے کہا

---

[1] صید الخاطر ج ۲ ص ۲۲۹

مجھے اپنے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کا علم ہے جن کی وجہ سے واقعی مجھے اس کا حق نہیں کہ میری دعا قبول ہو لیکن کیا تعجب ہے کہ میری ہی دعا قبول ہو جائے اس لئے کہ میرے سامنے ان گناہوں اور تقصیرات محفوظ ہیں جن کا مجھے پورے تسلسل سے علم ہے، لیکن عابد بیچارہ اس میں ایک فرق ہے مجھے اپنی تقصیر کی بنا پر دل شکستگی اور ندامت ہے اور اس کو اپنے معاملہ پر فرحت و سرور ہے، اور کبھی اعتراف تقصیر ایسی مغفرتوں کے موقع پر زیادہ کارگر اور موثر ہوتا ہے اور ایک بات میں ہم اور وہ مساوی ہیں وہ یہ کہ ہم دونوں میں سے کوئی اپنے اعمال کی بنا پر فضل کا طالب نہیں تو اگر میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ندامت سے گردن جھکا کر اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہوں کہ خدایا مجھے محض اپنے فضل سے عطا فرما، میں بالکل خالی ہاتھ ہوں تو مجھے امید ہے کہ میری سن لی جائے گی، اور ممکن ہے کہ اس کی نظر اپنے حسن عمل پر پڑے اور یہ نظر اس کے لئے روک بن جائے تو اے میرے نفس میرا دل زیادہ ٹوٹا ہوا، پہلے ہی بہت ٹوٹا ہوا ہے، مجھے اپنے حالات کا پورا علم ہے جس کا تقاضا ادب اور تواضع ہے پھر اپنی تقصیرات کا اقرار ہے جس چیز کا میں نے سوال کیا ہے اس کا بے حد محتاج ہوں اور جس سے سوال کیا ہے اس کے فضل کا یقین ہے اور یہ سب باتیں اس عابد کو حاصل نہیں تو اللہ اس کی عبادت میں برکت کرے، میرا اعتراف تقصیر ہی بڑے کام کی چیز ہے۔[1]

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ ایک ایسے معاملہ میں جو شرعاً مکروہ تھا، مجھے کچھ کشمکش درپیش تھی، نفس کچھ تاویلیں سامنے لاتا تھا لیکن کراہت کو نظر سے ہٹاتا تھا اور درحقیقت اس کی تاویلات فاسد تھیں اور کراہت کی کھلی ہوئی دلیل موجود تھی، میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور دعا کی کہ اس کیفیت کو دور فرمائے اور قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی، میرے درس کے سلسلہ میں سورۂ یوسف شروع ہو رہی تھی میں نے

---

[1] صید الخاطر، ص ۱۵۰ ، ۱۵۱

وہیں سے شروع کیا تو خیال اس پر منتقل تھا مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ میں نے کیا پڑھا جب اس آیت پر پہونچا: قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ تو میں چونکا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں اس آیت کا مخاطب ہوں، مجھے دفعتاً ہوش آیا، اور آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور ہوا، میں نے اپنے نفس سے کہا تو نے خیال کیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام آزاد تھے وہ ناحق اور ظلم سے غلام بنا کر بیچے گئے، انھوں نے اس شخص کا احسان مانا جس نے ان کے ساتھ سلوک کیا تھا اور اس کو اپنا آقا کہا، حالانکہ نہ وہ غلام تھے نہ ان کا کوئی آقا تھا، پھر انہی اس حق شناسی کی وجہ بیان کی کہ إِنَّهُ أَحْسَنَ مَثْوَايَ مجھے اچھی طرح سے رکھا، اب ذرا اپنے اوپر غور کر تو حقیقۃً غلام ہے اپنے آقا کا جس نے وجود کے وقت سے برابر تیرے ساتھ احسان کیا ہے، اس نے تجھ کو پیدا کیا کہ ایک نطفہ میں تجھے پیدا کیا، اس کو گوشت پوست پہنایا، تجھے کھلایا پلایا، تجھے بڑا کیا، تیری حفاظت کی، تیرے اسباب مہیا کئے، بہترین راستہ پر تجھے ڈالا، اور ہر دشمن سے تجھے بچایا، تجھ کو صورت ظاہری کے ساتھ باطنی ذکاوت و جودت طبع عنایت فرمائی، علوم کو تیرے لئے سہل بنا دیا، یہاں تک کہ مختصر عرصہ میں تجھ کو وہ علوم حاصل ہوئے جو دوسروں کو طویل عرصہ میں نصیب نہیں ہوئے، تیری زبان پر علوم کو رواں کیا اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ ان کی تعبیر کی قوت عطا فرمائی، اور مخلوق سے تیرے عیوب کو چھپایا، ان کا معاملہ تیرے ساتھ حسن ظن کا رہا، تیرا رزق بغیر اہتمام و تکلف کے تجھ تک پہونچایا، اور کسی کا احسان مند نہیں بنایا، اور وہ بھی فراغت و اطمینان و کشائش کے ساتھ، بخدا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کس کس احسان کا تذکرہ کیا جائے، حسن صورت کا یا صحت اعضاء کا، یا سلامت مزاج، یا اعتدال ترکیب کا، یا لطافت طبع اور عادات ابتذال سے بری ہونے کا، یا بچپن ہی سے سیدھے اور معتدل راستہ کی توفیق کا، یا بے حیائیوں اور لغزشوں سے حفاظت کا، یا منقولات کو ترجیح اور حدیث و سنت کی اتباع اور تقلید جامد سے نجات کا

بات ہے کہ پیر کی پیروی اور اس کے مطالعہ میں شریعت کے خلاف ہے تو وہاں [illegible]

[illegible] ہمیں نے تیرے لئے بیان کیا۔ واضح ہو کہ [illegible]

کے بعد ایک [illegible] اور اس نے مجھے [illegible] کا خط [illegible] سے [illegible]

وہاں سے سیراب کیا [illegible] اور [illegible] حال

پر تیرے [illegible] گزر [illegible] ساتھ [illegible]

مقصد [illegible] تو اس کی طرف سے سیر پیدا کر دیا جاتا ہے۔ اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پیدا

[illegible] یقین آ جاتا ہے کہ یہ تیرے حق میں [illegible] تھا۔ اگر میں

پچھلے احسانات کو گنانا شروع کروں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں اور وہ ختم نہ ہوں اور مجھے

معلوم ہے کہ ان احسانات کا تذکرہ [illegible] نہیں کیا [illegible] اور [illegible] کا ذکر ہے

کیا ہے اس کی طرف بھی میں نے صرف اشارہ کیا [illegible] سب کے ساتھ تجھ کو ایسا محو کر دینا مجھے

زیب دیتا ہے جو اس کی [illegible] کے خلاف ہے [illegible]

لا [illegible] الحق [illegible]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے ایک مرتبہ ایک ایسے مسئلہ پر عمل کیا جس کی بعض مذاہب (فقہیہ) میں گنجائش تھی اور دوسرے مذاہب میں وہ [illegible] اس پر عمل کرتے ہی مجھے اپنے قلب میں بڑی ظلمت محسوس ہوئی اور ایسا معلوم ہوا گویا میں [illegible] ہو گیا اور مجھے [illegible] اور [illegible] تاریکی محسوس ہوئی میرے نفس نے کہا کہ یہ کیا بات ہے [illegible] تو دائرہ فقہیات سے نکلا نہیں [illegible] تیرے سوال کا جواب دو طرح سے ہے [illegible]

[illegible] ص ۲۴۵

فتویٰ لیا جاتا تو وہ اس کا فتویٰ نہ دیتا۔ اس نے کہا کہ اگر میں اس کے جواز کا قائل نہ ہوتا تو کرتا کیوں؟ میں نے کہا کہ تو اپنے اس خیال کو دوسرے کے لئے بھی فتوے کے طور پر پسند نہیں کرتا، دوسری بات یہ ہے کہ تجھے ظلمت کے احساس پر خوش ہونا چاہئے اس لئے کہ اگر تیرے دل میں نور نہ ہوتا تو تجھ پر یہ اثر نہ پڑتا۔ اس نے کہا کہ میرا حال یہ ہے کہ اس ظلمت سے جو پلٹ پلٹ کر آتی ہے وحشت ہے، میں نے کہا کہ پھر اس فعل کے ترک کا عزم کر، اور عزم کر کہ تو نے جس کو ترک کیا ہے وہ اگرچہ جائز ہے تب بھی بہ نیت ورع و تقویٰ اس کو چھوڑنے کا وعدہ کر، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا تب اس کیفیت سے اس کو نجات ملی۔[1]

سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت

وہ باوجود محدث و فقیہ ہونے کے اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ قلب کی اصلاح اور ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے مؤثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ "تلبیس ابلیس" اور "صید الخاطر" دونوں میں فقہاء و محدثین اور طلبہ و علماء کو وہ اس کا مشورہ دیتے ہیں اور اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں۔ "صید الخاطر" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں نے دیکھا کہ فقہ اور سماع حدیث میں انہماک و مشغولیت قلب میں صلاح پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں الا یہ کہ اس کے ساتھ مؤثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کا مطالعہ بھی شامل کیا جائے، حرام و حلال کا فقط علم قلب میں رقت پیدا کرنے کے لئے کچھ زیادہ مؤثر نہیں، قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے مؤثر احادیث و حکایات سے اور سلف صالحین کے حالات سے، اس لئے کہ ان منقول و روایت کا جو مقصود ہے وہ ان کو حاصل تھا، احکام پر ان کا عمل شکلی اور ظاہری نہ تھا بلکہ ان کو ان کا اصلی ذوق اور لب لباب حاصل تھا، اور یہ جو بات تجھ سے کہہ رہا ہوں وہ عملی تجربہ اور

---

[1] صید الخاطر ج ۲ ص ۲۰۰

خود آزمائش کرنے کے بعد میں نے دیکھا ہے کہ عموماً محدثین اور طالبان حدیث کی ساری توجہ اور فن سند حدیث اور کثرت مرویات کی طرف ہوتی ہے اسی طرح عام فقہاء کی تمام تر توجہ جدلیات اور حریف کو زیر کرنے والے علم کی طرف ہوتی ہے بھلا ان چیزوں سے کہیں قلب میں کیا گداز اور رقت پیدا ہو سکتی ہے سلف کی ایک جماعت کسی نیک اور بزرگ شخص سے محض اس کے طور طریقہ کو دیکھنے کے لیے جاتی تھی علم کے استفادہ کے لیے نہیں اس لیے کہ یہ طور طریقہ اس کے علم کا حاصل ہوتا اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور فقہ و حدیث کی تحصیل میں سلف صالحین اور زہاد امت کی سیرت کا مطالعہ ضرور شامل کرو تاکہ اس سے تمہارے دل میں رقت پیدا ہو۔[1]

صلحائے امت کی سیرت

ابن جوزی نے اسی غرض کے لیے سلف صالحین اور صلحائے امت میں سے بہت سے متقدمین اور مشاہیر کی مستقل سیرتیں لکھی ہیں مثلاً حضرت حسن بصریؒ، سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ، حضرت سفیان ثوریؒ، حضرت ابراہیم بن ادہمؒ، حضرت بشر حافیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، حضرت معروف کرخیؒ،[2] ان مستقل تذکروں کے علاوہ ایک جامع تذکرہ صفۃ الصفوۃ لکھا جو پانچ جلدوں میں ہے، یہ دراصل ابو نعیم اصبہانیؒ کی مشہور کتاب حلیۃ الاولیاء کی تہذیب و تنقیح ہے جس کو ابن جوزی نے مناسب حذف و اضافہ اور تلخیص کے ساتھ نئے انداز و نئے طرز پر مرتب کیا ہے، اس کتاب میں جو حالات و واقعات آئے ہیں وہ موثر و دل گداز ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت سے مستند بھی ہیں اور مبالغہ آمیز روایات اور حشو و زوائد سے پاک ہیں۔

تاریخ کی اہمیت

ابن جوزی علوم دینیہ میں اشتغال اور فقہ و حدیث میں کمال کے ساتھ ساتھ فن تاریخ کی اہمیت و ضرورت

---

[1] صید الخاطر ص ۲۲۷ [2] ان میں سے مستقل اپنی کتاب کا تذکرہ العجمی نے صید الخاطر میں کیا ہے [illegible] ص [illegible] ص [illegible] ج ۳ ص [illegible] اور ص [illegible] ان میں سے بعض اور الذکر عجیب چیزیں ہیں۔

کے بھی بڑے قائل اور اس کی تعلیم کے سلسلے میں ان کے نزدیک تاریخ سے ناواقفیت کی بناء پر علماء و فقہاء سے اپنی کتابوں میں بعض بڑی افسوسناک فروگذاشتیں ہوئی ہیں جو ان کے منصب اور علم و فضل کے شایان شان نہیں اس لئے وہ طلاب علم کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہر فن سے وہ فی الجملہ واقف ہوں اور تاریخ سے اتنی واقفیت رکھتا ہو کہ کوئی بڑی تاریخی غلطی نہ کر بیٹھے جو اس کی خفت کا باعث ہو "تمہید الاوائل" میں لکھتے ہیں:۔

"فقیہ کو چاہئے کہ ہر فن کے ضروری حصہ سے واقف ہو تاکہ فقہ یا حدیث ختم ہو یا دوسرے فن اس لئے کہ فقہ تمام علوم کا محتاج ہے اس لئے ہر فن کے ضروری حصے سے اس کو واقف ہونا چاہئے میں نے بعض فقہاء کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ شیخ شبلی اور قاضی شریک ایک مجلس میں جمع ہوئے مجھ کو تعجب ہوا کہ اس کو دونوں بزرگوں کے زمانہ کا فاصلہ نہیں معلوم ہوا ایک عالم نے ایک مباحثہ کے دوران میں کہا کہ حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ کے درمیان زوجیت منقطع نہیں ہوئی تھی اس لئے حضرت علیؓ نے سیدہ کو غسل دیا میں نے کہا کہ خدا تمہارا بھلا کرے پھر حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے بعد ان کی بھانجی امامہ بنت زینبؓ سے نکاح کیسے کیا۔ اسی طرح میں نے امام غزالیؒ کی کتاب احیاء العلوم میں ایسی تاریخی فروگذاشتیں دیکھی ہیں جن سے مجھے سخت حیرت ہوئی کہ انھوں نے کس طرح غفلت و تساہل اور تاریخ کو پس پشت ڈال دیا ہے میں نے ان تاریخی اغلاط کو ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے اسی طرح انھوں نے اپنی کتاب "مستظہری" میں لکھا ہے جس کو انھوں نے مستظہر باللہ کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ سلیمان بن عبدالملک نے ابو حازم سے کہلوایا کہ مجھے اپنے ناشتہ میں سے کچھ تبرکاً بھیجو انھوں نے ان کے پاس اُبلا ہوا چوکر بھیجا۔ سلیمان نے اس کا ناشتہ کیا پھر اپنی بیوی سے ہمبستر ہوا اور اس سے عبدالعزیز پیدا ہوئے عبدالعزیز کے گھر عمر بن عبدالعزیز پیدا ہوئے یہ سخت مغالطہ ہے اس لئے کہ انھوں نے عمر بن عبدالعزیز کو سلیمان بن عبدالملک کا پوتا قرار دیا حالانکہ وہ ان کے ابن عم تھے شیخ ابوالمعالی جوینی نے اپنی کتاب "الشامل" کے آخر میں اصول

میں یہ لکھا ہے کہ ابن عقیل کی ایک بات نقل کی ہے کہ حلاج، جنابی قرمطی اور ابن المقفع نے سلطنت کے نظام کو الٹنے، حکومت کی تخریب اور عوام کی استمالت کی سازش کی اور ہر ایک نے ایک ایک ملک کی ذمہ داری لی، جنابی نے احساء میں سکونت اختیار کی، ابن المقفع ترکستان کے حدود میں چلا گیا اور حلاج نے بغداد کو اپنا مرکز بنایا، اس پر ان کے دونوں ساتھیوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا اور اپنے مقصد میں ناکام رہے گا، اس لئے کہ اہل بغداد دھوکہ نہیں کھاتے اور بڑے مردم شناس اور فہیم ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر ناقل کو یہ معلوم ہوتا کہ حلاج نے ابن المقفع کا زمانہ ہی نہیں پایا، اس لئے کہ ابن المقفع کے قتل کا منصور نے حکم دیا تھا، اور یہ ۱۴۴ھ کا واقعہ ہے اور اسی طرح ابو سعید جنابی کا ظہور ۲۸۶ھ میں ہوا ہے اور حلاج ۳۰۹ھ میں مقتول ہوا، اس بنا پر قرمطی اور حلاج کا زمانہ قریب قریب ہے لیکن ابن المقفع بہت متقدم ہے، اس کے ان دونوں سے ملنے اور سازش کرنے کا کوئی امکان نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہر صاحب علم کو چاہئے کہ دوسرے علوم سے بھی تعلق رکھے اور اس کا کچھ مطالعہ رہے اس لئے کہ ہر علم کا دوسرے علم سے تعلق ہے ایک محدث کے لئے یہ بات کتنی معیوب ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق اس سے فتویٰ پوچھا جائے اور وہ جواب نہ دے سکے اس لئے کہ وہ طرق حدیث کے جمع کرنے میں مشغول رہا، اس کو مسائل و جزئیات کے علم کی فرصت ہی نہیں ملی، اسی طرح ایک فقیہ کے لئے یہ بات کتنی نامناسب ہے کہ اس سے ایک حدیث کا مطلب پوچھا جائے اور وہ حدیث کی صحت اور اس کے مفہوم سے بالکل ناواقف ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایسی بلند ہمت عطا فرمائے جو پست اور بے ہمتی کی باتوں کو گوارا نہ کرے۔[1]

تاریخی تصنیفات

انہوں نے صرف اس تنقید اور مشورہ پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایک مبسوط کتاب "المنتظم فی تاریخ الملوک والامم"

---

[1] صید الخاطر ج ۲ ص ۲۲۔۲۳

ضخیم جو دس جلدوں میں ہے، اور ابتدائے اسلام سے ۵۷۴ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے، مصنف پہلے سن لکھتے ہیں، پھر اس سن کے اہم واقعات و حالات کا تذکرہ کرتے ہیں، پھر اس سن میں جن ممتاز اور قابلِ ذکر اشخاص کا انتقال ہوا ہے، ان کے حالات بیان کرتے ہیں، اس طرح یہ کتاب حالات و تذکرہ دونوں کی ایک جامع تاریخ ہے۔[1]

اسی طرح ان کی ایک مختصر کتاب "تلقیح فہوم اہل الاثر فی عیون التاریخ والسیر" ہے، جو ایک تاریخی بیاض کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں بہت سی تاریخی معلومات یکجا کر دیے گئے ہیں۔[2]

ادبیت و خطابت

ابن جوزی کی فصاحت و بلاغت اور حسنِ خطابت پر مورخین کا اتفاق ہے، ان کی مجالسِ وعظ کی مقبولیت اور لوگوں کے اژدحام کا یہی ایک بڑا سبب تھا، انھوں نے صید الخاطر میں اپنی اس ذہنی کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے کہ نفس نے ان کو اس کی ترغیب دی کہ وہ اس کا اہتمام بالکل چھوڑ دیں اور الفاظ کی طرف بالکل توجہ نہ کریں، یہ سب تکلف اور تصنع ہے، لیکن انھوں نے اپنے علم اور تفقہ سے اس خیال کو دفع کیا، اور اپنے نفس کو سمجھایا کہ حسنِ کلام ایک خداداد قابلیت، ایک ہتھیار اور ایک کمال کی بات ہے نہ کہ نقص اور عیب، اس لیے ان کو دعوت و تبلیغ میں اس سے کام لینا چاہیے، اس کی ناقدری نہیں کرنی چاہیے، اسی طرح ان کے دل میں کئی بار بشدت اس کا خیال پیدا ہوا کہ وہ اس وعظ گوئی اور دعوت و تبلیغ کو چھوڑ کر زہد و انقطاع کی زندگی اختیار کر لیں اور لوگوں سے بالکل یکسو ہو کر گوشہ نشین ہو جائیں، مگر انھوں نے دلائل و براہین سے اور اپنے نفس سے مفصل مباحثہ و مناظرہ کر کے اس خیال کو

---

[1] اس کتاب کے آخری پانچ حصے دائرۃ المعارف حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ [2] یہ کتاب ہندوستان میں مولوی سید محمد یوسف صاحب ٹونکی مرحوم کے اہتمام سے شائع ہو چکی ہے۔

بٹھا دیا اور اس کو قائل کیا کہ یہ القائے شیطانی ہے، شیطان یہ دیکھ نہیں سکتا کہ ہزاروں آدمی اس کے جال سے نکل کر ہدایت کے راستہ پر پڑ جائیں، انبیاء علیہم السلام کا راستہ دعوت و تبلیغ کا تھا اور ان کی زندگی اجتماع و اختلاط کی تھی، اس میں نفس کا چور یہ ہے کہ وہ بیکاری اور تعطل کو پسند کرتا ہے اور جد و جہد سے بھاگتا ہے، دوسرے اس میں جاہ طلبی بھی ہے، اس لئے کہ عزلت و گوشہ نشینی اور زہد و انقطاع کی زندگی عوام کے لئے زیادہ باعث کشش اور جاذب توجہ ہے، غرض یہ کہ شیطان ان کو افادۂ عوام اور عمومی دعوت کے کام سے ہٹا نہیں سکا، انھوں نے اپنی ساری ذہنی صلاحیتیں اور خدا کی بخشی ہوئی طاقتیں اصلاح پر لگا دیں، اور نصف صدی سے زیادہ پورے انہماک و قوت کے ساتھ اصلاح و افادہ کے کام میں مشغول رہے۔

وفات

۵۹۷ھ میں شب جمعہ کو اس داعی الی اللہ نے انتقال کیا، بغداد میں کہرام مچ گیا، بازار بند ہو گئے، جامع منصور میں نماز جنازہ ہوئی، یہ وسیع مسجد کثرت ازدحام سے تنگ اور ناکافی ثابت ہوئی، یہ بغداد کی تاریخ میں ایک یادگار دن تھا، ہر طرف غم کے آثار اور گریہ کی آوازیں بلند تھیں، لوگوں کو ان سے ایسا تعلق تھا کہ رمضان بھر لوگوں نے راتیں ان کی قبر کے پاس گزاریں اور قرآن مجید کے ختم کئے۔

نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی

صلیبی حملے اور عالم اسلام کے لئے نیا خطرہ

ایک طرف مرکز اسلام میں پوری قوت سے تصنیفی و تبلیغی کام ہو رہا تھا اور بعض عظیم شخصیتیں اصلاح و تربیت میں مشغول تھیں، دوسری طرف یورپ سے عالم اسلام پر خطرہ کے بادل منڈلا رہے تھے اور مسلمانوں کی ہستی اور تہذیب اسلام کا وجود خطرہ میں تھا، مسیحی یورپ صدیوں سے اسلام سے زخم کھائے بیٹھا تھا، مسلمان اس کی پوری مشرقی سلطنت پر قابض تھے اور اس کے تمام مقدس مقامات اور خود مولد مسیح ان کے قبضہ اور تولیت میں تھا، یورپ کے اشتعال اور جذبۂ انتقام کے لئے یہ صورت حال بالکل کافی تھی، لیکن خلافت اور اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور ہمسایہ مسیحی سلطنت بیزنطینی کی مسلسل پسپائی و ناکامی کے سبب اس کو یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ شام و فلسطین یا کسی اسلامی ملک کی طرف نظر اٹھائے، سلجوقی سلطنت کے زوال اور اسلامی سلطنت کی شمالی سرحدوں کی کمزوری کی وجہ سے یورپ میں قسمت آزمائی کا خیال پیدا ہوا، اسی زمانہ میں اس کو راہب پطرس کی صورت میں ایک ایسا خطیب اور مذہبی واعظ مل گیا جس نے ساری مسیحی دنیا میں اپنی آتش نوائیوں سے آگ لگا دی اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک مذہبی جوش کی ایک لہر پیدا کر دی، اس کے علاوہ وسیع و زرخیز اسلامی ممالک پر قبضہ کرنے کے اور بعض سیاسی و معاشی اسباب و محرکات بھی تھے جنھوں نے صلیبی حملوں میں دینی و دنیاوی کشش اور ترغیب پیدا کر دی۔

لہ صلیبیوں کے لئے [illegible]

بہرحال ۱۰۹۷ء میں صلیبیوں کے پہلے لشکر نے شام کی طرف کوچ کیا۔ دو سال کے عرصہ میں صلیبیوں کے لشکر نے الرہا (ایڈیسا) اور ولایت انطاکیہ کے بڑے شہروں، بہت سے قلعوں اور حلب پر قبضہ کر لیا۔ ۴۹۲ھ مطابق ۱۰۹۹ء میں صلیبی جانبازوں نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کر لیا اور چند سال کے اندر اندر ملک فلسطین کا بڑا حصہ یعنی ساحل شام پر انطرطوس، عکہ، طرابلس الشرق اور صیدا صلیبیوں کے تصرف میں آ گیا۔ مشہور انگریز مورخ سٹینلے لین پول کے بقول صلیبی سپاہی ملک پر اس طرح گھسے جیسے کوئی پچر لکڑی میں ٹھونک دے۔ تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی دھجیاں اڑا دی گئیں۔ صلیبیوں نے داخلہ بیت المقدس کے موقع پر فتح کے نشہ میں سرشار ہو کر مجبور مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا ذکر ایک ذمہ دار مسیحی مورخ ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

> "بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ پر صلیبی مجاہدوں نے ایسا قتل عام مچایا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان صلیبیوں کے گھوڑے جو مسجد عمر میں سوار ہو کر گئے گھٹنوں گھٹنوں خون کے چشمے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیواروں سے دے مارا گیا یا ان کو چکر دے کر فصیل سے پھینک دیا گیا۔ یہودی کل کے کل اپنے ہیکل (معبد) میں زندہ جلا دیئے گئے۔
>
> دوسرے دن اس سے بڑے پیمانے پر لرزہ خیز مظالم کا جان بوجھ کر اعادہ کیا گیا۔ ٹینکرڈ نے تین سو قیدیوں کی جان کی حفاظت کی ضمانت دی تھی وہ چیختا چلاتا رہا اور ان سب کو باہر ہو کر قتل کر دیا گیا۔ پھر ایک زبردست قتل عام شروع ہوا۔ مردوں عورتوں اور بچوں کے جسم کاٹ کاٹ کر ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دیئے گئے۔ ان کی لاشوں کے ٹکڑوں اور کٹے ہوئے اعضاء کے ڈھیر لگ گئے۔ بالآخر یہ سفاکانہ قتل عام اختتام کو پہنچا۔ شہر کی خون آلودہ سڑکوں کو عرب قیدیوں سے دھلوایا گیا۔"[1]

بیت المقدس کی فتح اسلامی سلطنت کے ضعف اور زوال اور مسیحی دنیا کی سربلندی اور

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۶ صفحہ ۳۷۴ مضمون Crusades

اس کی زورخیز طاقت کی ضرب دی تھی اور عالم اسلام میں خطرہ کی گھنٹی بجی تھی، شام و فلسطین میں مستقل عیسائی ریاستیں (قدس، انطاکیہ، طرابلس اور یافا کی) قائم ہو چکی تھیں جو مرکز اسلام (حجاز) کی آزادی اور حرمت کے لیے مستقل خطرہ تھیں، اور صلیبیوں کے حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ ریجی نالڈ والی کرک نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا[1] اور حضور اطہر سے متعلق گستاخانہ اور اہانت آمیز کلمات اور ارادوں کا اظہار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ ارتداد کے بعد اسلام کی تاریخ میں اس سے زیادہ نازک وقت اور خطرہ کی گھڑی نہیں آئی، یہ دوسرا موقع تھا کہ اسلام کا وجود خطرہ میں تھا اور عالم اسلام کو ایک فیصلہ کن جنگ کرنا ضروری تھی۔

چھٹی صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ عالم اسلام میں بڑے انتشار و بدنظمی کا تھا، ملک شاہ سلجوقی کے جانشین باہم دست و گریباں تھے، خلفائے بنی عباس مدتوں پہلے ترکوں کو اپنی طاقت منتقل کر چکے تھے، عالم اسلام میں کوئی طاقتور سلطان اور کوئی ایسا قائد نہ تھا جو تنظیمی صلاحیتیں رکھتا ہو اور جو عالم اسلام کی بکھری طاقت کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر کے شمال و مغرب سے بڑھتے ہوئے خطرہ کا مقابلہ کر سکے، لین پول نے صحیح لکھا ہے کہ "یہ زمانہ التباس و تذبذب کا تھا کہ اس وسیع اور عظیم الشوکت (سلجوقی) سلطنت کو موت کے کرب میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ کر ہر شخص پر تحیر کا عالم طاری تھا، یہ بیچ کا زمانہ اس وقت تک بدنظمی کا تھا جب تک کہ نئی طاقتیں پورے طور پر مجتمع ہو کر ایک ہی سمت میں رجوع نہ ہو جائیں، مختصر یہ کہ یہی وہ ٹھیک وقت تھا جب کہ یورپ والے فوج کشی کر کے اپنی کامیابی کو یقینی کر لیتے۔"[2]

اتابک عمادالدین زنگی

لیکن عین اس کشمکش اور شدید تاریکی و مایوسی کے عالم میں عالم اسلام کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع

---

[1] سلطان صلاح الدین ایوبی از : (سٹینلے لین پول) صفحہ ۱۳ [2] ایضاً صفحہ ۱۴

ہوا عالم اسلام کو حسب معمول عین ضرورت کے موقع پر ایک نیا قائد اور ایک تازہ دم مجاہد مل گیا، اور جس گوشہ سے امید نہ تھی وہاں سے ایک نئی طاقت ابھری جس کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔

لین پول لکھتا ہے:۔

> "مسلمانوں کے لئے ضروری ہوا کہ وہ جہاد کا اعلان کریں اور ایک ایسا سردار پیدا کریں جو بڑی ہمت اور جنگی قابلیت کا مالک ہو، جب یہ لڑنے لگیں تو ترکی سردار اور ان کے ماتحت والیانِ ملک ایک ایسی جوانمرد اور جنگجو و نبرد آزماؤں کی جماعت پیدا کریں جن کے سامنے صلیبیوں کو اپنے مظالم اور زیادتیوں کا جواب دینا پڑے اور اب یہ سردار عماد الدین زنگی کی ذات میں نمودار ہوا۔"[۱]

عماد الدین صلیبیوں کا پہلا حریف تھا، وہ سلطان محمود سلجوقی کے شہزادوں کا اتالیق (اتابک) اور سلطان کی طرف سے موصل کا حاکم تھا، زنگی نے عراق و شام میں اپنی طاقت مستحکم و منظم کر کے الرہا (ایڈیسا) پر حملہ کیا جو عیسائیوں کی ریاست میں سب سے زیادہ مضبوط و مستحکم مقام تھا اور اس کو بڑی فوجی اہمیت حاصل تھی، ۶ جمادی الآخری ۵۳۹ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۱۴۴ء کو اس نے الرہا پر قبضہ کر لیا، عرب مؤرخین کے الفاظ میں یہ فتح الفتوح تھی، یہ شہر لاطینی سلطنت کا بڑا سہارا تھا، اس طرح فرات کی وادی صلیبیوں کے خطرہ سے محفوظ ہو گئی، اس فتح کے کچھ عرصہ بعد ۵۴۱ھ مطابق ۱۱۴۶ء میں وہ ایک غلام کے ہاتھ سے شہید ہو گیا، شہادت سے پہلے اس نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کی شاندار ابتدا کر دی تھی جس کو اس کے نامور فرزند الملک العادل نور الدین زنگی نے بہت آگے تک پہونچا دیا۔

الملک العادل نور الدین زنگی

نور الدین محمود اب سلطان شام تھا، اور تمام مسلمانوں کی طرف سے صلیبیوں کے افواج اور بیت المقدس

---

[۱] سلطان صلاح الدین ص ۴۹

کی بازیافت کے لئے اپنے کو مامور من اللہ سمجھتا تھا اور اس خدمت عظیم کو اپنی سب سے بڑی عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ جانتا تھا۔ اس نے اپنے حملوں سے تمام مسیحی ریاستوں پر دھاک بٹھا دی تھی ۵۵۹ھ میں وہ قلعہ حارم پر قابض ہوا جو ایک مضبوط شمالی سرحدی قلعہ تھا۔ بادشاہ انطاکیہ نواب طرابلس بیمنڈ و دیگر مشہور و معروف نائٹوں کے گرفتار ہو گئے۔ اس معرکہ میں دس ہزار عیسائی قتل ہوئے اور بے شمار قید۔ اس قبضہ کے بعد قلعہ بانیاس فتح کیا۔[1] ادھر اس نے مصر فتح کر کے عیسائیوں کو دو طرف سے محصور کر لیا۔ لین پول لکھتا ہے:۔

> نور الدین سلطان شام کے سپہ سالار صلاح الدین کا ورود مصر پر قابض ہو جانا یہ معنی رکھتا تھا کہ یروشلم کی مسیحی سلطنت ایک چڑھی ہوئی دریا کے بیچ میں آ گئی تھی، دونوں طرف سے وہ دب رہی تھی اور دونوں طرف جو جبڑے کھینچ رہی تھی وہ ایک ہی طاقت کے دو لشکر تھے۔ دمیاط اور اسکندریہ کی بندرگاہوں پر قابض ہو جانے سے مسلمانوں کا قبضہ ایک بحری بیڑے پر بھی ہو گیا اور انہوں نے مصر کے صلیبیوں کا تعلق یورپ سے منقطع کر دیا۔[2]

نور الدین نے تقریباً فلسطین کے پورے علاقہ کو صلیبیوں سے صاف کر دیا لیکن اس کی سب سے بڑی آرزو اور سب سے مقدس خدمت بیت المقدس کی بازیابی تھی لیکن یہ سعادت اس کے سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبی کی قسمت میں تھی جو خود نور الدین کے حسنات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ ۵۶۹ھ مطابق ۱۱۷۴ء کو چھپن برس کی عمر میں بعارضہ خناق اس کا انتقال ہوا۔ بقول انگریز مورخ سلطان نور الدین بادشاہ شام کے مرنے کی خبر مسلمانوں پر اس طرح پڑی جیسے آسمان سے بجلی گر پڑے۔[3]

نور الدین کے محامد و اوصاف

مسلمان مورخ سلطان نور الدین کے عدل و دیانت و تقویٰ حسن انتظام، شرافت نفس، محاسن اخلاق

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۱۱ ص ۱۲۰ [2] سلطان صلاح الدین ص ۹۴ [3] ایضاً ص ۱۱۲

اور [illegible] امراض میں طبیب [illegible] اور وہ اپنی [illegible] کی طرح ان سب کا معالج و محافظ ہے۔

ابن جوزی جو سلطان کے معاصر ہیں اپنی مشہور تاریخ المنتظم میں لکھتے ہیں:-

[illegible]	نورالدین نے [illegible]
[illegible]	سے [illegible]
[illegible]	سلاطین و حکام سے [illegible]
[illegible]	ان کی [illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible] اور علماء

[illegible] کرتے تھے۔

ابن خلکان جو [illegible] اپنی [illegible] لکھتے ہیں:-

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible] الماهر	[illegible]
[illegible]	[illegible] ہے۔

تاریخ کامل کے نامور مصنف ابن الاثیر جزری نے ان کے متعلق بیان میں لکھا ہے کہ:

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] کاروانِ سلطان [illegible] گیا

سلطان نور الدین کی وفات کے وقت ابن الاثیر کی عمر [illegible] سال کی تھی اس لئے ان کی روایت اور مشاہدات خاص وقعت رکھتی ہے وہ سلطان مرحوم کی سیرت و اخلاق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وہ راتوں کو عبادت کرتے [illegible] کا یہ عالم تھا کہ [illegible]

[illegible] حدیث کی روایت کی اجازت [illegible]

عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ [illegible]

[illegible]

[illegible] قاضی صاحب [illegible]

[illegible] مقدمہ میں [illegible]

[illegible]

وہاں تو انھوں نے اپنا حق معاف کر دیا اور کہا کہ میرا پہلے سے یہی ارادہ تھا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ شاید عدالت میں حاضر نہ ہونے کا سبب غرور و تکبر ہو اس لئے میں حاضر ہو گیا، اب میں اپنا حق معاف کرتا ہوں۔ انھوں نے دار العدل کی تعمیر کرائی تھی جہاں وہ قاضی کے ساتھ بیٹھ کر مظلوم کا انصاف کرتے خواہ وہ یہودی ہوتا اور ظالم کو سزا دیتے خواہ وہ ان کا فرزند ہوتا یا بڑے سے بڑا افسر و حاکم۔

شجاعت ان پر ختم تھی وہ جنگ میں دو کمانیں اور دو ترکش ساتھ رکھتے تھے ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کو قسم خدا کا واسطہ آپ اپنی زندگی کو خطرہ میں نہ ڈالیں اور اسلام کو مصیبت میں مبتلا نہ کریں، محمود نے جواب دیا کہ محمود کیا چیز ہے کہ اس کے متعلق یہ بات کہی جائے مجھ سے پہلے ملک اور اسلام کی کس نے حفاظت کی، وہ معبود برحق ہے لا الٰہ الا ہو۔

علماء و اہل دین کی تعظیم کرتے تھے ان کے لئے کھڑے ہو جاتے اپنے پاس بٹھاتے بے تکلفی سے باتیں کرتے کسی بات سے انکار نہ کرتے اپنے قلم سے ان کو خط لکھتے لیکن اس تواضع و خاکساری کے باوجود بڑے رعب و داب کے آدمی تھے لوگوں پر اس کا اثر پڑتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کے مناقب و محامد کو یہ کتاب تحمل نہیں اس کے لئے دفتر درکار ہے۔[1]

شوق جہاد اور ایمان و یقین

نور الدین کی تمام تر توجہ اور دلچسپی جہاد اور عیسائیوں کے مقابلہ سے تھی اس بارہ میں ان کا عزم اعتماد و توکل اور ایمان و یقین بہت بڑھا ہوا تھا۔

۵۵۸ھ میں نور الدین کو حصن الاکراد کے مقام پر جو بقیعہ کے نام سے مشہور ہے عیسائیوں کے اچانک حملہ کرنے کی وجہ سے شکست ہوئی، نور الدین حمص کے قریب جو اس سے چند میل کے فاصلہ پر مقیم تھے

---

[1] الکامل ج ۱۱ ص ۱۲۵-۱۲۶ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الکامل ج ۱۱ ص ۱۴۰

بعض خیر خواہوں نے کہا کہ بادشاہ کا تنہا دشمن کے اتنے قریب قیام کرنا مناسب نہیں، نورالدین نے ان کو خاموش کیا اور کہا کہ اگر ہزار سوار بھی میرے پاس ہوں تو مجھے دشمن کی پرواہ نہیں، خدا کی قسم میں جب تک اپنا اور اسلام کا انتقام نہ لے لوں گا کسی چھت کے نیچے نہ آؤں گا۔ نورالدین نے بڑی دریا دلی سے اہل لشکر کو عطایا اور رقوم کی تقسیم کی، بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ فقہاء، فقراء اور صوفیہ و قراء کے لئے جو وظائف اور رقوم خزانہ شاہی سے مقرر ہیں ان سے اس موقع پر کام لیا جائے، نورالدین نے غضبناک ہو کر جواب دیا کہ مجھے تو نصرت الٰہی کی امید انہی فقراء و ضعفاء کی دعا اور رضا سے ہے، حدیث میں آتا ہے کہ "اللہ کی طرف سے رزق اور مدد کمزور بندوں کی بدولت ہوتی ہے" میں کس طرح ایسے لوگوں کی مدد بند کر دوں جو ایسے وقت میں میری طرف سے جنگ کرتے ہیں جب میں اپنے بستر پر سوتا ہوتا ہوں اور ان کے تیر خطا نہیں جاتے، اور جن کا تم تذکرہ کرتے ہو وہ صرف اس وقت جنگ کرتے ہیں جب مجھے دیکھتے ہیں، اور ان کے تیر کبھی خطا کر جاتے ہیں کبھی نشانہ پر لگتے ہیں، ان غریبوں کا تو بیت المال میں حق بھی ہے میں ان کا حق لے کر دوسروں کو کیوں کر دے دوں؟[1]

نورالدین نے عیسائیوں سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کی پوری تیاری کی، لشکر کو انعامات و عطیات سے مالا مال کر دیا، سرحدی علاقوں اور اسلامی ریاستوں کے امراء و حکام کو پر اثر خطوط لکھے اور ان کو جہاد فی سبیل اللہ اور شرکت و رفاقت کی ترغیب دی، ان علاقوں کے زاہدوں، عابدوں اور علماء و فقراء کو بھی خطوط لکھے جن میں فرنگیوں کی زیادتیوں اور مظالم کا تذکرہ کیا اور ان سے دعا کی درخواست کی اور اس کی خواہش کی کہ وہ مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کریں، چنانچہ ان حضرات نے دور دور لوگوں کو خطوط پڑھ کر سنائے اور سلطان کے لئے دعا کی، لوگوں میں جوشِ جہاد کی ایک لہر پیدا ہو گئی، والیانِ ملک اپنے اپنے لشکر لے کر آئے، ادھر عیسائیوں نے بھی اپنی پوری طاقت اور ہر طرف کی افواج مقابلہ کے لئے جمع کر دیں، لیکن

---

[1] الکامل ج ۱۱ ص ۹۰

سلطان نے اپنی نذر پوری کی اور عیسائیوں کی متحدہ طاقت پر فتح حاصل کر کے حارم پر قبضہ کر لیا۔[1]

نور الدین کے ایمانی ذوق و یقین کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قلعہ بانیاس کے محاصرہ میں ان کے بھائی نصرۃ الدین امیر میران کی ایک آنکھ جاتی رہی، نور الدین نے دیکھا تو بھائی سے کہا کہ اگر تم کو وہ اجر و ثواب نظر آ جائے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رکھا ہے تو تم تمنا کرو کہ دوسری آنکھ بھی راہ خدا میں کام آ جائے۔[2]

سلطان صلاح الدین ایوبی[3]

صلاح الدین ایوبی کی ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معجزہ اور اسلام کی صداقت و ابدیت کی روشن دلیل ہے۔

ایک متوسط درجہ کے کرد شریف زادہ اور خاندانی سپاہی کی حیثیت سے ان کا نشو و نما ہوا[4] مصر کی فتح اور صلیبیوں کے مقابلہ میں میدان میں آنے سے پہلے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کرد نوجوان

---

[1] کامل ج ۱۱ ص [illegible]

[2] ایضاً ص [illegible]

[3] سلطان صلاح الدین ایوبی اس لئے کہلاتے ہیں کہ ان کے والد کا نام ایوب تھا، اسی نسبت سے سارا خاندان ایوبی کہلاتا ہے، یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کا کوئی تعلق ابو ایوب انصاریؓ کی نسل سے تھا۔ سلطان اور ان کا پورا خاندان نسلاً کرد ہے، یہ قوم اب بھی عراق، شام، ترکی اور ایران میں پائی جاتی ہے۔

[4] ان کے والد اور اہل خاندان شمالی آذربائیجان کے گاؤں "دوین" کے رہنے والے تھے، ان کا تعلق قبیلہ ہذبانیہ کی ایک شاخ "روادیہ" سے تھا جو کردوں کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا شادی اپنے دونوں لڑکوں ایوب نجم الدین اور شیرکوہ اسد الدین کو لے کر بغداد منتقل ہو گئے تھے، اس کے بعد تکریت میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں شادی کا انتقال ہوا، کچھ دنوں کے بعد دونوں لڑکے مجاہد الدین بہروز کوتوال شہر کی ملازمت میں داخل ہو گئے جو سلطان مسعود بن غیاث الدین محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف سے مامور کیا گیا تھا، نجم الدین ایوب اس کے بعد عماد الدین زنگی کے متعلق ہو گئے اور قلعہ بعلبک وغیرہ کے حاکم بنا دیئے گئے۔ (صلاح الدین ایوبی از محمد فرید ابو حدید ص ۲۰-۲۱)

بیت المقدس کا فاتح اور عالمِ اسلام کا محافظ ثابت ہو گا اس کی قسمت میں وہ سعادت لکھی ہے جو بڑے بڑے عالی نسب شہزادوں اور سلاطین کے لئے قابلِ رشک ہے، اور تاریخ میں وہ ایسا کارنامہ انجام دے گا جس سے روحِ مبارک تک کو شادمانی حاصل ہوگی۔

لین پول لکھتا ہے کہ "بجائے اس کے کہ صلاح الدین سے کوئی علامت ایسی ظاہر ہوتی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ آئندہ کوئی بڑا آدمی ہونے والا ہے، وہ ایک روشن مثال اس خاموش اور بے ادعا نیکی کی بنا رہا جو شریف طبیعتوں کو تمام اخلاقی کمزوریوں سے دور رکھتی ہے"[1]

لیکن جب اللہ تعالیٰ کو ان سے کام لینا منظور ہوا تو اس کا غیبی سامان کیا گیا، ان کو ان کے ولی نعمت نور الدین نے بسخت اصرار و حکم سے مصر بھیجا۔ قاضی بہاء الدین ابن شداد سلطان کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ سلطان نے مجھ سے خود بیان کیا کہ میں بڑی ناگواری اور مجبوری سے مصر آیا، میرا مصر آنا بالکل میری مرضی سے نہیں ہوا، میرا حال بالکل وہی ہے جس کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ[2]

زندگی میں تبدیلی

مصر پہنچ کر جب صلاح الدین کے لئے میدان بالکل صاف ہو گیا اور مصر کی زمامِ مملکت ان کے ہاتھ میں آگئی تو ان کی زندگی یکسر بدل گئی، یہ خیال دل میں جم گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی بڑا کام لینا ہے اور اس کام کے ساتھ عیش و راحت کا کوئی جوڑ نہیں۔

قاضی بہاء الدین ابن شداد لکھتے ہیں کہ حکومت (مصر) کی باگ ڈور ہاتھ میں آجانے کے بعد دنیا ان کی نظر میں ہیچ ہو گئی، شکر گزاری کا جذبہ ان کے دل میں موجزن ہوا، شراب سے توبہ کی، عیش و تفریح سے منہ موڑ لیا، اور ایک سنجیدہ اور جفاکش زندگی اختیار کی، اور اس میں دن بدن ترقی ہوتی گئی۔[3]

---

[1] سلطان صلاح الدین ص۳۷ [2] النوادر السلطانیہ ص۳۴ [3] ایضاً والمحاسن الیوسفیہ ص۳۳، ۳۴

لین پول لکھتا ہے:۔

"اب جہاں کہ صلاح الدین کا اپنا منصب تھا، اس نے اپنی زندگی کے طور طریقے بدل دیئے۔ متقی اور پرہیزگار تو وہ ہمیشہ کا تھا مگر اب اس میں اور بھی احتیاط کی، دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کا جہان بالکل ترک کر دیا اور اپنے اعمال پر بھی سخت پابندیاں عائد کیں اور اپنے ماتحتوں کے لیے بہترین اور ایک مثال بنا۔ اس نے اپنی تمام تر کوششیں اس بات میں صرف کیں کہ ایک ایسی اسلامی سلطنت قائم کرے جو بیرونی کفار کو ملک سے خارج کرنے کی پوری طاقت رکھتی ہو۔ ایک موقع پر اس نے کہا "جب خدا نے مجھے مصر دیا تو میں سمجھا کہ فلسطین بھی مجھے اللہ کو دینا منظور ہے۔"

اس وقت سے صلاح الدین کی زندگی کا مقصد آخر تک اسلام کی نصرت اور حمایت رہا اور اس نے عہد کر لیا کہ کفار پر جہاد کرے گا۔[1]

جہاد کا عشق

سلطان کو جہاد سے عشق تھا، جہاد اس کی سب سے بڑی عبادت سب سے بڑی لذت تھی اور اس کی روح کی غذا تھی۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ:۔

"جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق ان کے رگ و ریشہ میں سما گیا تھا اور ان کے قلب و دماغ پر چھا گیا تھا یہاں تک کہ ان کا موضوع گفتگو تھا، اسی کا سامان مہیا کرتے رہتے تھے اور اسی کے اسباب و وسائل پر غور کرتے، اسی کے علمبردار آدمیوں کی ان کو تلاش رہتی، اسی کا ذکر کرنے والے اور اسی کی ترغیب دینے والے کی طرف وہ توجہ کرتے، اسی جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر انہوں نے اپنی اولاد، اپنا خاندان، اور وطن

---

[1] سلطان صلاح الدین صفحہ

مگر ان دنوں جنگ کو خیر باد کہہ اور عیش کی تمام لذتیں ترک کر دیں اور ایک جہاد کی زندگی پر قناعت کی جس کا حوالہ دیا جا سکتا ہے نہیں کہ جس شخص کو اگر ان کا قرب حاصل کرنا ہوتا تو وہ ان کو جہاد کی ترغیب دیتا اور اس طرح ان کی نظروں میں قربت حاصل کر لیتا۔ قسم کھائی جا سکتی ہے کہ جہاد کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد انہوں نے ایک پیسہ بھی جہاد اور مجاہدین کی امداد و اعانت کے علاوہ کسی مصرف میں خرچ نہیں کیا۔[١]

سلطان کی اسی عاشقانہ کیفیت اور دردمندی کی تصویر ابن شداد نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"میدان جنگ میں سلطان کی کیفیت ایک ایسی عورت کی سی ہوتی تھی جس نے اپنے اکلوتے بچے کا داغ اٹھایا ہو۔ وہ ایک صف سے دوسری صف تک گھوڑے پر دوڑتے پھرتے اور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے خود سب لائنوں میں گشت کرتے اور پکارتے پھرتے "یا للاسلام" اسلام کی مدد کرو۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے۔"[٢]

عکا کے معرکہ میں ان کی کیفیت یہ تھی۔

"سارے دن سلطان نے ایک دانہ بھی نہیں کھایا صرف طبیب کے مشورہ سے دوا کے لیے ایک قطرہ شربت کا استعمال کیا۔[٣] ساتھ ہی طبیب نے مجھ سے کہا کہ ایک مرتبہ سے آج تک سلطان نے صرف چند لقمے کھائے ہیں، ان کی طبیعت میدان جنگ کے علاوہ کسی اور طرف متوجہ ہی نہیں ہوتی تھی۔"[٤]

حطین کی فیصلہ کن جنگ

آخر کار ان جنگی کارروائیوں اور مقابلوں کے بعد وہ معرکہ پیش آیا جو تاریخ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے اور جس نے فلسطین کی مسیحی سلطنت کا خاتمہ اور صلیبیوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ یہ حطین کی جنگ تھی جو جمعہ کے دن ۲۴ ربیع الآخر ۵۸۳ھ[٥] کو پیش آئی اور جس میں مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہوئی۔

لین پول اسی میدان جنگ کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھتا ہے:-

---

[١] النوادر السلطانیہ ص ٢٣ [٢] ایضاً ص ١٠ [٣] ایضاً [٤] ایضاً ص ٢٣ [٥] ۴ جولائی ۱۱۸۷ء

"مسیحی لشکر کے چیدہ اور منتخب جو افراد تھے گرفتار کر لئے گئے۔ گائی بادشاہ یروشلم اور اس کا بھائی جیفری، رینالڈ کارلی، ہمفری تونتین کا، مونٹ فیرٹ، داویہ اور اسبتاریہ کے دونوں مقدم اور بڑے بڑے عیسائی اشراف گرفتار کر لئے گئے۔ ... باقی فلسطین کے تمام عیسائی بہادر اور شہسوار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے۔ مسیحی لشکر کے تیس ہزار سپاہی مارے گئے اور جو زندہ بچے تھے سب گرفتار ہو کے اسیر ہو گئے تھے۔ ایک ایک مسلمان سپاہی تیس تیس عیسائیوں کو خیمے کی طنابوں سے گرفتار کر کے لئے جاتا تھا۔ خیمے کی طنابوں سے باندھے جاتا دیکھا گیا۔ ٹوٹی ہوئی صلیبوں اور کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں میں مردوں کے ڈھیر یوں لگے تھے جیسے پتھر پر پتھر پڑے ہوں اور کٹے ہوئے سر زمین پر اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے تربوزوں کے کھیت پر تربوز بکھرے پڑے نظر آئیں۔[۱] ...... یہاں تک کہ جنگ کا یہ میدان جس میں یہ لڑائی ہوئی تھی اور جہاں بیان کیا جاتا ہے کہ تیس ہزار آدمی مارے گئے تھے مشہور ہوا۔ ایک سال کے بعد سپید سپید ہڈیوں کے تودے اور ڈھیر دور سے لوگوں کو نظر آتے تھے اور جانوروں کے کھانے کے بعد جو ٹکڑے لاشوں کے بچ رہے تھے وہ بھی میدان میں جا بجا پڑے دکھائی دیتے تھے۔"[۲]

سلطان کی دینی حمیت

اس فتح کے ساتھ یہ واقعہ بھی تاریخ میں یادگار رہے گا جس سے سلطان کی دینی حمیت اور اس کی قوت ایمانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مناسب ہے کہ یہ واقعہ بھی ہم انگریز مورخ کی زبان سے سنیں۔

"سلطان صلاح الدین نے اپنا خیمہ لڑائی کے میدان میں نصب کرایا۔ جب خیمہ نصب ہو گیا تو حکم دیا کہ قیدی سامنے حاضر کئے جائیں۔ بادشاہ گائی اور ریگنالڈ شیٹلون (حصین) دونوں اندر لائے گئے۔ سلطان نے بادشاہ یروشلم کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ اور اسے پیاسا دیکھ کر برف میں سرد کئے ہوئے پانی کا

---

[۱] سلطان صلاح الدین صفحہ ۱۸۸،۱۸۷ [۲] ایضاً ۱۸۹

گیا۔ بادشاہ گائی نے پانی پیا۔ اور باقی ماندہ پانی ریجی نالڈ کو دیا۔ سلطان نے یہ دیکھ کر ناخوشی اور ترجمان سے کہا کہ بادشاہ سے کہو کہ میں نے اس شخص کو پانی نہیں دیا ہے بادشاہ گائی نے دیا ہے روٹی اور نمک جس کو دیتے ہیں وہ محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ آدمی اس قسم کی حفاظت پا کر بھی میرے انتقام سے نہیں بچ سکتا۔ صلاح الدین اٹھ کھڑا ہوا اور ریجی نالڈ کے سامنے آیا اور ریجی نالڈ جب خیمہ میں داخل ہوا تھا پابجولاں تھا۔ سلطان نے اس سے کہا میں نے تجھے قتل کرنے کی قسم دو مرتبہ کھائی تھی ایک مرتبہ تو اس وقت جب کہ تو نے مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں پر حملہ کرنا چاہا تھا اور دوسری مرتبہ اس وقت جب کہ تو نے دھوکے اور دغابازی سے حاجیوں کے قافلہ پر حملہ کیا تھا۔ دیکھ میں اب تیری بے ادبی اور توہین کا انتقام لیتا ہوں۔ اتنا کہہ کر صلاح الدین نے تلوار نکالی اور جیسا کہا تھا ریجی نالڈ کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا جو کچھ رمق باقی تھی اسے پہرہ داروں نے آکر ختم کیا۔

بادشاہ گائی اس قتل کو دیکھ کر ڈر گیا اور سمجھا اب میری باری آئی مگر صلاح الدین نے اس کا اطمینان کیا۔ اور کہا کہ بادشاہوں کا دستور نہیں کہ وہ بادشاہوں کو قتل کریں اس شخص نے بار بار عہد شکنیاں کی تھیں اب جو کچھ ہونا تھا گذر گیا۔[2]

ابن شداد نے لکھا ہے کہ سلطان نے ریجی نالڈ کو طلب کیا اور کہا کہ ھا انا انتصر لمحمد منک [illegible] میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا انتقام لیتا ہوں۔ ابن شداد نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے اس کو اسلام کی دعوت دی۔ مگر اس نے قبول نہیں کی۔[3]

---

[1] تاریخ ابن شداد کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ جب [illegible] نے [illegible] کی درخواست کی تو ان [illegible] کہا کہ [illegible] صلاح الدین کو پہنچا اور اس نے [illegible] کہا کہ یہ اب اس [illegible] ہاتھ سے [illegible] صفحہ ۱۶۲ [2] سیرت صلاح الدین صفحہ [illegible] [3] النوادر السلطانیہ صفحہ ۲۲

فتح بیت المقدس

حطین کی فتح کے بعد وہ مبارک موقع جلد آگیا جس کی سلطان کو بے حد آرزو تھی یعنی بیت المقدس کی فتح، قاضی ابن شداد نے لکھا ہے کہ:

> "سلطان کو بیت المقدس کی ایسی فکر تھی اور اس کے دل پر ایسا بار تھا کہ پہاڑ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"[1]

اسی سال ۵۸۳ھ ۲۷ رجب کو سلطان بیت المقدس میں داخل ہوئے اور ۹۱ برس کے بعد یہ پہلا قبلہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی شب میں انبیاء علیہم السلام کی امامت کی تھی مسلمانوں کی آغوش میں آیا، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ سلطان کے داخلہ کی تاریخ بھی وہی تھی جس تاریخ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی تھی۔ قاضی ابن شداد لکھتے ہیں:-

> "یہ عظیم الشان فتح تھی، اس مبارک موقع پر اہل علم کی بہت بڑی جماعت اور اہل خرقہ و اہل طریق کی کثیر تعداد جمع تھی، اس لئے کہ لوگوں کو جب ساحل سمندر کی فتح اور سلطان کے ارادہ کی اطلاع ملی تو مصر و شام سے علماء نے بیت المقدس کا رخ کیا اور کوئی روشناس اور معروف آدمی پیچھے نہیں رہا، ہر طرف دعا و تہلیل و تکبیر کا شور بلند تھا، بیت المقدس میں ۹۱ برس کے بعد جمعہ کی نماز ہوئی، قبۃ الصخرہ پر جو صلیب نصب تھی وہ اتار دی گئی، ایک عجیب منظر تھا، اسلام کی فتح مندی کا اور اللہ تعالیٰ کی مدد کھلی آنکھوں نظر آرہی تھی۔"[2]

نور الدین زنگی مرحوم نے بیت المقدس کے لئے بڑے اہتمام اور بڑے صرف سے منبر بنوایا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ بیت المقدس واپس دلائے گا تو یہ منبر نصب کیا جائے گا، صلاح الدین نے حلب سے وہ منبر طلب کیا اور اس کو مسجد اقصیٰ میں نصب کیا۔[3]

---

[1] ایضاً ص۸۰

[2] ایضاً ص۸۲

[3] تاریخ ابی الفداء اسماعیل ج ۳ ص ۷۱

اسلامی اخلاق کا مظاہرہ

صلاح الدین نے اس موقع پر جس عالی ظرفی، رواداری اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا وہ عیسائی مورخین کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔

> صلاح الدین کو بھی یہ بات [illegible] جب [illegible] تاریخ [illegible] جب کہ اسی موقع پر کیا جب یروشلم مسلمانوں کے [illegible] تھا اس کی [illegible] کے [illegible] تھے [illegible] ظلم [illegible] کر [illegible] اگر [illegible] تو [illegible] کے [illegible] اور ایک [illegible] کے [illegible] دے!

پھر سلطان کے عالی اخلاق اور طرز عمل اور بیان کرتے ہوئے [illegible] آزاد کرنے کے تذکرہ کے بعد یوں لکھتا ہے:

> اس [illegible] بالیان اور بطریق نے [illegible] کی [illegible] اور [illegible] کے [illegible] کر [illegible] کے [illegible] اور [illegible] کے [illegible] ان کی [illegible] یہ [illegible] کی [illegible] کے [illegible] تھا۔

[illegible] سلطان [illegible] کے [illegible] اور [illegible] کے [illegible] تھے جب [illegible]

بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو ان صلیبیوں نے [illegible] اسی شہر [illegible] جہاں [illegible] گھٹنوں [illegible] اور جہاں ان کے [illegible] آج [illegible] تھا اور [illegible] جو ظلم کرتے تھے ان پر [illegible]۔

جس قدر [illegible] صلیبیوں کو [illegible] مسلمانوں کا [illegible] تھے اور وہاں [illegible] عیسائیوں کی [illegible] سلطان صلاح الدین کے [illegible] کرم [illegible] تھا۔

[illegible] عدل ایسے اعتبار اور اعتماد [illegible] جا سکتا ہے۔

اگر سلطان صلاح الدین [illegible] بار بار [illegible] ثابت کرنے کے لیے کافی [illegible] تمام زمانوں [illegible] تھا[۱]

صلیبی سیلاب

بیت المقدس کی فتح اور صلیبیوں کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر ٹوٹ پڑا۔ اس بار یورپ کے تقریباً تمام مشہور جنگ آزمودہ مشہور بادشاہ اور سپہ سالار تھے۔ قیصر فریڈرک، رچرڈ شیر دل شاہ انگلستان [illegible] مقابل آیا

---

[۱] [illegible] صلاح الدین [illegible]

[illegible] اس طرح اپنی فوجوں کے ساتھ اسلامی لشکر ان سب کے مقابلہ میں تنہا سلطان صلاح الدین تھا اور اس کے ارکان دولت اور چند خاندان جو پورے عالم اسلام کی طرف سے مدافعت کر رہے تھے

صلح اور سلطان کے کام کی تکمیل

آخر پانچ برس کی مسلسل خونریزیوں اور تمام جنگوں کے بعد ۵۸۸ھ میں رملہ پر دونوں حریفوں میں جو تھک کر چور ہو گئے تھے صلح ہو گئی، بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوحہ شہر اور قلعے بدستور ان کے قبضہ میں رہے، ساحل بحر کی مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی، اور سارا ملک سلطان صلاح الدین کے زیر نگیں تھا، صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی اور صحیح تر الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا اس کے ہاتھوں مکمل ہوا، عیسائی مورخ اس کی کامیابی اور جنگ صلیبی کے نامبارک سلسلہ کے اختتام کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

> جنگ مقدس خاتمہ کو پہنچی، پانچ برس کی مسلسل لڑائیاں ختم ہوئیں، جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین بھی نہ تھی، ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب رملہ کی صلح ہوئی تو صور سے لے کر یافا تک ساحل کی پتلی زمین کی ایک پٹی کے سوا سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، اس [illegible] صلاح الدین کو [illegible] ضرورت نہ تھی، صلیبیوں نے جو کچھ فتح کیا تھا [illegible] اگر صرف جانی نقصان کا مقابلہ کیا جائے تو یہ نہایت حقیر تھا [illegible] لیے قیصر فریڈرک [illegible] انگلستان و فرانس [illegible] مشہور و معروف [illegible] اور تمام [illegible] عیسائی [illegible] ملک [illegible] بیت المقدس پر [illegible]

قبضہ اور یروشلم کی مسیحی سلطنت مٹنے کے قریب ہے پھر سرسبز ہو جائے۔ لیکن اتحاد کی یہ دعوت
دوران میں قیصر فریڈرک تو مر گیا، شاہان انگلستان و فرانس اپنے اپنے ملک کو سدھارے اور ان کے
بڑے بڑے حریف اور معزز رفیق ارض فلسطین میں خاک کا پیوند ہوئے لیکن یروشلم اس پر بھی سلطان
صلاح الدین کا رہا۔ صرف ساحل عکا کی مختصر سی ریاست پر جس کا برائے نام عیسائی بادشاہ حکومت کرتا رہا۔
تیسری جنگ صلیب میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کر رہی تھی مگر صلاح الدین کی قوت کو ٹس
سے مس نہ کر سکی۔ صلاح الدین کی سپاہ مہینوں کی سخت محنت و جانفشانی اور برسوں کی تند دہی اور
خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور چور ہو چکی تھی مگر کسی کی زبان پر حرف شکایت نہ تھا کبھی طلبی پر حاضر
ہونے اور ایک نیک کام میں اپنی جانیں قربان کرنے سے کسی نے انکار نہ کیا۔ دریائے دجلہ کی دور دراز
وادیوں میں ممکن ہے کہ سلطان کے تابع والیان ملک کے دل میں اس ہمیشہ کی طلبی کی وجہ سے کچھ شکایت پیدا
ہوئی ہو لیکن بہرکیف اپنی اپنی فوجیں سلطان کی خدمت میں لا کر جاں نثاری اور نیک خواہی کے ساتھ
ادا کی۔ آخری جنگ جو ارسوف پر ہوئی اس میں موصل کی فوجوں نے بڑی مردانگی اور جانبازی سے
کام لیا۔ ان تمام لڑائیوں میں سلطان کو ہمیشہ مصر اور عراق کی فوجوں سے مدد ملنے کا بھروسہ رہا۔۔۔
اور یہی تقویت ملک شام کی شمالی اور مرکزی فوجوں سے بھی۔ کرد، ترکمان، عرب، مصری سب سلطان اور
سلطنت کے خادم تھے اور طلبی پر نامزدوں کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے، باوجود اس کے کہ
ان کی نسل و قوم جدا تھی اور باوجود قومی چپقلشوں اور قبائلی غرور کے مگر سلطان نے ان کو ایسا تیز
منظم کر رکھا تھا کہ تمام لشکر یکجہتی و وحدت نظر آتا تھا۔ سب ایک ہی لشکر کے رکن تھے۔ دو ایک مرتبہ ایسی
نوبتیں آئیں کہ ان کو متفق اور متحد رکھنے میں مشکلات پیش آئیں اور بعض نازک مواقع ایسے بھی آئے کہ
ان کی جمعیتوں میں فرق پیدا ہوتا معلوم ہوا۔ باوجود یا ناپختگی کے یہ تمام مختلف النسل
قومیں ۱۱۹۲ء کے موسم خزاں تک سلطان کے حکم کے تابع رہیں اور جب صلح ۱۱۹۲ء میں پہلی مرتبہ خدا کی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کی حکمرانی [illegible]

[illegible] سلطان [illegible]

[illegible]

[illegible]

صلاح الدین [illegible]

[illegible]

[illegible] سلطان [illegible]

[illegible] سلطان [illegible]

[illegible]

[illegible] سلطان [illegible]

مجلس میں [illegible] سلطان [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حیات انسانی کے نازک وقت میں بھی صرف ایک دل اور دماغ تھا جو سب پر حاوی تھا اور یہ دل اور دماغ سلطان صلاح الدین کا تھا۔[۱]

وفات

بالآخر اپنا مقدس فریضہ ادا کرکے اور عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی کے خطرہ سے محفوظ کرنے کے بعد ۲۷ صفر ۵۸۹ھ کو اسلام کا یہ وفادار فرزند دنیا سے رخصت ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ستاون سال کی تھی۔[۲] قاضی بہاء الدین بن شداد سلطان کی وفات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "۲۷ صفر کی شب کو جو سلطان کی علالت کا بارہواں دن تھا، مرض میں شدت ہوگئی اور قوت گھٹ گئی۔ شیخ ابوجعفر امام الکلاسہ کو جو ایک نہایت صالح اور بزرگ شخص تھے، زحمت دی گئی کہ رات کو قلعہ میں رہیں۔ اگر رات کو وہ ساعت مقررہ آگئی جو سب کو پیش آنے والی ہے تو وہ اس وقت سلطان کے پاس ہوں اور ان کو تلقین کریں اور اللہ کا نام لیں۔ رات کو سلطان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفر کے لئے پابہ رکاب ہیں۔ شیخ ابوجعفر ان کے پاس بیٹھے ہوئے تلاوت و ذکر میں مشغول تھے۔ تین دن پہلے سے ان پر ایک غفلت اور غشی طاری تھی، کسی کسی وقت ان کو ہوش آجاتا تھا۔ جب شیخ ابوجعفر نے تلاوت کرتے ہوئے ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ پڑھی تو سلطان کو ہوش آگیا، ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، چہرہ کھل گیا اور کہا صحیح ہے اور یہ کہہ کر جان جان آفریں کے سپرد کی۔ یہ چہار شنبہ کا دن اور صبح کا وقت تھا۔ دنیائے اسلام پر ایسا وقت نہ آیا تھا کہ خلفائے راشدین کی وفات کے بعد سے ایسا سخت حادثہ نہیں گزرا۔ یہ خبر پھیلتے ہی قلعہ، شہر اور تمام دنیا پر ایک وحشت سی برس رہی تھی، خدا ہی کو معلوم ہے کہ کیسا رنج تھا اور کیسی اداسی تھی۔ میں پہلے جب سنتا تھا کہ لوگ دوسروں پر قربان ہو جانے اور ان کا فدیہ بننا

---

[۱] سلطان صلاح الدین ص [illegible]

[۲] سلطان کی ولادت ۵۳۲ھ کی ہے (ابوالفداء ج ۳ ص [illegible])

کوشش کرنے میں تو سمجھتا تھا کہ یہ محض اللہ کی راہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر ہے، لیکن اس میں علاوہ بریں کچھ تھے ہے خود میں اور ہیبت سے لوگ اس کے قریب نہ جاتے تھے، لیکن میں پہنچا اور وہ سلطان پر اپنی جان قربان کر سکیں اور ان کی طرف سے نہ ہو جائیں تو وہ اس کے لئے تیار تھے۔[1]

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ سلطان نے اپنے ترکہ میں صرف ایک دینار اور سینتالیس درہم چھوڑے تھے، کوئی ملک، مکان، جائداد، باغ، گاؤں، زراعت نہیں چھوڑی، ان کی تجہیز و تکفین میں ایک پیسہ بھی ان کی میراث سے صرف نہیں ہوا، سارا سامان قرض سے کیا گیا، یہاں تک کہ قبر کے لئے گھاس کے پولے بھی قرض سے آئے، کفن کا انتظام ان کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا۔

درویش سیرت سلطان

قاضی ابن شداد سلطان کی سیرت، اخلاق و عادات اور خصوصیات میں لکھتے ہیں:۔

"سلطان نہایت صحیح العقیدہ، راسخ الاعتقاد مسلمان تھے، اہل سنت والجماعت کے مسلک کا اعتقاد رکھتے تھے، نماز و واجبات کے بڑے پابند تھے، ایک مرتبہ فرمایا کہ سالہا سال ہو گئے میں نے ایک نماز بھی بے جماعت نہیں پڑھی، مرض کی حالت میں بھی امام کو بلا لیتے اور بہ تکلف کھڑے ہو کر نماز پڑھتے، سنن و رواتب پر مداومت تھی، رات کو حتی الامکان نوافل پڑھتے، اگر رات کے نوافل رہ جاتے تو اذان فجر کے متصل کے ماقبل[2] نماز فجر سے پہلے ادا کر لیتے، ان کو آخری بیماری میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا، صرف تین دن جن میں ان پر بیہوشی طاری رہی نماز فوت ہوئی، زکوٰۃ فرض ہونے کی ساری عمر نوبت ہی نہیں آئی، بلکہ انتقال تک بھی اتنا پیسہ اندوختہ نہیں کیا جس پر زکوٰۃ فرض ہو، ان کی ساری دولت صدقہ و خیرات میں خرچ ہوتی، صرف ۴۷ درہم ناصری اور ایک سونے کا ٹکڑا باقی، کوئی جائداد و ملکیت نہیں چھوڑی۔

---

[1] النوادر السلطانیہ ص ۲۲-۲۳

[2] سلطان شافعی المذہب تھے۔

رمضان میں روزے کے سخت پابند تھے کچھ روزے ان کے ذمہ باقی تھے قاضی فاضل کی یادداشت میں تحریر تھے وفات سے پہلے پہلے بڑے اہتمام سے وہ سب روزے قضا کئے معالج نے ہر چند منع کیا لیکن فرمایا کل کا حال مجھے معلوم نہیں چنانچہ ان کی قضا کے بعد ہی خود قضا کر گئے۔

حج کا بڑا ارادہ تھا لیکن اس کا موقع نہیں ملا وفات کے سال اس کا شوق بہت غالب تھا لیکن نوبت نہیں آنے پائی۔

قرآن مجید سننے کا بڑا شوق تھا کبھی کبھی اپنے برج میں پہرہ داروں سے دو دو تین تین پارے سن لیتے بڑے خاشع و خاضع و رقیق القلب تھے قرآن مجید سن کر اکثر آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے حدیث سننے کے بہت مشتاق تھے اور اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے حدیث کی قرأت کے وقت لوگوں کو با ادب بیٹھ جانے کا حکم دیتے، اگر کوئی عالی سند محدث کا شہر ہوتا تو خود اس کی مجلس میں جا کر حدیث سنتے خود بھی حدیث کی قرأت کا شوق تھا اگر کسی حدیث میں کوئی عبرت کی بات ہوتی تو آنکھیں پرنم ہو جاتیں میں میدان جنگ میں بعض مرتبہ دو صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث کی سماعت کی کہ یہ وقت خاص فضیلت کا ہے وہ دین کے شعائر کی بڑی تعظیم کرتے تھے سہروردی ملحد کو انہی کے ایما سے ان کے صاحبزادہ ملک الظاہر نے قتل کروایا ان کو خدا پر بڑا بھروسہ اور اس کی ذات عالی کے ساتھ بڑا حسن ظن تھا کبھی کوئی اور نازک وقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور دعا و مناجات کی عادت تھی ایک مرتبہ بیت المقدس کو صلیبی افواج کی طرف سے جو اس کے قریب پہنچ گئی تھیں سخت خطرہ لاحق تھا سلطان کو بیت المقدس کی بڑی فکر تھی کہ وہ کسی طرح بھی وہاں سے چلے جانے پر آمادہ نہ تھے شب جمعہ تھی جاڑوں کی راتیں تھیں میں تنہا خدمت میں حاضر تھا ہم دونوں رات بھر ذکر و دعا میں مشغول رہے سلطان کے مزاج پر اکثر خشکی اور یبوست غالب آ جایا کرتی تھی رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہوا کہ ان کا مزاج ناساز ہو جائے گا میں نے عرض کیا کہ کچھ دیر آرام فرمالیں، ذرا اونگھ آئی تھی کہ مؤذن نے

سنایا ہے اس لئے مجھے شرم آتی ہے کہ بیان کروں، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مؤذن نے صبح کی اذان دی میں حسب معمول فجر سے پہلے حاضر ہوا کرتا تھا، حاضر ہوا تو دیکھا کہ اپنے ہاتھ پاؤں پر پانی ڈال رہے ہیں، مجھے دیکھ کر فرمایا کہ میں آج رات بالکل نہیں سویا، ہم تو بالکل عاجز ہو گئے، مجھے ایک خیال آیا اور میں نے عرض کیا کہ میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے اور انشاء اللہ وہ مفید ہوگی، وہ یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اسی گڑگڑا کر دعا کریں تو یقیناً اللہ کرم کریں گے، یہ آسان ہے۔ فرمایا کہ اس کی کیا ترکیب ہے؟ میں نے عرض کیا کہ آج جمعہ کا دن ہے، مسجد جانے سے پہلے آپ غسل فرمائیں اور مسجد اقصیٰ میں اس مقام پر نماز پڑھیں جہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں تشریف لے گئے، اور پہلے کسی مستحق آدمی کو بالکل پوشیدہ طور پر کچھ صدقہ کریں، پھر اذان و اقامت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھیں، ایک حدیث میں اس کی فضیلت اور اس وقت دعا کی قبولیت کی خبر دی گئی ہے، اور سجدہ میں سر رکھ کر عرض کریں کہ "خدایا! مادی اسباب اور دنیاوی سہارے سب ٹوٹ چکے، اب تیرے دین کی مدد اور فتح کے لئے صرف یہی سہارا رہ گیا ہے کہ تیرے آستانہ پر سر رکھ دیا جائے اور تیرے سہارے کو مضبوطی سے پکڑ لیا جائے، اب صرف تیرا بھروسہ ہے تو ہی میرے لئے کافی ہے" مجھے امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا قبول فرمائے گا۔ سلطان نے ایسا ہی کیا، میں نے اپنے معمول کے مطابق ان کے پہلو میں نماز پڑھی، میں نے دیکھا کہ وہ سجدہ میں پڑے ہیں، آنسو سے ان کی داڑھی تر ہو گئی ہے اور جائے نماز پر آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں، میں نے نہیں سنا انہوں نے کیا دعا کی؟ اسی دن سے ان کی دعا کی قبولیت کے آثار ظاہر ہونے لگے، صلیبی فوجوں میں انتشار و اضطراب پیدا ہونے لگا، پے در پے اطمینان بخش اطلاعات آنے لگیں، یہاں تک کہ دوشنبہ کی صبح تک میدان بالکل صاف ہو گیا اور عیسائی فوجیں بیت المقدس کا خیال چھوڑ کر رملہ کی جانب چلی گئیں۔[1]

---

[1] النوادر السلطانیہ ص ۲۰۰

محاسن اخلاق

عبادات و فضائل اعمال کے علاوہ وہ مکارم و فضائل عدل، عفو و حلم، جود و سخاوت، مروت و شرافت صبر و استقامت، شجاعت و فتوت اور شہامت و علو ہمت کے اوصاف عالیہ سے آراستہ تھے۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ ہفتہ میں دو بار دوشنبہ و پنجشنبہ کو اذن عام ہوتا تھا، فقہاء، قضاۃ و علماء اور اہل مقدمہ حاضر ہوتے، بڑے چھوٹے، امیر غریب، بوڑھے اور عام عورتوں تک کو آنے کی اجازت تھی، سفر و حضر میں کبھی اس معمول میں فرق نہ آتا، رات دن میں ایک بار خود معاملات کو دیکھتے اور رقعات و فرامین پر خود دستخط کرتے، کبھی کسی صاحب غرض اور حاجت مند کو ناکام واپس نہ کرتے، اس کے ساتھ ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے۔

اگر کوئی فریاد یا شکایت کرتا تو خود کھڑے ہو کر اس کا مقدمہ سنتے، اس کی دادرسی کرتے اور اس کے معاملہ سے پوری دلچسپی لیتے، ایک مرتبہ ایک معمولی شخص نے ان کے بھتیجے تقی الدین کے خلاف (جو سلطان کو بہت عزیز تھے) دعویٰ کیا، سلطان نے فوراً ان کو طلب کیا اور مقدمہ کی سماعت کی، خود ان کے خلاف ایک شخص نے دعویٰ کیا، سلطان نے معاملہ کی پوری تحقیق کی، اگرچہ مدعی کا حق ثابت نہیں ہوا لیکن سلطان نے اس کو ناکام واپس نہیں کیا، اور خلعت و مال سے سرفراز کیا۔

بڑے بردبار اور متحمل مزاج تھے، مورخ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ اپنے رفقاء و خدام کی غلطیوں اور لغزشوں سے چشم پوشی کرتے، بعض مرتبہ کوئی ایسی بات سنتے جس سے ان کو تکلیف یا ناگواری ہوتی لیکن وہ اس کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے اور نہ اپنے طرز عمل سے کوئی فرق آنے دیتے، ایک مرتبہ پانی مانگا، پانی نہیں آیا، پھر مانگا، پھر نہیں ملا، یہاں تک کہ ایک ہی مجلس میں پانچ مرتبہ نوبت آئی، آخر میں کہا کہ دوستو! میں تو پیاس سے مرا جا رہا ہوں، اتنے میں پانی آیا، سلطان نے پی لیا

اور ابن اثیر نے یہ بھی ذکر کیا کہ ایک مرتبہ سخت بیماری سے اٹھے اور غسل صحت کے لئے حمام میں گئے، پانی بہت گرم تھا، ٹھنڈا پانی مانگا، خادم نے پانی حاضر کیا، پانی کچھ چھلک کر ان پر گرا، ضعف کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوئی، پھر ٹھنڈا پانی مانگا، اس مرتبہ ٹھنڈے پانی کا پورا طشت گر گیا اور سارا پانی ان پر آ گیا اور وہ مرتے مرتے بچے، لیکن صرف اتنا کہا کہ مجھے مارنے کا ارادہ ہو تو کہہ دو، خادم نے معذرت کی اور وہ خاموش ہو گئے، اور کوئی بازپرس نہیں کی۔[1] قاضی ابن شداد نے سرداران فوج کی غلطیوں اور اہل دربار کی بے عنوانیوں سے درگذر اور سلطان کے عفو و حلم کے متعدد موثر واقعات لکھے ہیں۔[2]

”جود و سخاوت کا یہ حال تھا کہ بقول ابن شداد بعض اوقات فتح کئے ہوئے شہر دوسروں کو بخش دیتے، آمد فتح کیا، ابن قرا ارسلان نے ان سے فرمائش کی اور انھوں نے بخش دیا، بعض مرتبہ سامان بیچ کر وفود کو عطایا دیتے، ان کے خزانہ کے منتظمین بعض اوقات کسی ناگہانی ضرورت کے لئے کچھ چھپا کر رکھ لیتے کہ سلطان کو اگر خبر ہو گئی تو وہ بچنے نہیں دیں گے، ایک مرتبہ انھوں نے دوسروں پر رکھ کر یہ بات کہی کہ بعض ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو سونے چاندی اور مٹی کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے اپنا ہی حال بیان کیا ہے۔“[3]

”مروت و شرافت کا یہ حال تھا کہ آنے والے اور ملاقات کرنے والے کو خالی ہاتھ جانے نہ دیتے خواہ کافر ہو، صیدا کا والی ملاقات کے لئے آیا، سلطان نے اس کی بڑی قدر کی، اپنے ساتھ کھانا کھلایا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی دعوت بھی دی اور اس کے فضائل و محاسن بیان کر کے اس کو اسلام کی ترغیب دی۔[4] اسی مروت و شرافت کا نتیجہ تھا کہ اپنے سب سے بڑے حریف رچرڈ کو اس کی بیماری میں برف اور پھل بھیجتے رہے۔“[5]

---

[1] ابن اثیر و ابن خلکان، بحوالہ سلطان صلاح الدین [2] ایضاً [3] النوادر السلطانیہ ص ۲۳ [4] ایضاً ص ۲۱

[5] الفتح القسی فی الفتح القدسی عماد الدین کاتب۔

سلطان بڑے خوش اخلاق، رقیق القلب اور بہت نرم دل انسان تھے ظلم برداشت نہ کرسکتے تھے کسی آفت رسیدہ، کمزور لوگوں کی تکلیف کی تاب نہ لاسکتے۔ ابن شداد لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک عیسائی بڑھیا ان کے پاس آئی وہ سینہ پیٹتی تھی اور بلبلا رہی تھی، سلطان نے سبب پوچھا کہا کہ میری بچی ماں کی بچی کو ڈاکو میرے خیمے سے اٹھالے گئے۔ مجھے روتے پوری رات ہوگئی، سلطان کے ایک آدمی نے مجھ سے کہا کہ سلطان خلیق و مہربان ہیں ہم تمہیں ان کے پاس لے جاتے ہیں تم ان سے فریاد کرو، انھوں نے مجھے آپ کی خدمت میں بھیج دیا۔ اب میں اپنی بچی آپ ہی سے لوں گی۔ سلطان کو اس کی حالت پر ترس آیا ان کی آنکھیں پرآب ہوگئیں اسی وقت ایک شخص کو لشکر کے بازار میں بھیجا کہ تحقیق کرے کس نے اس بچی کو خریدا ہے جس نے خریدا ہو اس کو قیمت دے کر اور بچی کو لے کر آئے، تھوڑی دیر میں وہ بچی کو کاندھے پر لئے ہوئے نظر آیا، بڑھیا دیکھتے ہی زمین پر گر گئی، روتی جاتی تھی خاک پر منہ رکھ رکھ کر کچھ کہتی تھی اپنی زبان میں کچھ کہتی رہی پھر ہنسی خوشی اس بچی کو لے کر چلی گئی۔[1]

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ جب سلطان کسی یتیم کو دیکھتے تو بہت شفقت کا برتاؤ کرتے اور اس کی دلجوئی فرماتے، اس کو کچھ عنایت فرماتے اگر کوئی پرورش کرنے والا ہوتا تو اپنی طرف سے اس کا کچھ انتظام فرماتے اسی طرح جب کسی عمر رسیدہ بوڑھے کو دیکھتے تو بڑے متاثر ہوتے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتے۔[2]

مردانہ اوصاف

صبر و استقامت اس درجہ کی تھی کہ قاضی ابن شداد کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ کمر سے گھٹنوں تک اس قدر دانے اور پھوڑے تھے کہ بیٹھنے سے معذور تھے، یہاں تک کہ دسترخوان بچھا اور کھانا تناول نہ کرسکے اس لئے کہ بیٹھنے کی قدرت نہ تھی اس کے باوجود دشمن کے مقابل صف آرا تھے، میں نے دیکھا ہے کہ صبح سے

---

[1] النوادر السلطانیہ ص [illegible] [2] ایضاً ص [illegible]

مغرب تک گھوڑے پر سوار ایک طرف سے دوسری طرف برابر چکر لگاتے اور افواج اور انتظامات کا معائنہ فرماتے اور پھوڑوں کی تکلیف کو تحمل سے برداشت کرتے، میں تعجب کا اظہار کرتا تو فرماتے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد مجھے درد کا احساس نہیں رہتا۔[1]

ایک معرکہ میں حالت بیماری میں برابر دشمن کا تعاقب کیا، ایک رات میں اور طبیب سلطان کے پاس تھے، ہم تیمارداری بھی کرتے تھے اور ان کی طبیعت بھی بہلاتے تھے، سلطان کبھی سوتے کبھی جاگتے یہاں تک کہ صبح ہو گئی، سلطان سوار ہو کر تیار ہو گئے، اپنے لڑکوں کو لشکر کے راستہ میں سب سے آگے کیا اور سب کو خدا کے نذر کر دیا، ایک ایک کرکے سلطان نے سب کو روانہ کر دیا، صرف میں اور طبیب رہ گئے، شام تک سلطان اسی طرح اپنی جگہ پر کھڑے رہے اور جنگ کی نگرانی کی، یہاں تک کہ رات کو لشکر کو سکون اور ہوشیار رات گزارنے کی اجازت ملی اور ہم اور سلطان اپنے خیمہ میں واپس آ گئے۔[2]

شجاعت میں سلطان ضرب المثل تھے، قاضی ابن شداد راوی ہیں کہ سلطان دن میں ایک ایک دو دو بار دشمن کے گرد گشت کرتے تھے، ان کی لڑائی میں سلطان تن تنہا گھوڑے پر صفوں کے درمیان چکر لگاتے، ایک کوتل گھوڑا سائیس کے ساتھ ہوتا، اور وہ میمنہ سے میسرہ تک فوجوں میں گھومتے، صفیں چیرتے نکل جاتے، فوجی دستوں کو بلاتے، ان کو مناسب مقامات پر ٹھہرنے یا بڑھنے کا حکم دیتے، ان کے اطمینان اور بے خوفی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک شب میں نے ان سے کہا، سلطان نے تمام مواقع پر حدیث سنی ہے لیکن کبھی عین معرکہ اور دو صفوں کے درمیان حدیث سننے کی نوبت نہیں آئی، اگر یہ شرف بھی حاصل ہو جائے تو بہت اچھا ہے، چنانچہ سلطان نے صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث شریف کی سماعت کی۔[3] انھوں نے کبھی دشمن کی تعداد کی پروا نہیں کی اور نہ کبھی اس کا اثر قبول کیا، بعض بعض مرتبہ پانچ پانچ چھ چھ لاکھ کا لشکر ان کے مقابلہ میں تھا، اللہ نے ان کو فتح دی اور کثیر خلقت قتل اور گرفتار ہوئی۔[4] ایک مرتبہ دشمن کے [illegible]

---

[1] النوادر السلطانیہ ص۱ [2] ایضاً ص۱۰ [3] ایضاً ص۱۵ [4] ایضاً

جہاز عکہ میں آئے، یہیں صبح سے مغرب تک لڑائی رہی، لیکن سلطان کے بیمار و شکستہ ذہنی عکہ کے سبب بہ ظاہر میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، رکاب بستر تک نے اپنی جگہ چھوڑ دی، نشان و پرچم اور طائفے زمین پر گر گئے لیکن سلطان چند ساتھیوں کے ساتھ اپنی جگہ پر جمے رہے یہاں تک کہ پہاڑ کو پشت پر رکھ کر کھڑے ہو گئے، مسلمانوں کو للکارا اور شرم دلائی، طور وہ میدان میں واپس آئے اور دوبارہ حملہ کیا جس میں دشمن کے سات ہزار آدمی قتل ہوئے اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔[1] سلطان کی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ سلطان نے ایک روز فرمایا کہ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں، میرا ارادہ ہے کہ ساحل کو صلیبیوں سے پاک کرنے کے بعد ملک کو تقسیم کر دوں، وصیت کر کے اور ہدایات دے کر خود یہاں سے رخصت ہو کر چلا جاؤں اور سمندر میں سفر کر کے یورپ کے جزائر تک پہنچوں اور ان مغربیوں (یورپین قوموں) کا وہاں تک تعاقب کروں کہ روئے زمین پر کوئی کافر نہ رہ جائے یا میں اسی ارادہ میں کام آ جاؤں۔[2]

علم و فضیلت

سلطان ایک لائق و فاضل شخص تھے، عرب کے انساب و قبائل یہاں تک کہ ان کے گھوڑوں کے سلسلۂ نسب پر ان کو عبور تھا، عربوں کے واقعات و حالات ان کو مستحضر تھے، دنیا کے عجائبات و نوادر کا ان کو علم تھا، ہر طرح کے علوم سے شغف رکھتے تھے، ان کے ہم نشینوں کو ان سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔[3] بعض مورخین کا بیان ہے کہ ان کو حماسہ حفظ تھا۔[4] لین پول ان کی ابتدائی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> "ان کا اصلی ذوق یا طبیعت دینیات کی طرف تھا، علماء وقت سے مباحثے کرتے، ان کے ہمراہ اور راویوں کے سلسلوں کی تحقیق، مسائل فقہ پر بحث، آیات قرآنیہ کی تفسیر میں اسے بڑا انہماک رہتا تھا اور سب سے بڑھ کر اس بات کا ذوق تھا کہ مذہب اہل سنت و الجماعت کی تائید اور ثبوت قوی دلائل سے کیا جائے۔"[5]

---

[1] النوادر السلطانیہ صفحہ ۔ [2] ایضاً صفحہ ۔ [3] ایضاً صفحہ ۔ [4] ایضاً ۔ [5] سلطان صلاح الدین۔

فاطمی حکومت کا زوال اور صلاح الدین کا دوسرا کارنامہ

سلطان صلاح الدین کا مصر پر اقتدار عبیدی سلطنت[1] (جو عام طور پر فاطمی مشہور ہے) کا خاتمہ تھا جو ۳۵۸ھ سے ۵۶۷ھ تک پونے دو سو برس تک بڑی شان و شوکت سے قائم تھی اور اس نے اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصے کے عقائد، اعمال و اخلاق اور تمدن پر گہرا اثر ڈالا تھا، یہ وہ حکومت تھی جو اعتقادی عجائبات، عجیب و غریب احکام اور مضحکہ خیز قوانین سے پر تھی، جس کے بعض نمونے مشہور مورخ مقریزی کی کتاب الخطط والآثار سے پیش کئے جاتے ہیں:-

۳۶۶ھ میں قانون میراث میں ترمیم کی گئی اور قانون بنا لیا گیا کہ اگر متوفی نے بیٹی چھوڑی ہو تو بھتیجے، چچا اور عصبہ کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملے گا، اس قانون کی خلاف ورزی کو حضرت فاطمہؓ کے ساتھ عداوت کا مرادف سمجھا جاتا ہے [illegible] سلطنت مصر میں برقرار رہی [illegible] رہے گے۔

۳۷۲ھ میں پورے ملک مصر میں تراویح کی نماز کی ممانعت کر دی گئی۔ موطا امام مالک کے ایک نسخہ کے پائے جانے پر ایک شخص کی تشہیر کی گئی۔

۳۹۳ھ میں ایک مصری کو اس جرم میں زدوکوب کیا گیا اور ان کی تشہیر کی گئی کہ انھوں نے صلوٰۃ الضحیٰ (نماز چاشت) پڑھی تھی۔ ۳۹۵ھ میں ملوخیا (ایک ترکاری) کو جو اہل مصر کو بہت مرغوب تھی، اس لئے ممنوع قرار دیا گیا کہ معاویہؓ کو بہت پسند تھی، جرجیر کی اس لئے ممانعت ہوئی کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو مرغوب تھی، اسی سنہ میں تمام مساجد، دیواروں، مقابر اور صحراؤں میں سلف کو سب و شتم اور لعنت لکھی گئی، اور اس کو منقش کیا گیا، ۳۹۸ھ میں [illegible]

---

[1] محققین انساب کی اکثریت کا اس پر اتفاق ہے کہ بنی عبید کو خاندان نبوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا، ان کا مورث اعلیٰ عبید اللہ یہودی تھا، قاضی ابوبکر بن الطیب نے اپنی کتاب "کشف اسرار الباطنیہ" اور قاضی عبدالجبار نے کتاب "تثبیت النبوۃ" اور دوسرے علماء نے اپنی کتاب [illegible] میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

اس عیش و عشرت اور لہو و لعب کی گرم بازاری ہوئی۔ اسی زمانہ میں کثرت سے گویوں اور رقاصوں کا زور تھا لوگ کمال بے تابی سے کنگال ہو جاتے تھے اور جا بجا بھوک بھوک کے نعرے لگاتے تھے اور بدکاری کی کثرت ہو گئی ۔ مستنصر میں ایسا قحط پڑا جس کا اثر سات سال تک تھا سوائے [illegible] تمام بازار بند تھے اور لوگ زیر بار ہو رہے تھے ۔

ان خلفاء میں متعدد اشخاص ایسے تھے جو بہت کم سنی میں تخت نشین کئے گئے اور مسلمانوں پر ان کی اطاعت فرض قرار دی گئی۔ مستنصر باللہ جب خلیفہ ہوا تو سات برس کی عمر تھی۔ آمر باحکام اللہ کی عمر خلافت کے وقت پانچ سال ایک مہینہ کچھ دن تھی۔ فائز بنصر اللہ خلافت کے وقت صرف پانچ سال کا تھا، عاضد لدین اللہ کی عمر جب وہ خلیفہ ہوا گیارہ سال تھی۔[1]

سلطان صلاح الدین کی حکومت سے اس دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہوا مصر سے شیعیت و رفض کے آثار مٹنے لگے سنت کا فروغ ہوا جا بجا مدارس قائم ہوئے جن میں علمائے سنت علوم دینیہ کی تعلیم دیتے رفتہ رفتہ عبیدی حکومت کے اثرات بالکل زائل ہو گئے اس کے بعد اسماعیلیت جو تقریباً تین صدیوں تک مصر کا سرکاری مذہب رہا تھا مصر میں غریب الوطن ہو گیا مورخ مصر مقریزی لکھتا ہے:۔

وانتفی مذهب الشیعة والاسماعیلیة	شیعہ اسماعیلیہ اور امامیہ کا مذہب ختم ہو گیا
ولا سیما حتی فقد من ارض مصر کلها	یہاں تک کہ پورے ملک مصر میں اس کا کہیں وجود نہیں تھا

عبیدی حکومت کا یہ دو سو سالہ عہد اسلام کے لئے ایک دور ابتلا تھا جس میں مسلسل شریعت و سنت اور عقائد و اخلاق کے ساتھ تمسخر و تلاعب جاری رہا اہل سنت اور اہل علم مقہور و مغلوب رہے اسفل طبیعت اوباش مزاج اور بددین غالب و حاوی رہے علامہ مقدسی اپنی کتاب کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین میں اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

[illegible]	عبیدیوں کی حکومت آغاز سے خاتمہ تک [illegible]

---

[1] کتاب [illegible] للمقریزی ص ۳۵۵-۳۵۰

ودولتهم إلى أن [illegible] الله [illegible]
سنة تسع وتسعين ومائتين إلى سنة سبع
وستين وخمسمائة، [illegible] أيامهم كثرت البدع
واستحكم أمرهم وعمت الظلم [illegible] الأرض
والتحق بهم [illegible] عنا الله
طوائف من أهل الضلال الباطنية [illegible]
كالنصيرية والدرزية والحشيشية ونحوهم
وتمكن دعاتهم [illegible] بلادهم
[illegible] عقيدهم واختلف
الفرنج أكثر البلاد بالشام والجزيرة إلى
أن من الله على المسلمين بظهور البيت
الأتابكي وتقدمه مثل صلاح الدين
فاستردوا البلاد وزالت هذه الدولة
[illegible] العباد[1]

عالم اسلام پر حاوی رہا، اس کی ابتدا ۲۹۹ھ سے
ہوئی ہے اور اس کا خاتمہ ۵۶۷ھ میں ہوا، ان کے دور
حکومت میں بدعات کی کثرت ہوئی، ان کا غلبہ ہو گیا
[illegible] ہو گئے اور [illegible] ان کی
[illegible] نصیریوں
دروزیوں [illegible] حشیشی
[illegible] اہل
اسماعیلیوں کے ملحدین کا [illegible] فرنگیوں
[illegible] ہو گیا
[illegible] کے دور حکومت [illegible]
زنگی خاندان [illegible] مسلمانوں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] دیا
کی اور اس حکومت سے بندگان خدا کو نجات دی

اس انقلاب سلطنت پر جو ایک بڑے دینی و اخلاقی انقلاب کا پیش خیمہ تھا، صحیح العقیدہ مسلمان اور اہل سنت کی مسرت بالکل قدرتی بات تھی، علامہ مقدسی نے جن کی ولادت سے صرف ۳۲ سال پہلے انقلاب ہوا تھا، دوران تغیرات و اثرات کا انھوں نے خود مشاہدہ کیا تھا، جو اس کے نتیجہ میں پیش آئے تھے

---

[1] كتاب الروضتين [illegible] ج ۱ ص [illegible]

اپنی مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:-

انقرضت دولة الملحدين [illegible]   یہ حکومت ختم ہوئی جو دین کے ساتھ نبرد آزما تھی
والاسلام بعد غربته [illegible] لله۔   اسلام کی ذلت کا دور بھی اختتام کو پہنچا۔

حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب الصواعق المرسلة[1] میں باطنیوں کے عروج اور اس کے اثرات پھر نور الدین اور صلاح الدین کے ہاتھوں اس سلطنت کے زوال کا تذکرہ ان پُرجوش الفاظ میں کیا ہے:-

ان باطنیوں کی دعوت مشرق میں تو مضمحل ہو گئی اور مغرب میں رفتہ رفتہ اس کا ظہور شروع ہوا یہاں تک کہ وہ بڑی طاقتور دولت بن گئی اور اس کے نیچے تم ہو گئے، اور اس کے علاوہ مغرب اقصیٰ کے اکثر شہروں پر قابض ہو گئے پھر مصر کی طرف آگے بڑھایا اور مصر تک پہنچ گئے، انہوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور قاہرہ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے اس پر نظام مستحکم کیا اور یہاں سے اپنی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔ انہی کے زمانہ میں رسائل اخوان الصفا تصنیف ہوئے اور ابن سینا نے اشارات اور شفا اور دوسری تصنیفات لکھیں۔ خود ابن سینا کا بیان ہے کہ میرا والد حاکم بامر اللہ کا داعی تھا، وہ داعی ان کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ان باطنیوں کے دور میں سنت اور کتب سنت بالکل معدوم ہو گئیں، کہیں کوئی چھپ چھپا کر ان کو رکھتا تھا اور جس کا یہ عقیدہ تھا کہ اس اصول پر تھا کہ عقل کو انبیاء علیہم السلام کی وحی و تعلیمات پر ترجیح حاصل ہے۔

رفتہ رفتہ سارے ملک مغرب، مصر و شام و حجاز پر ان باطنیوں کا تسلط ہو گیا، عراق پر بھی سال بھر ان کا قبضہ رہا۔ اہل سنت ان کے دور حکومت اور ان کی مملکت میں ایسے تھے جیسے مسلمان حکومت کی عملداری میں ذمیوں کی طرح رہتے تھے بلکہ اس سے بھی بدتر، یہودیوں اور عیسائیوں کو وہ امن و امان اور عزت و اعتبار حاصل تھا جو اہل سنت کو نصیب نہ تھا۔ کتنے علماء اس دور میں [illegible] کر دیے گئے، کتنوں نے ان کے قید خانوں میں پڑے پڑے وفات پائی۔

---

[1] ایضاً ص [illegible]

آخر جب شب ابن کو دن آیا اور نور نے یہ دور سلطان صلاح الدین کے زیر فرمان آئے، مصر ان کی اس ابتری بتدریج ختم ہو گیا، ان ملکوں میں اسلام کو دم واپسیں طاری ہوتا تھا لیکن اس انقلاب سے عظمت اسلام کو نئی زندگی عطا ہوئی اور اس کا آفتاب اقبال پھر سے چمکا، روئے زمین کے مسلمانوں کو اس سے مسرت ہوئی جب کہ ہر طرف یہ چرچا ہو رہا تھا کہ اس دور ابتلاء میں اسلام کا کوئی حامی و مددگار نہیں رہا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل اور لشکر مجاہدین کے ذریعہ بیت المقدس کو پھر اہل صلیب سے آزاد کرایا اور اللہ اور اس کے رسول کے انصار نے اپنی اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق دین حق کی نصرت کا حق ادا کیا[1]۔

اس عصر کی تاریخی کتابوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عالم اسلام نے بالعموم اور شام و عراق نے بالخصوص اس اطلاع کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور عام و خاص مسلمانوں نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا[2]۔

اس طرح صلاح الدین نے ایک طرف مجاہدین صلیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک کر عالم اسلام کو سیاسی غلامی اور اخلاقی و تہذیبی بدنظمی اور مغربی ترکتازوں کی ہوس کا شکار بننے سے صدیوں تک کے لئے محفوظ کر دیا، دوسری طرف عبیدی (مشہور بہ فاطمی) حکومت کا خاتمہ کر کے اس نے ایک چشمۂ فساد کو بند کر دیا جو مصر سے نکل کر عالم اسلام میں باطنیت و اسماعیلیت کے اثرات کو پھیلا رہا تھا اور جو دو تین صدیوں سے امت میں ذہنی انتشار اور اعتقادی و اخلاقی فساد کا ذمہ دار تھا۔ تاریخ اسلام صلاح الدین کے ان دونوں کارناموں کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی اور کسی ملک کا مسلمان اس کرد مجاہد کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

جزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء

---

[1] الصواعق المرسلہ علی الجہمیہ والمعطلہ ج ۱ ص ۲۳۳۔۲۳۴ [2] کتاب الروضتین ج ۲ ص ۱۰۹۔۱۱۰

شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام

سلطان صلاح الدین کی بے پناہ کوششوں اور ان کی علمی و دینی سرپرستی میں جا بجا دینی مدارس کے قیام نیز شیعی اثرات کے اضمحلال اور سنی العقیدہ سلاطین کے اثر سے علمی و فکری زندگی میں تازگی پیدا ہوئی اور علوم شرعیہ کے تعلیم و تعلم اور ان میں کمال پیدا کرنے کی طرف عالم اسلام میں از سر نو توجہ ہوئی، جس کا نتیجہ تھا کہ ساتویں صدی ہجری میں متعدد با وقار دینی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دعوت و اصلاح کا فریضہ انجام دیا، اور حکومت اور زمانہ کے ناہمواریات کا مقابلہ کیا، ان میں سب سے زیادہ با عظمت شخصیت شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام م ۶۶۰ھ کی ہے جو اپنے علم و تقویٰ اور حق گوئی میں نادرۂ روزگار اور قرون اولیٰ کی یادگار تھے۔

علمی عظمت

عزالدین بن عبدالسلام دمشق میں ۵۷۷ھ میں پیدا ہوئے، اساتذۂ دمشق اور مشاہیر علماء سے تعلیم حاصل کی، جن میں فخر الدین بن عساکر، سیف الدین آمدی، حافظ ابو محمد قاسم بن عساکر جیسے اجلۂ علماء اساتذۂ وقت تھے، بعض روایتوں کے مطابق انھوں نے بڑی عمر میں پڑھنا شروع کیا، لیکن جلد ہی علم میں تبحر حاصل کر لیا، اور اپنے ہم عصروں میں اپنی علمی جلالت شان اور عظمت کا اعتراف کرا لیا، علامہ ابن دقیق العید نے

اپنی بعض تصانیف میں ان کو سلطان العلماء کے لقب سے یاد کیا ہے، وہ جب ۶۳۹ھ میں مصر تشریف لے گئے تو حافظ عبد العظیم المنذری صاحب کتاب "الترغیب والترہیب" نے فتویٰ دینے سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ جس شہر میں عز الدین بن عبد السلام ہوں وہاں دوسرے کے لئے فتویٰ دینا درست نہیں، شیخ جمال الدین ابن الحاجب کا قول ہے کہ فقہ میں شیخ عز الدین کا پایہ امام غزالی سے بلند ہے۔[1]

ذہبی اپنی کتاب "العبر" میں لکھتے ہیں:-

انتهت إليه معرفة المذهب مع الزهد   فقہ کا علم زہد و ورع کے ساتھ ان پر ختم تھا

والورع وبلغ رتبة الاجتهاد۔   اور درجہ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے۔

شیخ عز الدین بن عبد السلام نے عرصہ تک دمشق میں زاویہ غزالیہؒ میں درس دیا، جامع اموی کی خطابت و امامت کے منصب پر عرصہ تک فائز رہے، شیخ شہاب الدین ابو شامہ کا بیان ہے کہ ان کی وجہ سے بدعات کا ازالہ ہوا، جو ان کے زمانہ میں رواج پذیر ہو گئی تھیں، صلوٰۃ الرغائب اور نصف شعبان[2] کی کھل کر ان کی مخالفت کی اور ان کو بدعت ثابت کیا، بعض اکابر علماء ان کے بارہ میں ساکت اور متردد تھے، الملک الکامل نے دمشق کے عہدہ قضا کے لئے بڑا اصرار کیا، شیخ نے بڑی شرطوں کے ساتھ اس کو منظور کیا، اسی عرصہ میں ایک بار وہ الملک الکامل کی طرف سے دربار خلافت (بغداد) میں سفیر بن کر گئے۔

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۸۱، حسن المحاضرہ سیوطی ص ۱۴۰ [2] صلوٰۃ الرغائب ایک نماز تھی جو ماہ رجب کے پہلے جمعہ کی شب میں اور خاص ترتیب کے ساتھ شب کو پڑھی جاتی تھی اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی جاتی تھی، یہ نماز ۴۸۰ھ میں ایجاد ہوئی اور مسلم بدعات کی طرح تیزی سے پھیل گئی، شیخ عز الدین بن عبد السلام نے اس کے ظہور کی پوری تاریخ لکھی ہے، [illegible] شروع میں ہوئی، نصف شعبان کی شب ہزار رکعتیں خاص ترکیب کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں، علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ دونوں بدعت ہیں، ابن الصلاح نے اس کو بدعت غیر منکرہ لکھا ہے، امام نووی نے اس کے لئے موضوع و منکر اور قبیح کے الفاظ استعمال کئے ہیں (ثقافت اسلامیہ ج ۳ ص ۴۲۴)

سلاطین کو صلاح نیک اور اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی

شیخ عز الدین کی شخصیت تمام علماء میں سب سے بڑی دینی شخصیت تھی جس کا سلاطین وقت بڑا احترام کرتے تھے، وہ بڑے باوقار، بارعب اور خوددار تھے، انھوں نے کبھی کسی بادشاہ کے یہاں حاضری دینا یا دربار داری کرنا گوارا نہیں کیا، جب کبھی بادشاہ وقت نے خود تشریف آوری کی درخواست کی تو تشریف لے گئے اور اس کو صحیح مشورہ دیا اور اس کی اور اسلام و مسلمانوں کی خیر خواہی میں کمی نہیں کی۔

سلطان الملک الاشرف نے مرض الموت میں اپنے سب سے بڑے عہدہ دار کو شیخ کی خدمت میں بھیجا اور کہلایا کہ آپ کا محب موسیٰ بن الملک العادل ابوبکر سلام عرض کرتا ہے اور عیادت اور دعا کی درخواست کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ آپ اس کو کوئی ایسی نصیحت فرمائیں جو کل خدا کے سامنے اس کے کچھ کام آئے، شیخ نے سن کر کہا کہ یہ عیادت افضل عبادات ہے اس لئے کہ اس کا نفع متعدی ہے، چنانچہ تشریف لے گئے، سلطان ان کی تشریف آوری سے بیحد مسرور ہوا، ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، اس سے پہلے سلطان کو کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی اور سلطان عرصہ تک ان سے ناراض رہا تھا[1]، سلطان نے ان سے معافی چاہی اور کہا کہ آپ

---

[1] ساتویں صدی میں اشعریت و حنبلیت کے اختلاف نے باوجود علمی بحث کے تقریباً وہ شکل اختیار کر لی تھی جو تیسری صدی میں اعتزال و سنیت کے اختلافات کی تھی، اسماء و صفات کی تشریح میں اشاعرہ تاویل کرتے تھے اور حنابلہ اس کو بلا تاویل حقیقت اور ظاہر پر رکھتے تھے، ہر گروہ دوسرے کی تغلیط کرنا اس کو دینی خدمت اور سنت و شریعت کے ساتھ خیر خواہی سمجھتا تھا، بعد کی صدیوں میں اس کو غیر معمولی اہمیت اور طول دے دیا گیا اور اس کا پایہ زمین پر آگیا، حکومت کے تعصب نے اس کو بھی کفر و ایمان کا معیار قرار دے دیا، شیخ عز الدین کے زمانہ میں یہ مباحث بڑی شدت اختیار کر چکے تھے، وہ خود شافعی اشعری تھے، الملک الاشرف کا رجحان حنبلیت کی طرف تھا، ابتداء میں اس کو شیخ سے بدگمانی ہو گئی تھی، لیکن شیخ کی ملاقات اور تفصیلی گفتگو کے بعد یہ بدگمانی دور ہو گئی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات الشافعیہ ج ۵ صفحہ ۸۱)

مجھے معاف فرمائیں میرے لئے دعا بھی فرمائیں اور مجھے کچھ نصیحت بھی فرمائیں۔ شیخ نے فرمایا کہ جہاں تک معاف کرنے اور بازپرس کرنے کا تعلق ہے، میں روزانہ سونے سے پہلے اللہ کے بندوں کو اپنی طرف سے معاف کر دیتا ہوں، اور اس وقت سوتا ہوں جب کہ کسی کے ذمہ میرا کوئی حق یا مطالبہ یا شکایت باقی نہیں رہتی، اور میرا اجر مخلوق کے بجائے اللہ کے ذمہ ہوتا ہے۔ فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ۔

باقی رہی دعا تو میں سلطان کے لئے اکثر دعا کیا کرتا ہوں، اس لئے کہ اس کی صلاح میں اسلام اور مسلمانوں کی خیر و فلاح ہے، اللہ تعالیٰ سلطان کو ان امور کی بصیرت عطا فرمائے جن سے وہ خدا کے سامنے سرخرو ہو رہی نصیحت تو اب وہ سلطان کی آمادگی اور تقاضے کی وجہ سے فرض و واجب ہو گئی ہے، مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کی فتوحات اور دشمنوں پر غلبہ کی دھوم ہے، اس وقت حالت یہ ہو رہی ہے کہ تاتاری اسلامی ممالک میں گھستے چلے جا رہے ہیں ان کو اس بات سے شہ ملی ہے کہ آپ کو اس وقت اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے حریفوں سے جنگ کرنے کی فرصت نہیں، اس وقت آپ کا رخ الملک الکامل سے جنگ کرنے کی طرف ہے اور آپ ان کے مقابلہ کے لئے پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں، الملک الکامل آپ کے بڑے بھائی اور قریبی رشتہ دار ہیں، میں صرف یہ عرض کروں گا کہ آپ اپنا رخ اپنے بھائی کی طرف سے ہٹا کر دشمنان اسلام کی طرف پھیریں اور اس اخیر وقت میں اپنا رشتہ نہ توڑیں، آپ اللہ کے دین کی مدد اور اس کی سربلندی کی نیت کریں، اگر اللہ تعالیٰ نے سلطان کو صحت عطا فرمایا ہے تو ہم اللہ سے کفار پر آپ کے غلبہ کی امید رکھتے ہیں اور آپ کے نامۂ اعمال میں یہ سعادت لکھی جاتی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کا کچھ اور فیصلہ ہے تو سلطان اپنی نیت کی برکت کے ساتھ دنیا سے جاتے ہیں۔

سلطان نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو اس بروقت تنبیہ اور مخلصانہ مشورہ پر جزائے خیر عطا فرمائے، اسی وقت حکم دیا کہ فوج کا رخ بجائے مصر کے (جو الملک الکامل کی جانب تھا) تاتاریوں کی طرف کر دیا جائے اور فوج اس مقام سے کوچ کر کے مقام قصیرہ میں پڑاؤ ڈالے، چنانچہ دن کے دن اس کی تعمیل ہوئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کا ارادہ اب تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کا ہے۔

الملک الاشرف نے مزید نصیحت کی فرمائش کی، شیخ نے فرمایا کہ بادشاہ تو اس حال میں ہے اور نائبین سلطنت اور اہل کار و اہل حکومت رنگ رلیاں کر رہے ہیں، شراب کے دور چل رہے ہیں، گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہے، نئے نئے محاصل اور ٹیکس مسلمانوں پر لگائے جا رہے ہیں، آپ کے لئے خدا کے حضور میں سب سے افضل عمل پیش کرنے کا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سب گندگیوں کو دور کریں، یہ نئے نئے ٹیکس بند کریں اور تمام ظالمانہ کارروائیاں روک دیں اور اہل مظالم کی دادرسی کریں۔ الملک الاشرف نے اسی وقت ان سب چیزوں کی ممانعت کے احکام جاری کئے، اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس دینی خدمت اور خیر خواہی پر تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے اور اپنے لطف و کرم سے مجھے جنت میں آپ کی معیت نصیب فرمائے، اسی کے ساتھ ایک ہزار دینار مصری نذر کئے، شیخ نے قبول کرنے سے معذرت کی اور فرمایا کہ میری یہ ملاقات خالصۃً لوجہ اللہ تھی، میں اس میں دنیا کی کوئی آمیزش نہیں کرنا چاہتا۔

بادشاہ شام کے مقابلہ میں جرأت و استقامت

الملک الاشرف کے جانشین صالح اسمٰعیل (ابو الجیش) نے الملک الصالح نجم الدین ایوب بادشاہ کے مقابلہ میں (جس کے شام پر حملہ کا خطرہ تھا) فرنگیوں سے مدد چاہی اور حق الخدمت کے طور پر شہر صیدا الشقیف اور چند قلعوں کا پروانہ لکھ دیا، اس دوستانہ تعلق کی بنا پر فرنگی اتنے بے تکلف ہوگئے کہ دمشق میں آکر ہتھیار خریدنے لگے، شیخ کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا کہ فرنگی مسلمانوں کے شہر میں آکر ان سے ہتھیار خرید کر مسلمانوں کی گردنوں پر چلائیں، تاجران اسلحہ نے شیخ سے فتویٰ پوچھا، شیخ نے صاف کہا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے اس لئے کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ یہ تمہارے مسلمان بھائیوں کے خلاف کام آئیں گے، شیخ کی طبیعت پر بادشاہ کی اس بے حمیتی اور اسلام کی اس ذلت و بے بسی کا بڑا اثر تھا، انہوں نے بادشاہ کے لئے خطبہ میں دعا ترک کردی، اس کے بجائے وہ منبر پر دونوں خطبوں سے فارغ ہو کر بڑے جوش کے ساتھ دعا کرتے تھے کہ الٰہی!

اسلام اور حامیانِ اسلام کی مدد اور نصرت فرما، اور ملحدین و دشمنانِ دین کو ذلت و نکبت نصیب فرما، اور تمام مسلمان بڑی رقت و اثر کے ساتھ آمین کہتے تھے۔ حکومتی آدمیوں نے بڑھا چڑھا کر سلطان کو اس واقعہ کی اطلاع دی، شیخ کی گرفتاری کا فرمان صادر ہوا، شیخ ایک عرصہ تک محبوس رہے، کچھ عرصہ کے بعد وہ دمشق سے بیت المقدس منتقل کیے گئے۔

اسی اثناء میں سلطان صالح اسمٰعیل، الملک المنصور والی حمص اور سلاطین فرنگ اپنی افواج و عساکر کے ساتھ مصر کے ارادے سے بیت المقدس آئے، صالح اسمٰعیل کے دل میں شیخ عزالدین کی ناراضگی برابر کھٹکتی رہتی تھی اور اس کو اس کی فکر تھی، اس نے اپنے معتمد خواص میں سے ایک شخص کو اپنا رومال دیا اور کہا کہ یہ نشانی شیخ کی خدمت میں پیش کرنا اور انتہائی خوشامد و استمالت کے ساتھ ان سے کہنا کہ سابقہ خدمات و مناصب پر آپ پورے اعزاز کے ساتھ واپس آ سکتے ہیں اگر وہ منظور فرمالیں تو میرے پاس لے آنا، اگر منظور نہ کریں تو میرے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں ان کو محبوس کر دینا۔ امیر نے شیخ سے بڑی خوشامدانہ باتیں کیں اور ان کی تعظیم و تکریم اور ان کی بحالی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور آخر میں کہا کہ آپ ذرا سے بادشاہ سے نیاز مندانہ ملیں اور اس کی دست بوسی کر لیں، تو یہ قصہ رفع دفع ہو جائے گا اور آپ مناصب و ترقی کے ساتھ اپنے سابقہ عہدوں پر واپس آ جائیں گے۔ شیخ نے اس کا جو جواب دیا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، انھوں نے فرمایا:

والله یا مسکین ما ارضاه ان یقبل یدی	اے نادان! میں تو اس کا بھی روادار نہیں کہ بادشاہ
فضلا ان اقبل یده یا قوم	میرے ہاتھ کو بوسہ دے چہ جائیکہ میں اس کا ہاتھ چوموں
انتم فی واد وانا فی واد والحمد لله الذی	لوگو! تم کسی اور عالم میں ہو میں کسی دوسرے عالم میں
عافانی مما ابتلاکم به	خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس آزمائش سے بچایا جس میں تم گرفتار ہو۔

یہ جواب سن کر امیر نے کہا کہ مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو گرفتار کر لوں، شیخ نے کہا خوشی سے جو کچھ تم سے ہو سکے اس میں دریغ نہ کرو، امیر نے ان کو بادشاہ کے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں رکھا، شیخ اپنے خیمہ میں قرآن مجید

پڑھتے رہتے تھے اور بادشاہ اپنے خیمہ کے اندر رہتا تھا، ایک روز بادشاہ نے فرنگی بادشاہوں سے کہا کہ اگر شیخ کو قرآن مجید پڑھتا ہوا سنتے ہو؟ انھوں نے کہا ہاں، کہا یہ شخص جو مسلمانوں کا سب سے بڑا پادری ہے (عز الدین بن عبد السلام) ہیں، اسی کو اس لیے قید کیا ہے کہ وہ تم کو مسلمانوں کے قلعے سپرد کر دینے کے خلاف تھا اور اس پر معترض تھا، میں نے اس کو دمشق کی خطابت اور دوسرے منصبوں سے معزول کیا اور اس کو دمشق سے شہر بدر کر دیا، اب میں نے تمہاری خاطر پھر اس کو قید کر دیا ہے، عیسائی بادشاہوں نے کہا کہ اگر یہ ہمارا پادری ہوتا تو ہم اس کے پاؤں دھو کر پیتے۔[1]

اسی زمانہ میں مصری افواج آگئیں، صالح اسمٰعیل کو شکست ہوئی، فرنگی افواج قتل و غارت ہوئیں اور شیخ صحیح و سلامت مصر روانہ ہو گئے۔

راستہ میں جب کرک کی ریاست سے گزر رہا ہوا تو والیِ کرک نے قیام کی درخواست کی، فرمایا کہ:

"تمہارا یہ مختصر شہر میرے علم کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

شیخ عزالدین مصر میں

مصر میں سلطان صالح ملک نجم الدین ایوب نے شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جامع عمرو ابن العاص کا خطیب مقرر کیا اور ان کو مصر کا عہدہ قضا اور ویران مسجدوں کی آبادی کا کام سپرد کیا، سلطان نے جب مدرسہ صالحیہ کی تعمیر کی تو مذہب شافعی کی تعلیم شیخ عزالدین کے سپرد کی، اور انھوں نے پورے انہماک کے ساتھ تعلیم و اشاعت علم کا فرض انجام دیا، اور لوگوں کو بہت نفع ہوا۔

شیخ کی حق گوئی و بیباکی

اسی دوران میں ایک مرتبہ فخر الدین عثمان نے جو قصر شاہی کا استادار اور جملہ سلطنت مصر کا منتظم اعلیٰ تھا

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۸۱-۸۲ [illegible] ترجمہ شیخ عزالدین ابن عبد السلام

مصر کی ایک مسجد کی چھت پر طبل خانہ کی عمارت بنوائی اور وہاں طبل و نقارہ بجنے لگا، شیخ عز الدین کو جب اس واقعہ کی تحقیق ہوئی تو انہوں نے بحیثیت قاضی اور منتظم مساجد کے، اس عمارت کے انہدام کا حکم دے دیا اور اسی جرم میں فخر الدین کو ساقط الشہادۃ قرار دیا، اور ساتھ ہی ساتھ عہدۂ قضا سے استعفا دے دیا، اس کارروائی سے سلطان کی نگاہ میں شیخ کی منزلت کم نہیں ہوئی، مگر اس نے عہدۂ قضا پر شیخ کا دوبارہ تقرر نہیں کیا، ادھر شیخ کے فیصلوں کا اتنا احترام اور ان کا دینی نفوذ و اثر اس قدر تھا کہ اسی زمانہ میں الملک الصالح سلطان مصر نے خلیفۂ بغداد کی خدمت میں ایک سفارت بھیجی، جب سفیر کی باریابی ہوئی اور اس نے سلطان مصر کا پیام پہنچایا تو اس سے دریافت کیا گیا کہ یہ پیام تم نے خود سلطان مصر کی زبان سے سنا ہے یا کسی کے واسطہ سے؟ اس نے کہا کہ مجھے یہ پیام بمقام قصر شاہی فخر الدین کی زبان سے ملا ہے، خلیفہ نے کہا کہ فخر الدین کی شہادت معتبر نہیں، اس کو شیخ عز الدین نے ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے، اس لیے ہم اس کی روایت قبول نہیں کر سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سفارت پھر مصر واپس آئی اور براہ راست سلطان سے پیغام سن کر بغداد واپس ہو کر خلیفہ کو پیغام پہنچایا۔

ان کی جرأت کا اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ عید کے دن قلعہ میں دربار شاہی تھا، بادشاہ اپنے تزک و احتشام کے ساتھ سریر آرا تھا، دو رویہ فوج شاہی دست بستہ کھڑی تھی، امراء حاضر ہو کر آداب تسلیمات بجا لاتے تھے اور زمین بوس ہوتے تھے، اس مجمع میں دفعتاً شیخ نے بادشاہ کو نام لے کر خطاب کیا اور کہا کہ ایوب! خدا کو تم کیا جواب دو گے جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم کو مصر کی سلطنت اس لیے دی تھی کہ شراب آزادی سے پی جائے؟ بادشاہ نے کہا کیا یہ واقعہ ہے؟ شیخ نے بلند آواز سے فرمایا ہاں فلاں فلاں میخانہ میں شراب آزادی سے بکتی ہے اور دوسرے ناگفتنی کام ہوتے ہیں، اور تم یہاں بیٹھے داد عیش دے رہے ہو، بادشاہ نے کہا کہ جناب والا مجھے اس میں کچھ دخل نہیں، یہ میرے والد کے زمانہ سے ہوتا رہا ہے، شیخ نے فرمایا کہ پھر تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو جن کا جواب یہ ہوتا ہے: إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ (ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانہ سے یونہی پایا ہے) سلطان نے فوراً اس شراب خانہ کی بندش کا حکم جاری کیا۔

شیخ کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ دربار سے واپسی پر میں نے عرض کیا کہ حضرت! کیا حال تھا؟ فرمایا کہ میں نے بادشاہ کو جب اس شان و شوکت کے ساتھ اجلاس کرتا ہوا دیکھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ منظر دیکھ کر اس پر تکبر کا حملہ ہو اور وہ اپنے نفس کا شکار ہو جائے، میں نے اس کی اصلاح کے لئے یہ بات کہی، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ خوف نہیں معلوم ہوا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی ہیبت و جلال اس وقت ایسا مستحضر اور پیش نظر تھا کہ وہ مجھے اس کے مقابلہ میں ایک بلی کی طرح معلوم ہوتا تھا۔[1]

فرنگیوں سے جہاد

وہ زمانہ فرنگیوں کی ریشہ دوانیوں سے خالی نہ تھا، ایک مرتبہ فرنگی فوجیں منصورہ تک پہونچ گئیں اور مسلمانوں پر انھوں نے غلبہ حاصل کر لیا، شیخ مسلمانوں کے ساتھ شریک جہاد تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو استجابت دعا کی نعمت عطا فرمائی تھی، ابن السبکی طبقات میں لکھتے ہیں کہ ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی، ہوا کا رُخ بدل گیا، فرنگیوں کے جہاز ٹوٹ گئے اور اکثر فرنگی غرق ہو گئے۔

مصارف جہاد کے لئے شیخ کا انتظام

اس زمانہ میں تاتاری عالم اسلام پر جا بجا سے یورش کر رہے تھے، اسی اثنا میں انھوں نے مصر کا رخ کیا، تاتاریوں کی مسلمانوں پر جو ہیبت بیٹھی ہوئی تھی، وہ ضرب المثل ہے، مصر میں سراسیمگی پھیل گئی، سلطان مصر اور اہل مصر کی بہت مقابلہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی، شیخ الاسلام نے ہمت دلائی اور فرمایا کہ تم اللہ کا نام لے کر نکلو، میں فتح کی ضمانت کرتا ہوں، بادشاہ نے کہا کہ میرے خزانہ میں روپیہ کم ہے، میں تجار سے قرض لینا چاہتا ہوں، شیخ نے فرمایا کہ پہلے اپنے محل کے جواہرات اور اپنی بیگمات کے زیورات نکالو، ارکان سلطنت

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۵ ایضاً ص ۸۳

اور امراء دربار اپنی اپنی محلات کے زیورات حاضر کریں جو حرام ہیں اور ان کے سکّے ڈھلوائے جائیں اور وہ لشکر میں تقسیم ہوں، اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو قرض لیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے پہلے قرض کی کوئی ضرورت نہیں، شیخ کا اتنا رعب تھا کہ بادشاہ اور امراء سلطنت نے بے چون و چرا اپنے اموال و زیورات شیخ کے سامنے حاضر کردیئے اور ان سے جنگ کے مصارف پورے ہوگئے، اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

امراء سلطنت کا نیلام

شیخ کی زندگی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز اور اہم واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ان امراء سلطنت کو نیلام کیا، جو ان کے نزدیک مسلمانوں کے بیت المال کی ملکیت تھے اور شرعی طریقہ پر آزاد نہیں کیے گئے تھے، یہ امراء سلطنت نسلاً ترک تھے اور سلطنت مصر پر بڑے حاوی تھے، ان میں سے ایک نائب السلطنت تھا، شیخ نے فتویٰ دیا کہ جب تک یہ امراء شرعی طریقہ پر آزاد نہ ہوں، ان کے معاملات شرعاً صحیح نہیں ہیں، اور وہ عام غلاموں کے حکم میں ہیں، ان کے فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں احتیاط شروع کردی اور وہ بڑی دقت میں پڑ گئے، یہ دیکھ کر ان امراء کے حلقہ میں بڑی برہمی اور تشویش پیدا ہوئی، انہوں نے ایک دن جمع ہو کر شیخ کو طلب کیا اور کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ شیخ نے فرمایا کہ ہم ایک مجلس طلب کریں گے اور بیت المال کی طرف سے آپ کا نیلام کریں گے، اور شرعی طریقہ پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا، انہوں نے سلطان سے عرض کیا کہ شیخ ہم کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں اور سربازار نیلام کرنے کو کہتے ہیں، بادشاہ نے شیخ کو راضی کرنا چاہا، مگر انہوں نے اپنی رائے سے رجوع نہیں کیا، اس گفت و شنید میں بادشاہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا جو شیخ کے خلاف شان تھا، بادشاہ نے اس کا بھی اظہار کیا کہ شیخ کو اس معاملہ سے کیا تعلق اور وہ امراء کے قضیہ میں کیوں پڑتے ہیں، شیخ یہ سن کر ناراض ہوئے اور انہوں نے مصر سے چلے جانے کا عزم کرلیا، اپنا سامان جانور پر بار کیا اور گھر والوں کو سوار کیا، اور روانہ ہوگئے، ان کی روانگی

کی خبر سن کر قاہرہ میں کھلبلی مچ گئی، شہر کی مسلمان آبادی کا بڑا حصہ ان کے پیچھے ہو لیا، علماء، صلحاء، تجار، سب ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے، سلطان کو اطلاع ہوئی اور کسی نے اس سے کہا کہ شیخ عزالدین چلے گئے تو تمہاری سلطنت جاتی رہے گی، سلطان خود سوار ہو کر ان کے پاس پہنچا اور ان کو منا کر شہر واپس لایا اور طے ہوا کہ امراء سلطنت کا وہ فوراً نیلام کر دیں، یہ دیکھ کر نائب السلطنت نے بڑے خوشامدانہ لہجہ میں ان کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے، نائب کو غصہ آ گیا، اس نے کہا کہ یہ شیخ کیسے ہمارا نیلام کریگا، ہم ملک کے حاکم ہیں، خدا کی قسم! میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا، چنانچہ وہ اپنے عملہ کے ساتھ سوار ہو کر شیخ کے دروازہ پر پہنچا، ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی، دروازہ کھٹکھٹایا، شیخ کے صاحبزادہ باہر نکلے تو یہ حال دیکھا کہ نائب السلطنت شمشیر برہنہ لئے دروازہ پر کھڑا ہے، انہوں نے اندر جا کر شیخ سے یہ حال کہا، شیخ نے بے پروائی سے جواب دیا کہ بیٹا! تمہارے والد کا یہ رتبہ کہاں کہ اللہ کے راستہ میں شہید ہو، یہ کہہ کر وہ باہر نکلے، ان کا نکلنا تھا کہ تلوار نائب السلطنت کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا، اس نے رو کر شیخ سے دعا کی درخواست کی اور کہا کہ میرے آقا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ فرمایا میں تمہارا نیلام کروں گا اور تمہیں فروخت کروں گا۔ اس نے کہا کہ ہماری قیمت آپ کس مد میں صرف کریں گے؟ فرمایا! مسلمانوں کے کاموں میں، اس نے عرض کیا کہ قیمت وصول کون کرے گا؟ فرمایا میں خود، اس نے کہا بہت اچھا، چنانچہ شیخ نے ایک ایک کر کے سب امراء کو نیلام کیا، ہر ایک پر بولی بولی گئی، شیخ نے ان کے اعزاز کے طور پر ان کے دام بہت لگائے اور بہت بڑی بولی پر ان کو فروخت کیا، اور قیمت وصول کر کے خیر کے کاموں میں صرف کی، اور وہ آزاد ہو کر اپنے اپنے گھر گئے۔[1] ابن السبکی لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ کسی اور کے متعلق سننے میں نہیں آیا، ایک عالم کی عظمت اور اس کے رعب و داب کی یہ انتہائی مثال ہے۔

شیخ عزالدین اور سلاطین مصر

مصر میں شیخ کی زندگی میں بڑے انقلابات آئے، وہ مصر آئے تھے تو ایوبی سلطنت کا زمانہ تھا، اور

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۸۴-۸۵

صلاح الدین کا خاندان حکومت کر رہا تھا، ان کی زندگی ہی میں یہ خاندان ختم ہوا، الملک الصالح نجم الدین ایوب کے جانشین الملک المعظم توران شاہ کے بعد ترکی النسل امراء کا دورِ حکومت آیا، وہ سب شیخ کے بڑے معتقد اور نیاز مند تھے اور ان کی تعظیم و تکریم اور بزرگداشت میں کوئی کمی نہیں آئی، خصوصیت کے ساتھ مصر کا نامور ترک سلطان الملک الظاہر بیبرس جو شیخ کا بڑا ادب شناس اور ان کی شخصیت سے متاثر تھا، شیخ ہی کے مشورہ سے سقوطِ بغداد اور سلطنتِ عباسیہ کے اختتام پر سلطان نے بغداد کے آخری خلیفہ مستعصم کے چچا ابو القاسم احمد کو جن کا لقب المستنصر ہے ۶۵۹ھ میں مصر میں اعزاز و اکرام کے ساتھ ٹھہرایا، پہلے شیخ عزالدین نے بیعت کی، پھر الملک الظاہر بیبرس نے، پھر قاضی القضاۃ تاج الدین وغیرہ نے۔[1]

مکارمِ اخلاق

شیخ اپنے علم و فضل و وقار و ہیبت کے ساتھ بڑے کریم النفس، فیاض اور مخیر تھے، قاضی القضاۃ بدرالدین بن جماعۃ ناقل ہیں کہ دمشق کے زمانۂ قیام میں ایک سال بڑی گرانی کا آیا، باغات کے دام بہت گر گئے اور بہت سستے بکنے لگے، شیخ کی اہلیہ محترمہ نے ان کو ایک زیور دیا کہ گرمی گزارنے کے لئے ایک باغ خرید لیں، انھوں نے وہ زیور فروخت کر کے ساری قیمت خیرات کر دی، اہلیہ نے پوچھا کہ آپ نے باغ خرید لیا؟ فرمایا کہ "ہاں! مگر جنت میں! میں نے دیکھا کہ لوگ بڑی عسرت اور تکلیف میں ہیں، میں نے اس کی قیمت ان پریشان حال لوگوں پر صرف کر دی"، انھوں نے فرمایا جزاک اللہ۔

قاضی القضاۃ موصوف یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ شیخ تنگ حالی کے باوجود بڑے فراخ دست اور مخیر تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے پاس کچھ دینے کو نہ ہوتا تو اپنا عمامہ چیر کر اس کا ایک ٹکڑا دے دیتے۔

شیخ عزالدین صرف سلاطین ہی کے مقابلہ میں جری اور حق گو نہ تھے بلکہ اپنے نفس کے معاملہ میں بھی

---

[1] حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۹۴

اسی طرح وہ بے باک اور حق شناس تھے، ابن السبکی اور سیوطی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مصر کے زمانۂ قیام میں ان سے ایک فتویٰ میں غلطی ہو گئی تو انھوں نے اعلان کرا دیا کہ جس کو ابن عبد السلام نے فلاں فتویٰ دیا ہو وہ اس پر عمل نہ کرے اس لئے کہ وہ غلط ہے۔[1]

ابن السبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوم ظاہری کے کمالات کے ساتھ دولت باطنی سے بھی مالامال تھے اگرچہ ان کے ایمان و یقین، اعتماد علی اللہ، بے خوفی و شجاعت، ارباب دنیا کی بے وقعتی کے واقعات خود اس پر دلیل ہیں، لیکن ابن السبکی نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے امام طریقت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے استفادہ کیا تھا اور ان کی طرف سے ارشاد و تربیت کے لئے مجاز تھے[2] سیوطی نے شیخ ابوالحسن شاذلیؒ سے بھی ملاقات و استفادہ کا ذکر کیا ہے۔[3]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارہ میں شیخ کا مسلک

شیخ علمی و نظری طور پر بھی اس کے قائل تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، بدعات اور گمراہیوں کی علانیہ مخالفت و انکار علماء کا فریضہ ہے اور اس سلسلہ میں ان کو خطرات شدائد بھی برداشت کرنے چاہئیں اور ہر طرح کے مصائب کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

الملک الاشرف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

وبعد ذلک فانا نزعم انا من جملة	ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی جماعت میں
حزب اللّٰہ وانصار دینہ وجندہ	ہیں اور اس کے دین کے مددگار اور اس کا لشکر
وکل جندی لایخاطر بنفسہ فلیس	ہیں وہ لشکری جو اپنے کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے
بجندی۔[4]	تیار نہ ہو وہ لشکری ہی نہیں ہے۔

---

[1] حسن المحاضرہ ج۲ ص۸۴ [2] طبقات ج ۵ ص۸۱ [3] حسن المحاضرہ ص۸۴ [4] طبقات ج۸ ص۸۱

ان کا خیال تھا کہ علم و زبان سے منکر کا تعاقب ضروری ہے اسی لئے ان کا جہاد یہ ہے کہ وہ دونوں کو حق کی تائید اور باطل کی مخالفت میں کام میں لائیں۔ ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

قد امرنا الشرع بالجهاد لنصرة دينه الا	اگرچہ شارع نے ہم کو اپنے دین کی مدد کے لئے جہاد و
ان سلاح العالم علمه ولسانه كما ان	جدوجہد کا حکم دیا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ عالم
سلاح الملك سيفه وسنانه فكما لا يجوز	کا ہتھیار اس کا علم اور اس کی زبان ہے جیسے کہ بادشاہ
للملوك اغماد اسلحتهم عن الملحدين	کا ہتھیار اس کی تلوار اور تیر و سنان ہے تو جس طرح بادشاہ
والمشركين لا يجوز للعلماء اغماد	کے لئے اپنے ہتھیاروں کو نیام میں رکھنا جائز نہیں
السنتهم عن الزائغين والمبتدعين[1]	اسی طرح علماء کے لئے اہل زیغ و ضلال اور بدعتیوں
	سے اپنی زبان کو بند کرنا جائز نہیں۔

ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں عالم ربانی کو ہر طرح کے خطرات برداشت کرنا چاہئیں گویا ان کو ان علماء سے اتفاق نہیں ہے جو ہر طرح کے خطرہ میں پڑنے کو مطلقاً ناجائز سمجھتے ہیں اور آیت "ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ" سے غلط اور بے محل استدلال کرتے ہیں اسی خط میں بڑے موثر انداز میں فرماتے ہیں:۔

والمخاطرة بالنفوس مشروعة في اعزاز	دین کی عزت و غلبہ کے لئے جانوں کو خطرہ میں ڈالنا
الدين ولذلك يجوز للبطل من المسلمين	مشروع ہے اسی لئے مسلمان بہادر کے لئے جائز
ان ينغمر في صفوف المشركين وكذلك	ہے کہ مشرکین کی صفوں میں گھس جائے اسی طرح امر بالمعروف
المخاطرة بالامر بالمعروف والنهي عن المنكر	اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں اپنے کو خطرہ میں ڈالنا اور
ونصرة قواعد الدين بالحجج والبراهين	اصول دین کی دلائل و براہین کے ذریعہ تقویت پہنچانا ہے

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۱۲۰

شر بعده من خشي الا نفسه فقد عنه — اگر شیخ کو اپنی جان کا خطرہ ہوتا اس کی وجہ سے تو

ثم وجب ونهي الا اجتناب وهي معلى ان — ہو جاتا اور اجتناب اتنا ہی تھا جتنا کہ خیال ہے کہ

التفريد بالتقوى لا يجوز فمن ابعد عن الحق — ہماری تقویٰ میں وہ الزام جائز نہیں وہ حق سے بعید

وتخلى عن الصواب ودعى الفتنة فمن آثر — وہ ہو گیا اور اس کا یہ قول بالکل صحیح نہیں خلاصہ

الله على نفسه آثر الله ومن طلب رضا — یہ کہ جو اللہ کو اپنے نفس پر ترجیح دیگا اللہ اس کو ترجیح دیگا

الله بما يسخط الناس رضي الله عنه وارضى — پر ترجیح دیگا اور جو لوگوں کو ناراض کر کے اللہ کو راضی

عنه الناس ومن طلب رضا الناس بما — کرنے کی کوشش کرے گا اللہ اس سے خوش ہو کر راضی

يسخط الله سخط الله عليه واسخط عليه — ہو جائے گا۔ اور لوگوں کو راضی کریگا اور جو اللہ کو

الناس وذهب رضا الله كفاية عن رضا — ناراض کر کے لوگوں کو راضی کرنے کی کوشش کریگا

كل احد. (طبقات ج ۵ ص ۹) — اللہ بھی ناراض ہوگا اور لوگوں کو بھی ناراض کر دیگا۔

عرب شاعر نے خوب کہا ہے:۔

فليتك تحلو والحياة مريرة　　　وليتك ترضى والانام غضاب

(کاش کہ آپ کی محبت کی حلاوت مجھے حاصل ہو جائے پھر چاہے زندگی کتنی ہی تلخ ہو جائے اور کاش کہ آپ مجھ سے راضی ہو جائیں چاہے سارا زمانہ ناراض ہو جائے)

ان کی زندگی بتلاتی ہے کہ انھوں نے ساری عمر اپنے اس عقیدہ اور مسلک پر عمل کیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں اور اپنے نزدیک کسی غلط اور خلاف شرع چیز کی تردید میں اپنی جان مال آبرو وطن وغیرہ کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

شیخ کی تصنیفات

شیخ جس طرح کامیاب مدرس اور وسیع النظر فقیہ اور متبحر مفتی تھے اسی طرح کہنہ مشق مصنف بھی تھے

ان کی تصنیفات میں القواعد الکبریٰ اور کتاب مجاز القرآن خاص وقعت رکھتی ہے ابن سبکی لکھتے ہیں۔

وهذان الكتابان شاهدان بامامته — دونوں کتابیں ان کی امامت اور علوم شریعت

وعظيم منزلته في علوم الشريعة[1] — میں ان کے عظیم منزلت پر شاہد ہیں۔

ان دونوں کتابوں کا انھوں نے دو الگ کتابوں میں اختصار کیا ہے، ابن السبکی نے ان کی دو اور کتابوں شجرة المعارف اور الدلائل المتعلقة بالملائكة والنبيين عليهم السلام کی بھی خصوصی تعریف کی ہے ان کی ایک کتاب مقاصد الصلاة تو ان کے زمانہ میں بڑی مقبول ہوئی اور لوگوں نے اس کی ہزاروں نقلیں کیں[2] چھوٹی بڑی تصنیفات کے علاوہ ان کے فتاویٰ کا ضخیم مجموعہ ہے جو فقہ شافعی کا قیمتی ذخیرہ ہے۔

امام غزالی کے بعد شیخ عز الدین غالباً دوسرے عالم اور مصنف ہیں جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ احکام شرعیہ کے مقاصد و لطائف پر گفتگو کی اور شریعت کے اسرار و نکات بیان کئے اس موضوع کے سب سے بڑے مصنف شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں اس موضوع کے پیش رو مصنفین میں بزرگوں حجۃ الاسلام غزالی ابو سلیمان خطابی اور شیخ الاسلام عز الدین کا نام لیا ہے[3]۔

شیخ کی وفات

۹ جمادی الاولیٰ ۶۶۰ھ میں ۸۳ سال کی عمر میں شیخ کی وفات ہوئی یہ الملک الظاہر بیبرس کا عہد حکومت تھا اس کو شیخ کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا کہنے لگا خدا کی شان ہے شیخ کی وفات میرے عہد حکومت ہی میں مقدر تھی جنازہ میں امراء اور ارکان سلطنت اور اراکین شاہی شریک تھے سلطان نے خود کاندھا دیا اور دفن میں شریک ہوا۔ شیخ کا جنازہ جب قلعہ کے نیچے سے گزرا اور سلطان نے خلقت کا اژدحام دیکھا تو اپنے خواص میں کسی سے کہا کہ آج میں سمجھتا ہوں کہ میری سلطنت مضبوط ہوئی ہے اس لئے کہ یہ شخص جو مرتبہ حاصل ہے اگر اشارہ کر دیتا تو میری سلطنت چلی جاتی اس کے انتقال کے بعد مجھے اب اپنی سلطنت کی طرف سے اطمینان ہوا ہے[4]۔

---

[1] طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۵ [illegible] [2] [illegible] [3] حجۃ اللہ البالغہ مطبع صدیقی [4] طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۵ [illegible]

فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش

تاتاری حملے اور اس کے اسباب

ساتویں صدی میں عالمِ اسلام کو وہ حادثہ پیش آیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی اور جو قریب تھا کہ اس کی ہستی کو فنا کردے، یہ تاتاری غارتگروں کا حملہ تھا جو مور و ملخ کی طرح مشرق سے بڑھے اور سارے عالمِ اسلام پر چھا گئے۔

اس منحوس واقعہ کا سبب سلطانِ وقت علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی ایک غلطی اور بے تدبیری تھی کہ اس نے پہلے ان تاتاری تاجروں کو قتل کرا دیا جو اس کے ملک میں تجارت کے لئے آئے تھے پھر جب چنگیز خاں نے اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے ایک سفارت بھیجی تو خوارزم شاہ نے سفیر کو بھی قتل کرا دیا، اس پر تاتاری خاقان چنگیز خاں نے برافروختہ ہوکر خوارزم شاہی سلطنت اور پھر پورے عالمِ اسلام پر حملہ کر دیا۔

لیکن قرآن مجید میں اعمال و اخلاق کے نتائج اور اقوام و ملل کے عروج و زوال کا جو ابدی اور ہمہ گیر قانون بتایا گیا ہے اور خاص طور پر سورۂ اسراء کی ابتداء میں بنی اسرائیل کی تباہی، قتلِ عام و نکبت و ذلت اور بیت المقدس کی تخریب و بے حرمتی کی جو داستانِ عبرت سنائی گئی ہے[1] اس کی روشنی میں اس فتنۂ عالم آشوب

---

[1] اس موقع پر سورۂ اسراء کی آیات "وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتب لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علوا کبیرا" سے لے کر "جہنم للکافرین حصیرا" تک کی آیات پر غور کیا جائے۔

اور اس وقت کی دنیائے اسلام کی اس قیامتِ صغریٰ کا حقیقی سبب صرف اتنا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک بادشاہ نے کوتاہ نظری اور بے تدبیری سے کام لیا اور اچانک یہ سیلاب عالمِ اسلام پر امنڈ پڑا اور ایک فرد کی غلطی سے ساری امتِ اسلامیہ کو یہ روزِ بد دیکھنا پڑا جس کے لئے نہ وہ تیار تھی نہ اس کی مستحق، قرآن مجید کا چراغ اگر ہاتھ میں لے کر اس وقت کے مسلمانوں کی اخلاقی، دینی، تمدنی اور سیاسی حالت کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ یہ کوئی بے جوڑ واقعہ اچانک پیش نہیں آیا، اور اس کے اسباب اس سے کہیں زیادہ وسیع، گہرے اور ٹھوس ہیں جتنے سمجھے اور بیان کئے گئے ہیں، اس کے لئے ہم کو کئی سال پیچھے ہٹ کر اپنا کام شروع کرنا پڑے گا، اور اس وقت کی اسلامی سلطنتوں، اہم دینی، تمدنی مراکز اور اسلامی معاشرہ پر ایک اجمالی نگاہ ڈالنی ہوگی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی وفات (۵۸۹ھ) پر اس کی وسیع و زرخیز سلطنت اس کی اولاد و خاندان کے افراد میں تقسیم ہو گئی، دنیا کے بہت سے بانیانِ سلطنت اور اولوالعزم فرمانرواؤں کی طرح[1] اس کی اولاد اس کی صلاحیتوں کی وارث اور اس کی صحیح جانشین ثابت نہ ہو سکی، عرصہ تک وہ ایک دوسرے سے دست و گریباں اور برسرِ پیکار رہے، بعض اوقات ان میں سے بعض افراد نے اپنے بھائیوں اور افرادِ خاندان کے خلاف صلیبی فرمانرواؤں اور فرنگی حریفوں سے بھی مدد لینے اور ان سے ساز باز کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا، جس کا ایک نمونہ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کے تذکرہ میں گزر چکا ہے، اس طوائف الملوکی، خاندانی رقابتوں اور خانہ جنگیوں سے سلطنت کے زیرِ فرمان ممالک میں سیاسی انتشار، انتظامی ابتری اور اخلاقی زوال رونما تھا، لوگ ایک بے یقینی کی فضا میں زندگی گزار رہے تھے، صلیبیوں اور فرنگیوں کی بار بار اسلامی شہروں پر تاخت ہوتی رہتی تھی جن کو سلطان صلاح الدین نے بڑی جد و جہد اور قربانیوں کے بعد واپس لیا تھا انتظامی و اخلاقی دونوں طرح کی کوتاہیوں اور بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہوا کہ امراض اور شدید قحط کی شکل

---

[1] ہندوستان میں عالمگیر اعظم اور اس کے جانشینوں کی مثال سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

میں رونما ہوا اور مصر جیسے زرخیز ملک میں جو دوسرے ملکوں کا بھی پیٹ بھر سکتا تھا، ۵۹۶ھ میں جبکہ چچا بھتیجے الملک العادل اور الملک الافضل کی خانہ جنگی نے مصر کو کھوکھلا کر دیا تھا، دریائے نیل میں طغیانی نہیں آئی اور مصر میں ایسی گرانی رونما ہوئی اور ایسا شدید قحط پڑا کہ آدمی نے آدمی کو بھون کر کھایا، موت کی ایسی گرم بازاری تھی کہ مردوں کو کفن دینا ممکن نہ تھا، مورخ ابو شامہ کے بیان کے مطابق تنہا الملک العادل (سلطان مصر) نے صرف ایک مہینہ میں دو لاکھ بیس ہزار مردوں کو اپنے ذاتی مال سے کفن دیا، کتوں اور مردوں کے کھانے کی نوبت آگئی، بہت بڑی تعداد میں بچے بھون بھون کر کھائے گئے، اور اس کی ایسی عمومیت ہوئی کہ اس میں لوگوں کو کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی تھی، مورخ ابن کثیر کے بیان کے مطابق جب کھانے کے لئے بچے اور چھوٹی عمر کے لڑکے نہیں رہے تو جس آدمی کا جس آدمی پر زور چلا اس نے اس کو بھون کر کھا لیا۔ سنت اللہ کے مطابق آسمانی تنبیہات کا سلسلہ بھی جاری تھا، اور ایسے غیر معمولی واقعات پیش آ رہے تھے جو توبہ و انابت اور اصلاح حال کا خیال و جذبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھے، چنانچہ اسی ۵۹۷ھ میں ایک عظیم زلزلہ آیا جس کی زد میں خاص طور پر ملک شام، بلاد روم اور عراق تھے، اس کی ہلاکت آفرینی اور دہشت انگیزی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تنہا شہر نابلس اور اس کے اطراف میں تیس ہزار انسان زلزلہ میں دب کر مر گئے، مرآۃ الزمان کے مصنف کا بیان ہے (جو شاید مبالغہ سے خالی نہیں) کہ اس زلزلہ کا شکار گیارہ لاکھ انسان ہوئے۔

ادھر یہ غیر معمولی حوادث پیش آ رہے تھے جو مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے بالکل کافی تھے، ادھر عالم اسلام کے مختلف حصوں میں خانہ جنگی اور برادر کشی کا سلسلہ جاری تھا، سنہ ۶۰۱ھ میں ایک ہی خاندان کے دو افراد قتادہ حسینی امیر مکہ اور سالم حسینی امیر مدینہ میں سخت جنگ ہوئی، ۶۰۲ھ میں غوریوں اور خوارزم شاہیوں کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا اور مسلمانوں نے مسلمانوں کا خون بہایا، ادھر یہ ہو رہا تھا، ادھر ۶۰۳ھ میں فرنگیوں نے شام کے مختلف علاقوں پر حملے شروع کئے

---

[1] ان تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۲۱ ، مرآۃ الزمان حوادث ۵۹۷ھ

سنہ ۶۱۴ھ میں جزیرہ[۱] کے سلطان الکامل[۲] نے فرنگیوں سے سازش کی[۳] اور ۶۱۶ھ میں فرنگیوں نے مصر کے شہر دمیاط پر قبضہ کر لیا جو فوجی و دفاعی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

ادھر مرکز خلافت دارالسلام بغداد میں سلطنت کی ظاہری شان و شوکت بھی تکلفات اور دولت و تمدن کی کھوکھلی نمائش اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ گئے تھے خلفاء کے منظور نظر مصاحبین اور متوسلین کی دولت اور خدام کی حیثیت سے حریم خلافت میں داخل ہوتے تھے اور فراش یا ساقی یا مہتمم توشک خانہ وغیرہ کے منصبوں پر فائز تھے ان کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خلیفہ الظاہر کے زرخرید علاء الدین الطبرسی الظاہری کی سالانہ آمدنی جو اس کو اپنی جائداد سے حاصل ہوتی تھی تین لاکھ دینار تھی۔ بغداد میں اس کے محل کی کوئی نظیر نہ تھی یہی حال مجاہد الدین ایبک الدویدار المستنصری کی دولت کا تھا ان لوگوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیوں میں جو جہیز دیا اور جو تحائف تقسیم کئے ان کو پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مؤخر الذکر کی جاگیر کی آمدنی پانچ لاکھ دینار سالانہ تھی یہی حال الصلاح عبدالغنی بن فاخر فراش کا تھا جو پورے علم سے عاری لیکن شاہانہ عیش کی زندگی گزارتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں سلطنت عباسیہ کے سب سے بڑے مدرسہ المستنصریہ کے لائق اساتذہ کی تنخواہیں اتنی مختصر تھیں کہ اس کا یقین کرنا مشکل ہے ان میں سے بعض بڑے اساتذہ کو ۱۲ دینار ماہوار سے زیادہ نہیں ملتے تھے جب کہ اس کے مقابلہ میں عہد عباسی کے ایک امیر الشرابی کے ایک غلام نے چار ہزار دینار ایک امیر کی شادی میں لٹائے اور تین ہزار دینار شرابی کی طرف سے ایک پرندہ کی قیمت میں جو اس کے لئے تحفہ میں موصل سے لایا گیا تھا ادا کئے گئے[۴]۔

شان و شوکت کے اظہار کے لئے عید اور جانشینی کے موقع پر جو شاہانہ جلوس بغداد میں نکلتے تھے [illegible]

---

[۱] جزیرہ سے ادھر دجلہ و فرات کے درمیان کا علاقہ مراد ہے اس کو عرب الجزیرہ کہتے ہیں اس کا مرکزی شہر موصل ہے۔

[۲] کامل سے مقصود [illegible]   [۳] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص [illegible]

[۴] یہ سب معلومات [illegible] الحوادث الجامعہ اور [illegible] سے ماخوذ ہیں۔

ان میں شرکت کرنے ان کا تماشا دیکھنے میں محو اور خود فراموش ہو جاتا تھا، نمود و نمائش کے اس والہانہ جذبے میں دینی فرائض ان کی نظر انداز ہوتے تھے اور نمازیں قضا ہوتی تھیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ سنہ [illegible] کے عید کے موقع پر جو شاہی جلوس نکلا وہ رات کو جا کر ختم ہوا، اس کی ایسی مشغولیت اور محویت رہی کہ لوگوں نے اس دن عید کی نماز نصف شب کے بعد قضا کر کے پڑھی، اسی طرح سنہ [illegible] کی عید الاضحی کو اہل بغداد شہر کے باہر خلیفہ کا شاہی جلوس دیکھنے نکلے اور نماز عید انھوں نے غروب آفتاب کے وقت پڑھی۔

خلیفہ کے لئے زمین بوسی کا عام رواج تھا، اسی طرح سے آستانہ بوسی اور زمین پر ناک رگڑنے کا بھی دستور تھا اور اس میں کسی کو کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی تھی، عہدہ داروں کی بدعنوانی کے واقعات کثرت سے پیش آتے تھے رشوت کی گرم بازاری تھی، باطنیوں، عیاروں اور ٹھگوں کی سرگرمی تیز ہو گئی تھی، اخلاقی بے راہ روی بہت بڑھ گئی تھی[1]، دل بہلانے والے مشاغل کا زور تھا، مغنیات کی کثرت تھی اور دولت جمع کرنے کا شوق حد سے فزوں تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ تاتاری ایران و ترکستان کو تہ و بالا کر رہے تھے اور اسلام کے سب سے بڑے قلعہ بغداد پر ان کی نگاہیں تھیں، مورخ ابن کثیر سنہ [illegible] کے آغاز کی ان الفاظ کے ساتھ خبر دیتا ہے کہ "اس سن ہجری کی ابتدا اس حال سے ہوئی کہ سلاطین بنی ایوب (سلطان صلاح الدین کے خاندان کے بادشاہ) ایک دوسرے سے نبرد آزما اور برسر پیکار رہے" دار الخلافت بغداد میں کچھ ایسا انتشار برپا ہوا کہ سنہ [illegible] سے سنہ [illegible] تک خلفائے اسلام کے قدیم و مسلسل معمول کے خلاف خلیفہ کی طرف سے نہ حج کا انتظام ہوا اور نہ غلاف کعبہ آ سکا، اور اس دن تک بیت اللہ شریف کی دیواریں بالکل کھلی رہیں، لوگوں نے اس سے بد شگونی لی۔

۵۷۵ھ میں الناصر لدین اللہ تخت خلافت پر بیٹھا، اس کو چھیالیس سال سے زیادہ مسلسل خلافت[2] و حکومت کا موقع ملا، یہ اتنی طویل مدت ہے جو کسی عباسی خلیفہ کو بھی نصیب نہیں ہوئی، لیکن اس کا دور خلافت عباسیہ کا تاریک ترین دور تھا، مورخین نے بڑے سخت الفاظ میں اس پر تنقید اور اس کے اعمال و اخلاق کی

---

[1] البدایہ والنہایہ واقعات سنہ [illegible] [2] ملاحظہ ہو مضمون "عصر الخلیفۃ الناصر لدین اللہ" از [illegible] الاعلام جلد اول نمبر [illegible]۔

مذمت کی ہے۔ مورخ ابن اثیر نے ان لفظوں میں اس کو یاد کیا ہے۔

"رعیت کے ساتھ اس کا سلوک نہایت خراب اور ظالمانہ تھا۔ اس کے زمانہ میں عراق ویران ہو گیا ملک کے باشندے تمام شہروں میں منتشر ہو گئے اس نے ان کی جائدادیں اور املاک ضبط کر لیں۔ اس کے کاموں میں بڑا تضاد تھا۔ ایک بات کرتا تھا پھر اس کے خلاف، اس کا تمام زمانہ [illegible] مشاغل میں [illegible] اور بڑی دلچسپی لیتا۔ اگر یہ صحیح ہے جو اہل عجم اس کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ [illegible] [illegible] [illegible] تاتاریوں کو [illegible] [illegible] کا [illegible] [illegible] تو یہ ایسا [illegible] گناہ ہے کہ [illegible] [illegible] بڑا گناہ اس کے سامنے ہیچ ہے۔"

۶۲۲ھ میں الناصر لدین اللہ کی وفات ہوئی اور مستنصر باللہ (۶۲۳ھ۔۶۴۰ھ) اس کا جانشین ہوا جو خلیفہ بیدار مغز با ہمت نیک سیرت اور بہت سے اوصاف و خصوصیات میں خلفائے متقدمین کی یادگار تھا لیکن افسوس ہے کہ اس کو اتنی مہلت اصلاحات کے لئے [illegible] ۶۴۰ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا فرزند مستعصم باللہ خلیفہ ہوا۔ مستعصم [illegible] سیدھا دیندار اور حافظ قرآن خلیفہ تھا جو کبھی منکرات و محرمات کے قریب نہیں گیا [illegible] [illegible] مذہب کی روشنی رکھتا تھا، قرآن کا حافظ تھا وقت پر نماز پڑھنے کا سخت پابند تھا لیکن مورخ ابن اثیر کے قول کے مطابق طبیعت میں ضرورت سے زیادہ نرمی اور بیدار مغزی کی کمی تھی، دولت کے معاملات میں بے تدبیر اور بے خبر واقع ہوا تھا۔

۶۴۲ھ میں ابن العلقمی کے ہاتھ سلطنت عباسیہ کی وزارت عظمیٰ کا قلمدان آیا، خلافت کے آخر زمانے میں [illegible] [illegible] [illegible] ۶۵۶ھ میں [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

شیعوں کے مکانات یہاں تک کہ ابن العلقمی کے عزیزوں کے مکانات تک لوٹ لئے گئے[1]۔ ان واقعات سے اس کے دل میں بڑی کاوش پیدا ہوئی اور جذبۂ انتقام کا ابھرنا ایک فطری بات تھی، اس وقت اگرچہ تاتاری خطرہ بغداد کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا اور تاتاری فوجیں بغداد کی طرف بڑھ رہی تھیں، وزیر ابن العلقمی کی ہدایت اور حکم سے بغداد کی افواج میں زبردست تخفیف کی گئی، سواروں کی تعداد گھٹا کر دس ہزار کر دی گئی، بقیہ سپاہیوں کو رخصت کر دیا گیا اور ان کے منصب روک لئے گئے یہاں تک کہ ان کو بازاروں اور مسجدوں کے دروازوں پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا گیا، شعراء نے اسلام کی کسمپرسی پر مرثیے کہے[2]۔

مستعصم اگرچہ ذاتی طور پر نیک سیرت اور نیک خیال خلیفہ تھا، اور اصلاح و ترقی کا خواہشمند بھی تھا لیکن زمانہ کا فساد، معاشرہ کا انتشار اور اہل حکومت کا بگاڑ اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ اس کو روکنے اور حکومت و معاشرہ میں اصلاح کی نئی روح پھونکنے اور اس کو نئی زندگی عطا کرنے کے لئے ایسے اولوالعزم اور طاقتور شخصیت رکھنے والے افراد کی ضرورت تھی جو عام طور پر تاریخ میں نئی سلطنتوں کے بانی اور نئے عہد کے فاتح ثابت ہوئے ہیں۔ یہ واقعہ تاریخ میں بار بار پیش آیا ہے کہ اکثر حکمراں خاندانوں کے آخری افراد اور کسی زوال پذیر سلطنت کا آخری فرمانروا اپنی ذات سے صلاحیت شعار، اصلاح پسند اور نیک سیرت تھا لیکن اس خاندان یا اس سلسلۂ سلطنت کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور فساد بڑھتے بڑھتے اس آخری نقطہ پر پہنچ چکا تھا کہ اب اس کو آخری منزل پر پہنچنے اور اس کے قدرتی نتائج کے ظاہر ہونے سے بظاہر کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی، چنانچہ اس خاندان اور حکومت کا زوال تاریخ میں اسی شخص کے نام لکھا گیا جو اپنے بہت سے پیشروؤں سے بہتر تھا اور بہت حد تک اصلاح حال کا خواہشمند تھا۔

اگرچہ بغداد میں اہل اصلاح کی ایک تعداد علم و درس اور عبادت میں مشغول تھی اور کچھ اللہ کے بندے خانقاہوں اور مساجد میں خلوت نشین اور یکسو تھے، لیکن حکام اور آسودہ حال طبقے میں بگاڑ پھیل گیا تھا

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۱۹۶ [2] ایضاً ص

اس عہد کا ایک مورخ ابوالحسن خزرجی اپنے زمانہ کے اہل عراق کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> "جاگیروں اور جائدادوں کے حصول کا شوق بہت بڑھ گیا ہے رفاہِ عام کے کام اور اجتماعی مصالح سے لوگوں کی توجہ ہٹ گئی ہے مال و دنیا کی محبت و شیفتگی بہت بڑھ گئی ہے جو جائز نہیں ہے اہل سلطنت نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے اور سب کو زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی فکر ہے:

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:۔

> "یہ صورت حال بڑی خطرناک ہے سلطنت کفر کے ساتھ تو رہ سکتی ہے ظلم کے ساتھ نہیں رہ سکتی[1]"

اُدھر عالم اسلام کے مشرقی حصہ میں خوارزم شاہی بلا شرکت غیرے حکومت کر رہے تھے یہ بڑے جاہ و جلال کی سلطنت تھی جو پانچویں صدی کے آخر میں سلطنت سلجوقیہ کے کھنڈروں پر قائم ہوئی مصر و شام عراق و حجاز اور شمال مغرب میں ایشیائے کوچک کے کچھ سلجوقی علاقہ اور جنوب مشرق میں غوریوں کی زرخیز سلطنت کو مستثنیٰ کر کے تقریباً سارا عالم اسلام خوارزم شاہیوں کے زیر نگین تھا۔ اس خاندان کا سب سے بڑا اولو العزم عالی ہمت اور کشور کشا سلطان علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۶ھ - ۶۱۷ھ) تھا جو اپنے عہد کا سب سے بڑا مسلمان بادشاہ اور غالباً اپنے عہد کا سب سے طاقتور سلطان تھا۔ ہیرلڈ لیمب ([illegible]) اپنی کتاب "چنگیز خان" میں صحیح لکھتا ہے:۔

> "اسلامی ملکوں کے نقشہ میں سلطان محمد خوارزم شاہ اورنگ شاہی پر قدم جمائے جنگ بنا بیٹھا تھا۔ اس کی قلمرو ہندوستان کی سرحد سے بغداد تک اور بحر خوارزم (آرال) سے خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ سلجوقی ترکوں کے سوا جنھوں نے صلیبیوں پر فتوحات حاصل کی تھیں اور مصر کے سلاطین مملوک سے قطع نظر کر کے جو دوسرا قرن ترقی پر تھے باقی جس قدر اسلامی سلطنتیں تھیں ان پر سلطان محمد خوارزم شاہ بالکل چھایا ہوا تھا۔ سلطان محمد زمین پر شہنشاہ تھا۔ اسلامی خلیفہ ناصر لدین اللہ اس سے ناراض تھے مگر اس کی ذات کو مانتے تھے۔ خلیفہ

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون عصر عباسی کا بغداد از ناجی معروف و رسالہ الاقلام بغداد شمارہ محرم ۱۳۸۵ھ۔

مقدس روحانی اقتدار سے محروم ہو گیا تھا، دوسری طرف مسلمانوں کا ایمانی استحکام بگڑ گیا تھا[1]

عرب مورخین علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی سیرت و اخلاق کی کسی بڑی کمزوری اور کسی ناپسندیدہ عیب کی طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ اس کی دینداری، خوش اعتقادی اور شجاعت و صلاحیت کا عام طور پر اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ساری عملی حیثیتیں اور طاقتیں ان چھوٹی بڑی اسلامی سلطنتوں کے ختم کرنے میں صرف ہوئیں جو اس وسیع مشرقی حصہ میں کہیں واقع تھیں، ایک طرف شمال و مغرب میں اس نے سلجوقیوں کو ان کے آخری حدود تک پسپا ہونے پر مجبور کیا، دوسری طرف مشرق اور جنوب میں وہ ہمیشہ غوریوں سے نبرد آزما رہا اور ان کو بھی ایک محدود حصہ میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا، ایران و ترکستان کی سپہ گری کا بہترین عنصر اس خوارزمی سلطنت کی جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے تھک کر چور ہو گیا تھا، ان زرخیز و مردم خیز ممالک کے شہروں و قصبات کی فضا اور زمین پر جنگ اور خوف چھایا ہوا رہتا تھا، مفتوحہ ممالک کی دولت، شاداب و حاصل خیز ملکوں کی پیداوار، دستکاروں اور اہل صنعت کی نمائش و آرائش کی وجہ سے جو سلطنت اور طاقت کے اس مرکز میں جمع ہو گئے تھے تمدن اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا، اور ثروت و امارت اور فتوحات کے سارے لوازم جمع ہو گئے تھے، اس وقت کی تمدنی خرابیوں و کمزوریوں کا ذکر تو ان تاریخوں میں ملنا مشکل ہے جن کو صرف سرکار و دربار سے سروکار تھا، اگر اس کا سراغ کچھ مل سکتا ہے تو اہل دل صوفیا و مشائخ اور مصلحین کی بیاضوں، ملفوظات اور مواعظ میں جن کا بڑا حصہ تاتاری سیلاب کی نذر ہو گیا، چنگیز خاں کا مسیحی مورخ ہیرلڈ لیمب کا یہ بیان محض دینی تعصب اور مبالغہ آرائی پر محمول نہیں کیا جا سکتا کہ:۔

> ”مسلمانوں کی دنیا جنگ و پیکار کی دنیا تھی، اور ایسی دنیا تھی جو تفریح و سرور سے بھی منتقل کر گئی تھی، اور
> کان بھی اچھے پائے تھے، لیکن اس ظاہری شان کے ساتھ باطن میں الحاد تھا، ان کی حالت بہ وقت مضروب سی تھی،
> اور بادشاہوں کی جگہ غلام اور ملوک حکومت کرتے تھے، دولت جمع کرنے کا شوق بہت تھا، اخلاقی برائیاں

---

[1] چنگیز خاں صفحہ ماخوذ از ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب مرحوم۔

اور ملکی نظم و نسق میں کچھ کم نہیں، انتظام امور ایسے لوگوں کے سپرد تھا جو رعایا کو لوٹتے اور کھاتے تھے،

عورتوں کی نگہداشت خواجہ سراؤں کے ذمہ تھی اور ایمان کا مالک خدا تھا۔[1]

خوارزم شاہی سلاطین سے اس موقع پر بھی وہی مہلک غلطی ہوئی جو اسپین کے عرب فرمانرواؤں نے کی تھی، اور جس کو الٰہی قانون مکافات نے معاف نہیں کیا، یعنی یہ کہ انھوں نے اپنی ساری طاقت سلطنت کی توسیع و استحکام اور حریفوں کی سرکوبی میں صرف کی اور اس انسانی آبادی میں جو ان کی سرحد سے متصل تھی، اور بجائے خود ایک دنیا تھی، تبلیغ اسلام، اور ان تک خدا کا آخری پیغام پہونچانے کی کوئی فکر نہیں کی، جذبۂ دینی سے قطع نظر کرکے سیاسی فراست اور دوربینی کا بھی تقاضا تھا کہ وہ اس وسیع انسانی آبادی کو اپنا ہم آہنگ اور ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرتے، اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اس خطرہ سے محفوظ ہو جاتے جو نہ صرف ان کو بلکہ پورے مسلمانوں کو پیش آیا۔

یہ زمانہ اور حالات تھے جب تاتاری ابتداءً اپنے سردار اور قائد چنگیز خاں[1] کی قیادت میں عذاب الٰہی کی طرح عالم اسلام کے مشرقی حصہ ایران و ترکستان کی طرف بڑھے، پھر اس بغداد کی بھی نوبت آگئی جہاں کا نقشہ اوپر کی سطروں میں گذر چکا ہے، اور بالآخر انھوں نے ۶۵۶ھ میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔

ظاہری اسباب میں اس کا قریبی محرک یہ واقعہ ہوا کہ چنگیز خاں نے خوارزم شاہ کو پیام بھیجا کہ میں ایک وسیع سلطنت کا فرمانروا ہوں، اور آپ بھی ایک وسیع سلطنت کے تاجدار ہیں، بہتر ہے کہ ہم دونوں تجارتی تعلقات قائم کریں، ہمارے تاجر بے خوف و خطر آپ کے قلمرو میں جائیں، اور یہاں کی مخصوص پیداوار اور مال

---

[1] چنگیز خاں ۵۴۹ھ میں پیدا ہوا [illegible] چنگیز خاں کی سلطنت کی ابتدا ۵۹۹ھ سے ہوئی، خوارزم شاہی حکومت پر حملہ ۶۱۶ھ میں ہوا، اس کا انتقال ۶۲۴ھ میں ہوا، اس کے بیٹوں اور پوتوں نے اس کے مقاصد کی تکمیل کی، ۶۵۶ھ میں جب بغداد پر حملہ ہوا تو تاتاری فوجوں کا سالار چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں تھا۔

وہاں فروخت کریں اور آپ کے تاجر اطمینان کے ساتھ ہمارے ملک میں آئیں اور وہاں کا مال فروخت کریں۔ خوارزم شاہ نے اس کو منظور کر لیا۔ اور تجارتی تعلقات قائم ہو گئے اور تجارتی قافلے بے تکلف دونوں ملکوں میں آنے جانے لگے۔ اس کے بعد کیا پیش آیا جس سے عالم اسلام اچانک خون کے سمندر میں ڈوب گیا۔ اس کی تفصیل مغربی مورخ کی زبان سے سنئے جس کی اسلامی مورخین کے بیان سے حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے۔[1]

ہیرلڈ لیمب اپنی کتاب "چنگیز خان" میں لکھتا ہے:۔

> "چنگیزی تجارت کے معاہدات جو چنگیز خان نے قائم کئے تھے وہ اتفاق سے یک لخت ختم ہو گئے۔ اور یہ اس طرح جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ تاجروں کا ایک قافلہ مغرب کو روانہ ہوا، راستہ میں اترار کے حاکم نے جس کا نام اینالجق تھا قافلہ کے سب آدمیوں کو گرفتار کر لیا، اور اس کی اطلاع اپنے آقا محمد خوارزم شاہ کو ارسال کی گویا اس قافلہ میں جاسوس بھی موجود ہیں۔ ممکن ہے یہ خیال بالکل قرین عقل تھا۔
>
> حاکم اترار کو یہاں سے اطلاع گئی کہ سلطان محمد خوارزم شاہ نے بے سوچے سمجھے حکم دے دیا کہ کل بیوپاریوں کو مار ڈالا جائے چنانچہ اس حکم کے مطابق تقریباً سب مارے گئے۔ اس کی اطلاع جس وقت چنگیز خان کو ہوئی تو اس نے فوراً اپنے سفیر بھیج کر خوارزم شاہ سے اس کی شکایت کی۔ سلطان محمد نے سفیروں کے سردار کو بھی قتل کرا دیا، اور دوسروں کی داڑھیاں جلوا دیں۔ اس بے عزتی سے ان لوگوں کی جان تو بچ گئی تھی۔ وہ چنگیز خان کے پاس واپس آئے اور کل حال عرض کیا۔ روایت ہے کہ گوبی کا خان مدافعت پر ایک پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اور تین روز اور تین رات ننگے سر منگولوں کے رب کو پکارتا رہا۔ الغرض اب خاموش بیٹھ رہنا یا چھوڑنا ممکن نہ تھا۔ یہ ترک ایسی تھی جس کا بدلہ منگولوں کی گذشتہ روایات کے لحاظ سے ضروری تھا۔
>
> چنگیز خان نے کہا جس طرح آسمان پر دو آفتاب نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح زمین پر دو خاقان نہیں رہ سکتے۔"[2]

---

[1] ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۸۱، والکامل لابن الاثیر ج ۱۲ ص ۱۳۳ [2] چنگیز خان ص ۸۷ ہیرلڈ لیمب۔

اسلام کے مشرقی ممالک تاتاریوں کی زد میں

تاتاریوں نے پہلے بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس کو ایک تودۂ خاک بنادیا، شہر کی آبادی میں سے کوئی زندہ نہیں بچا، پھر سمرقند کو خاک سیاہ کردیا اور ساری آبادی کو قتل کے گھاٹ اتار دیا، پھر عالم اسلام کے نامی گرامی شہروں میں سے ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور، خوارزم کا یہی انجام ہوا، خوارزم شاہ جو عالم اسلامی کا واحد فرمانروا اور سب سے طاقت ور سلطان تھا، تاتاریوں کے خوف سے بھاگا بھاگا پھرتا تھا، اور تاتاری اس کے تعاقب میں تھے یہاں تک کہ ایک نامعلوم جزیرہ میں اس نے قضا کی۔

خوارزم شاہ نے ایران و ترکستان کی اسلامی ریاستوں اور خود مختار حکومتوں کو اپنی شاہی میں ختم کرلیا تھا، اس لیے جب انھوں نے تاتاریوں کے مقابلہ میں شکست کھائی تو پھر ان کا مقابلہ کرنے والا مشرق میں کوئی نہ تھا، تاتاریوں کی ہیبت اور مسلمانوں کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ایک تاتاری ایک گلی میں گھس جاتا جہاں سو مسلمان موجود تھے کسی کو مقابلہ کی ہمت نہ ہوتی اور وہ اس نے ایک ایک کر کے سب کو قتل کر دیا، اور کسی نے ہاتھ تک نہ اٹھایا، ایک گھر میں ایک تاتاری عورت مرد کے بھیس میں گھس گئی اور تنہا سارے گھر والوں کو قتل کر دیا، پھر ایک قیدی کو جو اس کے ساتھ تھا، احساس ہوا کہ یہ عورت ہے تو اس نے اس کو قتل کیا، بعض اوقات تاتاری نے کسی مسلمان کو گرفتار کیا اور اس سے کہا کہ اس پتھر پر سر رکھ دے، میں خنجر لا کر تجھے ذبح کروں گا، مسلمان وہیں پڑا رہا اور بھاگنے کی ہمت نہ ہوئی یہاں تک کہ وہ شہر سے خنجر لایا اور اس کو ذبح کیا۔[۱]

تاتاری یورش عالم اسلام کے لیے ایک بلائے عظیم تھی جس سے دنیائے اسلام کی چولیں ہل گئیں، مسلمان مبہوت و ششدر رہ گئے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہراس اور یاس کا عالم طاری تھا

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الکامل (ابن اثیر) ج ۱۲ اور دائرۃ المعارف (بستانی) ج ۵ مادہ تتر

تاتاریوں کو ایک بلائے بے درماں سمجھا جاتا تھا ان کا مقابلہ ناممکن اور ان کی شکست ناقابلِ قیاس سمجھی جاتی تھی یہاں تک کہ ضرب المثل کے طور پر یہ فقرہ مشہور تھا کہ اِذَا قِیْلَ لَکَ اِنَّ التَّتَرَ انْهَزَمُوْا فَلَا تُصَدِّقْ یعنی اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں کو کہیں شکست ہوئی ہے تو یقین نہ کرنا۔ جن ملکوں یا شہروں کی طرف ان کا رُخ ہو جاتا سمجھ لیا جاتا تھا کہ ان کی شامت آگئی، جان و مال، عزت و آبرو، مساجد و مدارس کی خیر نہیں تھی۔ تاتاریوں کا فتح کرنا بربادی، قتلِ عام، ذلت و بے آبروئی کا مرادف تھا، ایک مرتبہ تقریباً سارا عالمِ اسلام (خصوصاً اس کا مشرقی حصہ) اس فتنۂ جہاں سوز کی لپیٹ میں آگیا، مورخ ہر طرح کے واقعات پڑھتا اور لکھتا ہے، اس کے سامنے قوموں کی بربادی اور ملکوں کی تباہی کے اتنے مناظر گزرتے ہیں کہ اس کی طبیعت بے حس اور اس کا قلم بے پروا ہو جاتا ہے، لیکن اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ابن اثیر جیسا مورخ (جس نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ دنیا کی تاریخ لکھی ہے) اپنی قلبی کیفیت اور تاثر کو چھپا نہیں سکا، وہ لکھتا ہے:

> یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک اس پس و پیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں، اب بھی بڑے تردد و تکلف کے ساتھ اس کا ذکر کر رہا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبرِ مرگ سنانا کس کو آسان ہے اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت و رسوائی کی داستان سنائے؟ کاش میں پیدا ہوا ہوتا، کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا اور بھولا بسرا ہو جاتا، لیکن مجھے بعض دوستوں نے اس واقعہ کے لکھنے پر آمادہ کیا، پھر بھی مجھے تردد تھا، لیکن خیال کیا کہ نہ لکھنے سے کچھ فائدہ نہیں، یہ وہ حادثۂ عظمیٰ اور مصیبتِ کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں سے ہے لیکن خاص طور پر مسلمانوں سے ہے، اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا تو وہ کچھ غلط دعویٰ نہ ہوگا، اس لئے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا، اور شاید دنیا قیامت تک (یاجوج ماجوج کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے، ان وحشیوں نے کسی پر رحم نہیں کھایا، انھوں نے عورتوں، مردوں اور بچوں کو قتل کیا، عورتوں کے پیٹ چاک کر دیئے

بیت گئی کہ انا للہ وانا الیہ راجعون ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

یہ فتنہ عالمگیر و عالم آشوب تھا، ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم اسلام پر چھا گیا۔

"مرصاد العباد" کا مصنف جو اس تاتاری حملہ کا عینی شاہد ہے اور جس کا مولد رے اور مسکن ہمدان اس تاتاری غارت گری کے منظر دیکھے ہوئے تھے لکھتا ہے:-

تاریخ ہجرت سنہ سبع عشر و ستمائۃ لشکر مخذول کفار تتار خذلہم اللہ و دمرہم استیلا یافت بر آن دیار و آن فتنہ و فساد و قتل و ہدم و حرق کہ از آن ملاعین ظاہر گشت در ہیچ عصر و زمان در بلاد کفر و اسلام کس نشان ندادہ است و در ہیچ تاریخ نیامدہ و قیاس از این بیشتر چگونہ بود کہ از یک شہر رے کہ مولد و منشأ این ضعیف است قیاس می کردہ اند کہ بیش از پانصد ہزار آدمی بقتل آمدہ است و اسیر گشتہ از شہر و ولایت و فتنہ و فساد آن ملاعین بر کلیت اسلام و مسلمانان از آن زیادت است کہ در حیز عبارت گنجد و این واقعہ از آن شایع تر است [illegible] عیاذا باللہ [illegible] غیرت و حمیت اسلام و دین داری ملوک و سلاطین [illegible] رعایت مسلمانان و مسلمانی [illegible] است کہ [illegible] گیرند باتفاق جمیع [illegible] قرآن انفروا خفافا وثقالا وجاهدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ بر بیان جان [illegible] نفس و مال [illegible] کردیگی [illegible] مسلمانی [illegible] جہان [illegible] کردہ ام [illegible]

تنہا عالم اسلام نہیں اس وقت کی پوری متمدن دنیا تاتاریوں کے حملے سے لرزہ براندام تھی جہاں

ا۔ الکامل لابن اثیر [illegible] ۲۔ مرصاد العباد [illegible]

ان کے پہنچنے کے بہت کم امکانات تھے۔ وہاں بھی دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ گبن اپنی مشہور کتاب "تاریخ انحطاط و سقوط روما" میں لکھتا ہے:

"سویڈن کے باشندوں نے، روس کے ذریعے، اس طوفان کی خبریں سنیں تو ان پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہاں کے لوگ [illegible] سے اپنے معمول کے مطابق انگلستان کے ساحل پر شکار کھیلنے کے لیے نہیں نکلے۔"

کیمبرج کی تاریخ عہدِ وسطیٰ کے مصنفوں نے مغلوں کے اس شدید تصادم کو جس کا محرک چنگیز خان تھا بڑی خوبی کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"انسان کی طاقت سے باہر ہوگیا کہ مغلوں کو روکا جاسکے۔ [illegible] کے تمام خطروں پر وہ غالب آئے۔ براعظم، سمندر، [illegible] کوئی ان کی راہ میں حائل [illegible] کسی قسم کے خطروں سے انھیں خوف نہ تھا۔ ان [illegible] سب سے محکم تھا اور رحم کے لیے کسی مظلوم کی [illegible] ان پر اثر کرتی تھی۔ جب ان [illegible] اور [illegible] بہت سی [illegible] اور [illegible] اور انھیں اس طرح شمار کیا جیسے [illegible] کو [illegible] دریا [illegible] حکومت [illegible] کے حوالے [illegible] اس کی [illegible] ایک [illegible] سے [illegible] ہوا اور اس کے [illegible] بغداد کی [illegible] سلطنت [illegible] کرنے [illegible] طاقت [illegible] تقسیم ہوگئی۔"[1]

بغداد کی تباہی

بالآخر یہ وحشی عالمِ اسلام کو زیر و زبر کرتے، خون کے دریا بہاتے، اور آگ لگاتے [illegible] چکا تھا

---

[1] [illegible]

سے پہلے ہلاکو خان کی سرکردگی میں دنیائے اسلام کے دارالخلافت اور اس عصر کے سب سے بڑے علمی مرکز اور متمدن شہر بغداد میں داخل ہوئے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، بغداد کی تباہی اور مسلمانوں کے قتل عام کی تفصیل طویل اور بہت دردناک ہے، کچھ اندازہ ان مؤرخین کے بیانات سے ہوگا جنہوں نے اس حادثہ کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس کی تفصیلات دیکھنے والوں سے سنیں، مؤرخ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"بغداد میں چالیس دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا، چالیس دن کے بعد یہ گلزار شہر جو دنیا کا پُر رونق ترین شہر تھا ایسا ویران و تاراج ہوگیا کہ خال خال ہی آدمی دکھائی دیتے تھے، بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے کہ ٹیلے نظر آتے تھے، ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں اور سارے شہر میں بدبو پھیل گئی جس سے شہر کی ہوا خراب ہوگئی اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر شام تک پہنچا، اس بدہوائی اور وبا سے بکثرت مخلوق مری، گرانی، وبا اور فنا تینوں کا دور دورہ تھا۔[1]

شیخ تاج الدین السبکی لکھتے ہیں:۔

"ہلاکو خان نے خلیفہ بغداد مستعصم کو ایک خیمہ میں اتارا، العلقمی نے علماء و اعیان شہر کو دعوت دی کہ خلیفہ اور ہلاکو کے صلح نامہ پر گواہ بنیں، وہ آئے تو ان سب کی گردن اڑا دی گئی، اسی طرح ایک ایک گروہ کے بعد دوسرے کو بلایا جاتا اور اس کی گردن اڑا دی جاتی، پھر خلیفہ کے متعلقین و مقربین کو بلا لیا اور ان کو بھی قتل کر دیا۔ خلیفہ کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ اگر اس کا خون زمین پر گرا تو کوئی بڑی آفت آئے گی، ہلاکو کو تردد تھا، نصیر الدین طوسی نے کہا کہ یہ مشکل آسان ہے، خلیفہ کا خون نہ بہایا جائے بلکہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۰۳ [2] ایک ایرانی فاضل مدرس رضوی نے ۱۳۳۴ ہجری شمسی میں خواجہ نصیر الدین طوسی پر تحقیقی کتاب لکھی جو تہران یونیورسٹی سے شائع ہوئی ہے اس میں بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، حتیٰ کہ کتاب کے ایرانی مصنف نے بھی نصیر الدین طوسی کو اس واقعہ کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

طوسی کی سب سے بڑی سیاسی چال جو بالآخر قتل کا سبب بنی، یہ تھی کہ ہلاکو کو اس نے خلافت عباسیہ کے ختم کرنے پر ابھارا اور قصر خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجوا دی، ہلاکو خود بھی اپنے جلال کے باوجود اس کی طرف سے اس پر آمادہ تھا کہ خلیفہ کے متعلق

(باقی صفحہ ۳۱۹ پر)

دوسری طرح اس کی یوں بیان کی جاتی ہے کہ اس کو نمدے میں لپیٹ دیا گیا ٹھوکروں اور لاتوں سے اس کو ختم کر دیا گیا۔

بغداد میں ایک مہینہ سے زیادہ قتل عام جاری رہا اور صرف وہی بچ سکا جو چھپا رہا کہا جاتا ہے کہ ہلاکو نے مقتولین کو شمار کرایا تو ۱۶ لاکھ مقتول شمار ہوئے۔[1]

عیسائیوں کو حکم دیا گیا کہ علانیہ شراب پئیں اور سور کا گوشت کھائیں، اگرچہ رمضان کا زمانہ تھا مگر مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ شرکت کریں، مسجدوں کے اندر شراب انڈیلی گئی اور اذان کی ممانعت کر دی گئی، یہ وہ بغداد ہے جو جب سے آباد ہوا کبھی وہاں کفر نہیں ہوا تھا، وہاں وہ واقعہ پیش آیا جو کبھی تاریخ میں پیش نہیں آیا۔[2]

بغداد جو اور خرابیوں کے باوجود عالم اسلامی کا سب سے بڑا شہر، علوم و فنون کا مرکز، بڑے بڑے علماء و فضلاء کا مسکن اور دار الخلافت ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی آبرو تھا، اس کی بربادی نے تمام جہان کے مسلمانوں کو تڑپا دیا اور ہر طرف اس کا ماتم کیا گیا، شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے جو بغداد میں طالب علمی کر چکے تھے اور اس کی رونقیں دیکھے ہوئے

[illegible] یہ خلافت [illegible] کا آخری [illegible] خلیفہ مستعصم [illegible] کے پاس ہلاکو نے اطاعت کا حکم بھیجا [illegible] ہلاکو نے بغداد کا محاصرہ کیا [illegible] کے بہت معتقد تھے مؤید الدین ابن العلقمی [illegible] کے دربار میں تھا اس نے کہا کہ [illegible] خلافت [illegible] کھانا [illegible] ہو جائے گی [illegible] اور ایک عالم [illegible] ہلاکو نے [illegible] بغداد [illegible] قتل [illegible] ابن کثیر ج ۱۳ ص ۲۰۳ [illegible] مؤرخین نے مقتولین کی تعداد [illegible] بیان کی ہے

[2] ملخص طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۱۱۵

نے ایک پُر درد مرثیہ لکھا جس میں اس وقت کے تمام مسلمانوں کے زخمی دلوں کی ترجمانی ہے اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین بر زوال ملک مستعصم امیر المؤمنین
ای محمد گر قیامت می برآری سر ز خاک سر برآور وین قیامت در میان خلق بین
نازنینان حرم را خون خلق تا زمین ز آستان بگذشت و ما را خون دل از آستین
زینهار از دور گیتی و انقلاب روزگار در خیال کس نگشتی کانچنان گردد چنین
دیده بردار ای که دیدی شوکت بیت الحرام قیصران روم سر بر خاک و خاقان بر زمین
خون فرزندان عم مصطفی شد ریخته هم بر آن خاکی که سلطانان نهادندی جبین
دجله خونابست ازین پس گر نهد سر در نشیب خاک نخلستان بطحا را کند با خون عجین
روی دریا درهم آمد زین حدیث هولناک می توان دانست بر رویش ز موج افتاده چین
نوحه لایق نیست بر خاک شهیدان زانکه هست کمترین دولت مر ایشان را بهشت برترین
لیکن از روی مسلمانی و راه مرحمت مهربان را دل بسوزد بر فراق نازنین

بغداد کے بعد تاتاریوں نے حلب کا رخ کیا، اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق اس کے ساتھ بھی بغداد کا سا سلوک کیا، وہاں سے دمشق کی طرف بڑھے، اور بآسانی ۶۵۸ھ میں اس پر قبضہ کر لیا جیسا کہ اہل نے تاتاریوں کا شہر سے نکل کر استقبال کیا اور ان کو تحائف پیش کئے اور ان کے حاکم کے پاس سے فرمان لے کر آئے، اور شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے، ابن کثیر جو خود دمشق کے رہنے والے تھے اس واقعہ کی تصویر کھینچتے ہیں جس سے مسلمانوں کی بے بسی، ذلت و کمزوری کا اندازہ ہوتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

انکار ہے تھے [illegible] کرتے تھے۔ [illegible] دین [illegible] کا دین [illegible] اور اسلام اور اہل اسلام کی
صاف صاف مذمت کرتے تھے ان کے ہاتھوں میں شراب کے برتن ہوتے تھے جس جگہ کے پاس سے گزرتے ان کے
دروازوں پر شراب [illegible] کی [illegible] کرتے [illegible] اور بازار
میں جو شخص [illegible] اس کو [illegible] صلیب کو [illegible] یہاں تک کہ [illegible] گئے
اور ان کو [illegible] کھڑے ہو کر [illegible] نصرانیت کی [illegible]
اور دین اسلام اور اہل اسلام کی مذمت کی۔

ابن کثیر ذیل المرآۃ کے حوالہ سے آگے لکھتے ہیں:۔

"مسلمان [illegible] ان کی [illegible] تاتاریوں [illegible]
[illegible] مسجدوں [illegible] جب شہر [illegible] واقعات [illegible] تو سلطان [illegible]
جمع ہو کر [illegible] تاتاری [illegible] سلطان [illegible]
[illegible] اور [illegible] لوگوں کی اہانت کی گئی [illegible]"

شام کے قبضہ کے بعد تاتاریوں کا رخ قدرتی طور پر مصر کی طرف تھا اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا جو ان کی غارت گری سے بچا ہوا تھا۔ سلطان مصر الملک المظفر سیف الدین قطز کو معلوم تھا کہ اب مصر کی باری ہے اور تاتاریوں کی چڑھائی کے بعد ملک کی حفاظت مشکل ہے اس نے مناسب سمجھا کہ وہ مصر میں مدافعت کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کرے چنانچہ ۲۵ رمضان ۶۵۸ھ کو عین جالوت کے مقام پر تاتاری اور مصر کی اسلامی افواج کا مقابلہ ہوا اور سابق تجربوں کے بالکل خلاف تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی وہ بری طرح سے بھاگے مصریوں نے ان کا تعاقب کیا اور کثرت سے ان کو قتل کیا اور بڑی تعداد میں گرفتار۔

سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں:۔

البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۲۱،۲۲۰

تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی اور یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ سلطان نے ان پر فتح پائی، تاتاریوں کا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ اس طرح سراسیمہ ہو کر بھاگے کہ کسانوں کی جمعیت بھی آسانی سے ان کو پکڑ لیتی تھی اور قتل کر دیتی تھی[1]

عین جالوت کے معرکہ کے بعد سلطان ملک الظاہر بیبرس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی اور سارے ملک شام سے ان کو بے دخل اور خارج کر دیا اور اس طرح وہ کہاوت غلط ثابت ہوئی کہ تاتاریوں کی شکست ممکن نہیں۔

تاتاریوں میں اشاعت اسلام

قریب تھا کہ سارا عالم اسلام اس سیلاب بلا میں بہہ جائے اور جیسا کہ اس وقت کے اہل نظر اور دردمند مسلمان مصنفین نے خطرہ ظاہر کیا ہے اسلام کا نام و نشان بھی مٹ جائے کہ دفعۃً تاتاریوں میں اشاعت اسلام شروع ہو گئی اور جو کام مسلمانوں کی شمشیریں اور مسلمان بادشاہ نہ کر سکے وہ اسلام کے داعیوں اور خدا کے مخلص بندوں نے انجام دیا۔ اور خود اسلام نے اپنے خون آشام دشمنوں کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔

تاریخ کے عجیب ترین واقعات اور حقائق میں سے اس ناقابل تسخیر قوم کا اسلام سے مسخر اور مسلمانوں کے فاتح کا اسلام سے مفتوح ہو جانا ہے۔ تاتاریوں کا ایک سال کے عرصہ میں برق و باد کی طرح وسیع اسلامی دنیا پر چھا جانا اور عالم اسلام کو بزور شمشیر فتح کر لینا اتنا عجیب واقعہ نہیں اس لئے کہ ساتویں صدی کا عالم اسلام ان بیماریوں اور کمزوریوں کا شکار تھا جو بالعموم تمدن و تہذیب کی انتہائی ترقی کے بعد قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں اور ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں اس کے بالمقابل تاتاری تازہ دم، جفاکش، بدوی زندگی کے عادی اور خون آشام تھے لیکن عجیب واقعہ اور تاریخ کا معمہ یہ ہے کہ اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں

---

[1] البدایہ والنہایہ [illegible]

ہیں تو وحشی قوم اپنے فتوحات اور بے بست و پا مسلمانوں کے دین کی طاقت کو شکست نہیں دی گئی جو ان کی ہر قسم کی مادی و سیاسی طاقت کھو چکا تھا اور جس کے پیروؤں کو یہ تاتاری سخت ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ اپنی مشہور کتاب دعوت اسلام (PREACHING OF ISLAM) میں اس تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> لیکن اسلام اپنی گذشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے پھر اٹھا اور مبلغین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنہوں نے مسلمانوں پر روح فرسا ظلم ڈھائے تھے مسلمان کر لیا۔ یہ کام نہایت ہی مشکل تھا کیونکہ یہاں پر ایک دو مذہب ایسے تھے جو اس کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا معتقد بنائیں یہ حالت کچھ عجیب و غریب سی تھی کہ بدھ مذہب اور عیسائی مذہب اور اسلام اس جدوجہد میں لگے ہوئے تھے کہ ان ظالم اور مغرور فاتحین کے دلوں کو جنہوں نے ان مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا اپنا مطیع بنائیں[1]
>
> اسلام کے لئے ایسے وقت میں جبکہ بدھ مذہب اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے بچا کر اپنا پیرو بنانا اس لئے اہم تھا کہ جس بے رحمی سے ان کے جنود نے مغلوں کے ہاتھوں ہلاکت سے مسلمانوں کے برابر کسی نے نقصان نہ اٹھایا تھا۔ وہ شہر جو بہت مشہور تھے ایک زمانہ میں اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھے اور جہاں ایشیا کے ارباب علم و فضل آباد تھے اکثر خاک کر دیئے گئے تھے مسلمانوں کے عالم اور فقیہ یا تو قتل کر دیئے گئے یا ان کو غلام بنا لیا گیا۔ قاآن جو اسلام کے سوا اور سب مذہبوں پر مہربان تھے اسلام کے ساتھ مخالفت رکھتے اور اس کی نفرت اور عداوت رکھتے تھے۔ چنگیز خان نے حکم دیا تھا کہ جو لوگ جانوروں کو شریعت کے مطابق

---

[1] دعوت اسلام (ترجمہ مولوی عنایت اللہ) صفحہ ۲۴۰ [2] مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کئے کہ جن کا تصور بھی ... عجیب ... پر برعکس کی تصویر دیکھاتے ہیں تو ایک تصویر یہ سفید ... ایک بڑھا آدمی آتا ہے جس کی گردن گھوڑے کی دم سے بندھی ہوتی ہے اور گھوڑا اس کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مغلوں کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزار پہنچائے (... صفحہ ۱۹۸)

نہ کریں ان کو قتل کر دیا جائے، اسی حکم کو [illegible] نے اپنے زیر اثر [illegible] جاری کیا اور اس کا یہ

کہ سب گرجا اور عبادت خانے [illegible] ہو گئے، اس طرح ساٹھ برس تک مسلمانوں کو سخت محنت

آزار پہنچانے کے بعد [illegible] دولت جمع کر لی اور [illegible] آزاد ہونے کے لئے آپس میں [illegible]

[illegible] کل انتظام سلطنت و مالیات وزیر کے

سپرد کر رکھا تھا مسلمانوں کو [illegible] خان نے بھی جو [illegible] ایلخان [illegible] ہوا اسلام

قبول کیا اور [illegible] اپنا نام احمد رکھ لیا

باوجود ان مشکلات کے تتار اور وحشی قوموں نے جو مغلوں کے ساتھ آئیں انہی مسلمانوں کا مذہب قبول

کیا جن کو انھوں نے اپنے پیروں میں روندا تھا۔[3]

یہ واقعہ جتنا عجیب اور عظیم الشان ہے اتنا ہی یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تاریخ میں اس کی تفصیلات اور جزئیات بہت کم ملتی ہیں اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پایا ان کا تاریخ کے دفتر میں بہت کم سراغ ملتا ہے جن مخلصین نے اس خوں آشام تاتاری قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا ان میں بہت کم لوگوں کا نام دنیا کو معلوم ہے مگر ان کا یہ کارنامہ تاریخ اسلامی کا زریں کارنامہ ہے کہ جس کا احسان نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ پوری انسانیت پر قیامت تک رہے گا کہ انھوں نے دنیا کو وحشت و بربریت سے محفوظ کر کے ایک ایسی قوم کی قیادت میں دے دیا جو تہذیب و تمدن کی پرستار اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی علمبردار تھی۔

چنگیز خاں کی سلطنت انتقال کے بعد اس کے چار بیٹوں کی چار شاخوں میں بٹ گئی تھی ان چاروں شاخوں میں اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی اور تاتاری خاقان اور ان کی دعوت و تبلیغ اور اثر سے تاتاری قوم مسلمان ہونا شروع ہو گئی یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر اندر تقریباً ساری تاتاری قوم مسلمان ہو گئی

---

[1] [illegible] ۱۲۲۱ [illegible] یہ کہنا کافی ہے کہ [illegible] عیسائی آبادی [illegible] اور اس کی [illegible]

[illegible] ص ۱۱۵ [2] [illegible] ص ۳۲۵ [3] دعوت اسلام ص ۱۳۲-۱۳۳

پروفیسر آرنلڈ نے دعوت اسلام میں اس کے چند چند واقعات لکھے ہیں۔ چنگیز خاں کے بڑے بیٹے جوجی خاں کی نسل میں جو سلطنت کے مغربی حصہ سیر اردو پر حکمران تھی، اشاعت اسلام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:۔

"مغلوں کا پہلا بادشاہ جو مسلمان ہوا، وہ برکہ خاں تھا جو ۱۲۵۶ء سے ۱۲۶۷ء تک سیر اردو کا خان رہا۔[1] اس بادشاہ کے مسلمان ہونے کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ایک دن وہ ایک کاروان میں جا ملا جو بخارا سے آرہا تھا۔ اس میں دو مسلمان تاجر تھے جن کو برکہ خاں الگ لے گیا اور اسلام کے متعلق کچھ سوالات ان سے کئے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب کے احکام و ارکان اس خوبی سے بیان کئے کہ امیر اردو کو مسلمان ہونے کا شوق پیدا ہوا اور وہ اسلام لایا۔ اس کا حال برکہ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی سے بیان کیا، اور اس کو بھی اسلام قبول ..... کرنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد برکہ خاں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا[2]۔ اسلام قبول کرنے کے بعد برکہ خاں نے سلطان مصر رکن الدین بیبرس سے معاہدت کر لی اور اس معاہدت کا باعث تو سلطان مصر اس طرح ہوا کہ اس نے سیر اردو سے آئے ہوئے مغلوں کی جماعت کی خاطر مدارات کی۔ ان مغلوں کا قصہ یہ ہے کہ جب خان سیر اردو اور برکہ خاں باہم جنگ ہوئی اور عداوت زیادہ بڑھی تو یہ دو سو مغل جو ہلاکو خاں کی فوج میں بھرتی تھے بھاگ کر شام کے ملک میں چلے آئے اور یہاں سے وہ بڑے اعزاز کے ساتھ قاہرہ پہنچائے گئے جہاں ان کو ابھرنے ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی[3]۔ سلطان رکن الدین بیبرس نے ان مغلوں میں سے دو سو آدمیوں کے ساتھ اپنے چند سفیر کئے اور برکہ خاں کو ایک خط ان کی معرفت روانہ کیا۔ جب یہ لوگ سیر اردو سے قاہرہ کو واپس آئے تو سلطان کو خبر دی کہ برکہ خاں کے امیروں کے [؟] اور ایک شہزادی کے ایک ایک امام اور موذن مقرر ہے اور بچوں کو مکتب میں قرآن پڑھایا جاتا ہے[4]۔ سلطان سے انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب ہم قاہرہ سے

---

[1] شیخ نجم الدین مختار الزاہدی نے برکہ خاں کے لئے ایک کتاب لکھی جس میں رسالت کو ثابت کیا اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مناظروں کا حال لکھا ہے۔ [2] ابو الفداء [illegible] [3] مقریزی [illegible] [4] ایضاً [illegible]

روانہ ہوئے تھے تو راستہ میں برکہ خان کے سفیر سے[1] جو سلطان مصر کی خدمت میں یہ اطلاع کرنے کے لئے مامور ہوئے تھے کہ برکہ خان اور اس کی رعایا مسلمان ہو گئی ہے۔ فوراً جب سلطان رکن الدین اور برکہ خان میں باہم اتحاد پیدا ہو گیا تو بہت سے تاتاری مصر میں آئے جہاں ان کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب ہوئی۔[2]

تاتاری سلطنت اور تمدن چنگیز خان کی دوسری شاخ دولت ایلخانیہ میں اشاعت اسلام کے متعلق آرنلڈ لکھتا ہے:-

"ایران میں جہاں ہلاکو خان دولت ایلخانیہ کا بانی ہوا تھا اسلام کی اشاعت رفتہ رفتہ ہوئی [illegible] کا بیٹا تکودار جو اپنے بھائی اباقا خان کا جانشین ہوا دولت ایلخانیہ کا پہلا بادشاہ تھا جس نے اسلام قبول کیا۔ ایک عیسائی مصنف نے لکھا ہے کہ تکودار کی تعلیم و تربیت عیسوی مذہب پر ہوئی تھی بچپن میں اس کو اصطباغ دیا گیا تھا اور نکولس اس کا نام رکھا گیا تھا لیکن تکودار جب بڑا ہوا تو اس نے مسلمانوں کے ذریعے جن کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا عیسائی مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا۔ وہ سلطان احمد کے نام سے موسوم ہوا اور جس قدر ہو سکا اس بات کی کوشش کی کہ سب تاتاری اسلام اختیار کریں اور اس کے لئے انعام و اکرام اور منصب و عزت [illegible] نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے زمانہ میں بہت تاتاری مسلمان ہو گئے۔ اس بادشاہ نے سلطان مصر کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر دی [illegible]۔"

مغول قوت و سلطنت کے اقبال سے سلطان احمد تکودار بادشاہ [illegible] خدا نے اپنی عنایت اور ہدایت کی روشنی سے تاتاری زوال کے زمانہ میں [illegible] اولوالعزمی اور روحانیت کا اقرار کرنے اور [illegible] کی نسبت [illegible] کو مذہب اسلام قبول کرنے کے لئے

---

[1] [illegible] [2] دعوت اسلام [illegible] [3] [illegible] سلطان [illegible] منتخب ہونے کے بعد [illegible]

[illegible] [4] [illegible]

کھول دیا ہے ہم اس وقت سے آزاد ملک دین کابل یا ترکیہ اور دوسرے اسلامی سلطنتوں کی سعادت کی صلاح کرنے چاہتے ہیں یہاں تک کہ والد بزرگوار اور برادر بزرگ کی طرف سے حکمرانی کی نوبت ہم تک پہنچی اور خدا نے اپنی مہربانی سے ہماری امیدوں کو پورا کیا اور حکومت و سلطنت ہم کو عنایت کی بعد جلوس اور دوران مبارک میں جس سے مجلس ہوا ہے جس میں تمام بھائی بند اور شہزادے اور چھوٹے بڑے ہر ایک قوم کے سردار مشورہ کرنے کے لئے بیٹھے ہیں سب نے منظور کیا اور فیصلہ کیا کہ ہمارے برادر بزرگ کے حکم سے قرض کشی کو رہائی کیا جائے اور دنیا میں ترقی ہو سکے جو کہ کثرت سے زمین پیداوار وسیع ہونے کے تنگ ہے اور جس کا محصول اور حیثیت سب کی ایک تنخواہ ہو تقریر ہوئی کہ ہم نے کہا کہ جہاں تک ہو خلق میں سے وارد کیا جائے اور یہ فوج کشی کے لئے مضبوط ارادہ کے ساتھ ہو جس کے سامنے جو بہتر جھک جاویں اور جنگ غازی کے پیمان پر تیار ہوویں ہم نے اس مقصد پر عمل کیا جس پر ان کے لوازمے پہنچے اور ان کی رائے متفق تھیں اور ان سب کا خلاصہ جو معلوم ہوا وہ اس امر کی کے خلاف تھا جس کے بارہ کرنے کا ہم ارادہ رکھتے تھے اور جس سے مراد یہ ہے کہ شعائر اسلام کو زندہ کیا جائے اور جو احکام ہمارے حضرت کے جاری ہوں ان سے خونریزی دور ہو اور دنیا کی معیشت ہو اور دنیا کے اطراف میں امن و امان پیدا ہو چلے اور تمام شہروں کے حاکم ہماری شفقت اور مہربانی سے آرام پاتے ہیں کیونکہ ہم خدا کی تعظیم کرتے ہیں اور خدا کی مخلوق پر مہربان ہیں اس لئے خدا نے ہمارے دل میں الہام کیا کہ ہم مستحق آگ کو بجھائیں اور فتنہ و فساد کو دور کریں اور جن لوگوں نے ہمارے دلی بھائی ان کو اس تدبیر سے شفیع کریں جس سے دنیا کی بیماریاں اور تکلیفیں دور ہونے کی امید ہے اور جن کو سب سے پہلے عمل میں لائیں گے ہر ایک قوم کی ظلم سے بچنے کی خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے اس لئے ہم بیگانوں کو جنگ میں لانے اور ان کو ان پر چڑھا لانے میں جلدی نہیں کرتے ہیں اور جب تک حق بات ظاہر نہ ہو جاوے تو ہم اس کی اجازت نہیں دیتے شیخ الاسلام قدوۃ العلماء کی نصیحت سے جو امور دینی میں ہمارے سب سے بہتر مددگار ہیں ہمارے اس ارادہ کو جو فلاح و بہبودی کی خواہش پر مبنی ہے اور اس رائے کو جس سے کامیابی کی امید ہے پختہ ارادہ مستحکم کر دیا چنانچہ ہم نے ایران

عطا کیا جو ساتھ والوں کے لئے خدا کی رحمت اور ستانے والوں کے لئے خدا کا عذاب ہے۔ ہم نے اس قرآن کے ماننے والوں کے لئے قاضی القضاۃ قطب الدین شیرازی کی ہدایت ایک ہزار علماء دین کو جو اس سلطنت کے [illegible] مقرر کیا ہے تاکہ لوگوں کو ہمارے طریقہ سے واقف کریں اور تمام مسلمانوں کے فائدہ کے لئے جو باتیں ہمارے دل میں پوشیدہ ہیں سب اس سے آگاہ ہوں نیز ان سب لوگوں کو اس بات سے مطلع کریں کہ خدا نے ہم کو بصیرت و ہدایت عطا کی ہے اور اسلام بھی تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے جو مسلمان ہونے سے پہلے وقوع میں آئے ہوں اب تو خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ ہم حق کا اور باطل [illegible] پیروی کریں جیسا کہ لوگوں کے واسطے دلیل کی تجویز کیا جائیں جن سے وہ ہم پر بھروسہ کر سکیں اور ایسی محبت طلب کرتے ہیں جس سے کامیابی کی امید کر سکیں تو وہ ہماری ان تمام فضیلتوں پر نظر ڈالیں جو دنیا میں عام طور پر مشہور ہو چکی ہیں کیونکہ ہم نے خدا کی ہدایت سے دین کے مخالفوں کو قتل کیا ہے اور ہر ایک حکم جاری کرنے میں اس امر کو پیش نظر رکھا ہے اور شریعت محمدی کے قوانین کو جاری کیا ان کی عظمت اور بزرگی کے ساتھ مختلف خدمات پر جاری کیا ہے ہم نے تمام رعیت کے دلوں کو خوش کیا ہے اور جن سے پہلے کوئی برائی یا خطا سرزد ہوئی تھی ان سب کو ہم نے معاف کر دیا ہے کہ خدا کی مخلوق کی غلطیوں کو معاف کرتے ہیں ہم نے مسلمانوں کے اوقاف کی آمدنی میں اضافہ کیا اور مقبرے اور مدرسے تعمیر کرائے اور مساجد کی مرمت کرائی ہے اور تمام تعمیرات خانقاہیں اور مسافروں کی [illegible] کے مقامات سب گر گئے تھے دوبارہ آباد کئے ہیں اور اوقاف کی آمدنی کو ان کے قدیم دستور [illegible] کرنے والوں کے شرائط کے موافق مستحقوں تک پہنچایا ہے ہم نے حکم دیا ہے کہ تمام حاجیوں کے ساتھ بہتر سلوک کریں اور ان کے لئے سامان سفر مہیا کریں اور جن راستوں سے وہ سفر کرتے ہیں ان کو آباد اور بے خطر رکھیں اور حاجیوں کے قافلے کو بآرام تمام روانہ کریں ہم نے تمام سوداگروں کو جو ملک میں آمد و رفت رکھتے ہیں پوری آزادی عطا کی ہے کہ وہ اپنے سامان تجارت جہاں چاہیں لے جائیں۔ وہ فروخت اور قزاقوں اور رہزنوں کو جو ملک کے اطراف میں لوٹ مار میں مصروف رہتے تھے [illegible] سوداگروں کی آمد و رفت میں کسی طرح کی مزاحمت کرتے تاکہ شہروں ملک

آباد ہو رہے تھے اور فضا اور زمینوں نیز خوارزم بیاباں میں بھی بدستور اور تمام اطمینان سے آرام و آسائش سے بسر کر رہا اور مسلمانوں کی گردنیں ذلت و خواری کے طوق سے نکل جائیں[1]

تاریخ مغلیہ کے اوراق میں کوئی عہد ہلاکو اور تیمور کے کشت و خون کے ہنگاموں کو پڑھنے کے بعد جو مغل اور تاتاریوں نے برپا کئے، اس فرمان کے مطالعہ کرنے سے بہت راحت معلوم ہوتی ہوگی اور تعجب ہوتا ہوگا کہ ایک مغل فرمانروا کی زبان سے بھی اس قدر رحم دلی اور انسانی ہمدردی کے خیالات ادا ہوئے ہیں[2]

۱۲۸۴ء میں تگودار احمد کے خلاف ایک بغاوت برپا ہوئی جس کا سرغنہ ارغون خان تھا، تگودار کو اس نے قتل کیا اور خود مالک تخت و تاج بن گیا۔ ارغون کے عہد حکومت میں (۱۲۸۴ء تا ۱۲۹۱ء) جو چھ سال تک جاری رہا عیسائیوں پر سلطنت کی طرف سے مہربانی ہوئی اور مسلمانوں کو سختیاں اٹھانی پڑیں اور ان کو عہدوں اور نوکریوں سے وہ بیدخل کر دیئے گئے[3] ۱۲۹۵ء تک ارغون کے جانشین اپنے قدیم مذہب شامان کے پیرو رہے، لیکن ۱۲۹۵ء میں ارغون کا ساتواں بیٹا غازان خان جو خاندان ایلخانیہ کا سب سے زیادہ نامور اور پر سطوت بادشاہ ہوا، مسلمان ہو گیا اور اس نے اسلام کو ایران کا شاہی مذہب قرار دیا۔

مسلمان ہونے سے پہلے سلطان غازان کی تعلیم و تربیت بدھ مذہب پر ہوئی تھی اور خراسان میں اس بادشاہ نے بدھوں کے لئے مندر تعمیر کرائے تھے، بدھ مذہب کے عالموں کی صحبت سے وہ بہت خوش ہوتا تھا، اور یہ لوگ اس وقت دربار مغلیہ کو مرجع ہوتا تھا، ایران میں کثرت سے چلے آئے تھے[4] سلطان غازان کو مختلف مذہبوں کی تحقیق و تفتیش کا بڑا شوق تھا، اور ہر مذہب کے عالموں سے وہ مذہبی مباحثہ کرتا تھا[5] غازان کا وزیر اور اس کے عہد کا مورخ حکیم رشید الدین تھا، جس کا یہ خیال غالباً صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سلطان غازان سچی نیت اور عقیدہ سے مسلمان ہوا اور اپنے تمام زمانہ بادشاہی میں وہ اسلام کا سچا پابند رہا[6]

---

[1] ایضاً ص ۲۲۳، ۲۲۴ [2] دعوت اسلام ص ۲۲۴، ۲۵۱ [3] دعوت تبلیغ ص ۲۲۲، ۲۲۵ [4] دعوت اسلام ص ۱۲۸

[5] ایضاً ص ۲۳۰ [6] دعوت اسلام ص ۲۳۵

مورخ ابن کثیر نے بھی خاندان کے اسلام لانے کا ذکر ۶۹۴ھ کے واقعات میں بڑی مسرت کے ساتھ کیا ہے ایران کے اور دوسرے مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سہرا ایک مسلمان ترکی امیر توزون[1] کے سر ہے جن کی تلقین اور کوشش سے تاتاری سلطان نے اسلام قبول کیا۔ ابن کثیر ۶۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں۔

"اسی سال چنگیز خان کا پڑپوتا قازان بن ارغون بن ابغا بن تولی بن چنگیز خان تاتاریوں کا بادشاہ ہوا۔ امیر توزون رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر علانیہ مشرف باسلام ہوا اور تاتاری کل یا بیشتر اسلام میں داخل ہو گئے جس روز بادشاہ نے اسلام قبول کیا اس روز سونا چاندی اور موتی لوگوں کے سروں پر نچھاور کئے گئے اس نے اپنا نام محمود رکھا اور جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی بہت سے مندر اور گرجے گرائے گئے اور ان پر جزیہ مقرر کیا بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کی گئیں اور انصاف کیا گیا لوگوں نے تاتاریوں کے ہاتھ میں تسبیحیں اور حمائلیں دیکھیں اور اللہ کے فضل و احسان کا شکر ادا کیا۔"[2]

"آرنلڈ لکھتا ہے کہ ۷۰۳ھ میں خاندان کا آٹھواں سلطان الجایتو محمد خدابندہ کے نام سے تخت ایران پر بیٹھا اس سلطان کی ماں عیسائی تھی اور بچپن میں اس کی تعلیم و تربیت عیسائی مذہب کے مطابق ہوئی تھی اور نکولس کے نام سے اس نے اصطباغ پایا تھا لیکن اس کے بعد بڑے ہو کر اپنی بیوی کے کہنے سے مسلمان ہو گیا ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ محمد خان یعنی سلطان خدابندہ کے مسلمان ہونے سے مغلوں میں بڑا اثر پیدا ہوا[3] غرض اس زمانہ سے قطعی طور ایلخانی ریاست میں اسلام سب مذہبوں پر غالب آ گیا۔"[4]

اس خاندان کی تیسری شاخ جو بلاد متوسطہ پر قابض تھی اور جس کا بانی چغتائی بن چنگیز خان تھا، اشاعت اسلام کی کیفیت بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے۔

"بلاد متوسطہ میں جو چغتائی ابن چنگیز خان اور اس کی اولاد کے حصہ میں آئے تھے دعوت اسلام کے ساتھ

---

[1] تاتاری اور دوسرے مورخین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ صفحہ ۳۴۰

[3] ابن بطوطہ ج ۲ صفحہ ۵۸ [4] دعوت اسلام صفحہ ۲۰۵

کا بڑا کام علماء نے اسی سلسلہ میں پہلا بادشاہ جس نے اسلام قبول کر لیا، ہلاکو خاں کا بیٹا اور چنگیز خاں کا پڑپوتا تھا اور جس نے تخت نشین ہونے کے کچھ دنوں کے بعد مسلمان ہو کر سلطان غیاث الدین (۱۲۸۲ء تا ۱۲۸۴ء) اپنا نام رکھا لیکن ایلخانی خاندان میں اسلام کی ترقی زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکی چونکہ ارغون خان کے مرنے کے بعد جو مغل سلطان ہوئے تھے انہوں نے بدھ مذہب اختیار کیا اور چودھویں صدی عیسوی کے شروع سے پہلے اس حالت کی اصلاح نہ ہو سکی۔ غازان خاں جس نے ۱۲۹۵ء سے ۱۳۰۴ء تک سلطنت کی جس وقت مسلمان ہوا تو چونکہ مغلوں نے عموماً اسلام قبول کر لیا اور جب ایک دفعہ انہوں نے اپنے بادشاہ کی طرح اسلام قبول کر لیا تو وہ ہمیشہ اسی پر قائم رہے لیکن اس سال میں بھی اسلام کا اور بدھ مذہب پر غالب آنا جو حریف مقابل تھے یقینی امر تھا کیونکہ چنگیز خان کے جانشینوں نے مسلمانوں کے اوپر ظلم و ستم کرنے شروع کر دیئے اور جب تک کاشغر کا بادشاہ جس کی ریاست چغتائیہ سلطنت کی تقسیم ہو جانے سے خود مختار ہو گئی تھی اسلام قبول نہیں کر لیا تھا اس وقت تک اسلام کی ترقی ممکن نہ ہوئی۔ سلطان کاشغر کے مسلمان ہونے کی نسبت جس کا نام تغلق تیمور خان (۱۳۴۷ء تا ۱۳۶۳ء) تھا لکھا ہے کہ بخارا سے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کاشغر میں آئے اور انہوں نے تغلق تیمور کو مسلمان کیا۔ شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی سفر میں تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکارگاہ کی زمین پر سے ان کا گذر ہوا۔ بادشاہ نے اس قصور پر ان سب لوگوں کی مشکیں کسوا کر اپنے روبرو طلب کیا اور نہایت غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہماری زمین پر بے اجازت داخل ہوئے۔ شیخ نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں اجنبی ہیں اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کی ممانعت ہے۔ بادشاہ کو جب معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایرانی سے تو کتا بہتر ہوتا ہے۔ شیخ نے کہا کہ سچ ہے اگر دین حق ہمارے پاس نہ ہوتا تو البتہ ہم کتے سے بھی بدتر تھے۔ یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیرت زدہ ہو گیا اور

ابوالحسن ندوی، [illegible] ص 155

تھی کہ جب ہم سلطنت [illegible] ایسی [illegible] ہوں [illegible] سامنے [illegible] جائیں تو ہماری [illegible]

لیکن شیخ جمال الدین کو مخاطب ہو کر کہا کہ آج کچھ اس وقت [illegible] کو اب [illegible] تم ہمارے پاس

مطالب بیان کریں گے۔ شیخ نے اسلام کے احکام اور ارکان کو ایسے جوش سے بیان کیا کہ خان کا دل جو پہلے پتھر تھا

اب موم کی طرح نرم ہو گیا۔ شیخ کے بیانات کا اثر ہوا جس سبب سے اس نے کہا کہ بار بار اپنی غلطیوں سے اب تک

بے خبر رہا ہے تاہم مجھے یقین ہو گیا ہے لیکن اگر میں اس وقت اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں گا تو پھر

رعایا کو راہ راست پر نہ لا سکوں گا اس لئے کچھ دن صبر کیجئے جب میں اپنے باپ کے تخت اور ملک کا

مالک ہو جاؤں تو آپ میرے پاس آئیے گا [illegible] سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی تھی

اور [illegible] کے قبضہ میں ہو [illegible] قابل ہوا کہ ان سب ملکوں کو [illegible] متحد کر کے ایک سلطنت

قائم کرے۔ اسی عرصہ میں شیخ جمال الدین اپنے وطن کو چلے گئے۔ اور وہاں سخت بیمار پڑے جب موت کا وقت

قریب آیا تو اپنے بیٹے رشید الدین سے کہا کہ تغلق تیمور ایک روز بڑا بادشاہ ہوگا تم اس وقت اس کے پاس جانا

اور میرا سلام پہنچا کر بے خوف و خطر بادشاہ کو یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا چند سال کے بعد تغلق

نے باپ کا تخت حاصل کر لیا [illegible] رشید الدین بادشاہ کے [illegible] پہنچے تاکہ اپنے باپ کی وصیت کو پوری کرے

لیکن [illegible] دربار [illegible] پہنچ کر [illegible] کوشش [illegible] ملاقات نہ ہو سکی آخر ایک دن

علی الصباح تغلق کے خیمہ کے قریب [illegible] اذان دینی شروع کی [illegible] خواب [illegible] خلل ہوا اس نے رشید الدین کو

اپنے سامنے بلوایا رشید الدین نے باپ کا پیغام تغلق کو سنایا تغلق [illegible] اپنے وعدہ کا خیال تھا

[illegible] مسلمان ہو گیا اس کے بعد [illegible] اسلام کی اشاعت کی اور اس کے زمانہ میں

[illegible] کا مذہب اسلام ہو گیا [illegible] خان [illegible] کی سلطنت میں رہتے تھے[1]

بعض مؤرخین کے تذکروں میں یہ روایت اس طرح منقول ہے کہ تغلق تیمور نے اپنے [illegible]

---

[1] دعوت اسلام [illegible] آرنلڈ [illegible]

کی طرف اشارہ کرکے کمالِ حقارت سے شیخ جمال الدینؒ سے پوچھا کہ یہ بہتر ہے کہ تم بہتر ہو؟ شیخ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ اگر میں دنیا سے ایمان کے ساتھ چلا گیا تو میں بہتر ہوں ورنہ یہ کتا۔ تغلق تیمور کے دل میں یہ بات چبھ گئی اور اس نے اس کی تفصیل دریافت کی اور پوچھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ شیخ نے ایمان کی حقیقت بیان کی، اس پر تغلق تیمور نے اس سے خواہش کی کہ اس کی تخت نشینی کے بعد وہ اس کو اپنی زیارت سے مشرف کریں اور پھر وہ واقعہ پیش آیا جو اوپر مذکور ہوا۔ بہر حال اتنا محقق ہے کہ تغلق تیمور کے اسلام لانے اور بالواسطہ کاشغر اور سلطنت چغتائیہ میں اسلام کی اشاعت کا ظاہری سبب شیخ جمال الدینؒ ہی کے دل سے نکلے ہوئے ایک فقرے نے اور ان کی قوت ایمانی اور اخلاص و درد نے وہ کام کیا جو ہزاروں تقریریں اور لاکھوں شمشیریں نہیں کر سکتیں۔ جزاہ اللہ عن الاسلام و اہلہ خیر الجزاء۔

چنگیز خاں کی چوتھی شاخ کے متعلق (جس کا بانی اوگتائی خاں تھا اور جس میں منگو خاں اور قوبلائی خاں جیسے نامور فرمانروا گذرے ہیں اور جو تاتاری سلطنت عظمیٰ کے مشرقی حصہ پر قابض تھی) آرنلڈ لکھتا ہے:-

> "تمام سلطنت مغلیہ میں ہر جگہ ایسے مسلمان موجود تھے جو کوشش کرتے تھے کہ مغلوں کو مسلمان کرلیں۔ قوبلائی خاں (۱۲۵۷ء تا ۱۲۹۴ء) کے عہد میں حاکم ایران کرگز نامی کا حال لکھا ہے کہ وہ اول بدھ مذہب کا پیرو تھا، پھر اس نے یہ مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا۔ تیمور خاں کے زمانہ میں (۱۲۹۴ء تا ۱۳۰۷ء) انندا نے جو قوبلائی خاں کا پوتا تھا اور چین میں صوبہ تنگوت کا حاکم تھا، اسلام قبول کیا اور تنگوت میں اس نے بہت لوگوں کو مسلمان کیا بلکہ جو فوج اس کے تحت میں تھی اس کے بھی اکثر لوگ مسلمان ہو گئے۔ تیمور خاں نے انندا خاں کو اپنے دربار میں بلایا اور کوشش کی کہ انندا خاں اسلام چھوڑ کر بدھ مذہب قبول کرے لیکن اس نے انکار کیا اور قید میں بھیج دیا گیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد انندا خاں قید سے رہا کر دیا گیا کیونکہ حکومت کی رعایا جس کو اپنے حاکم کے ساتھ بہت الفت تھی بغاوت پر آمادہ ہو چلی تھی"[۲]

---

[۱] دیکھو ص ۲۱۲ [۲] ایضاً از ص ۲۴۳ ۔ ۲۴۵

غرض اس طرح پوری تاتاری قوم جس نے پورے عالم اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا تھا اور جس کے سامنے کوئی اسلامی طاقت ٹھہر نہیں سکتی تھی، چند برس کے عرصہ میں اسلام کی حلقہ بگوش بن گئی اور اسلام نے دوبارہ اس کا ثبوت دیا کہ اس کو اپنے دشمنوں کو تسخیر اور اپنے دام محبت میں اسیر کرنے کی عجیب و غریب قدرت حاصل ہے۔ تاتاری نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ ان میں بڑے بڑے مجاہد، عالم اور فقیہ اور بڑے بڑے باخدا درویش پیدا ہوئے اور انہوں نے بہت سے نازک موقعوں پر اسلام کی پاسبانی کا فرض بھی انجام دیا۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

* * *

مولانا جلال الدین رومیؒ

علم کلام و عقلیت کا بحران

ساتویں صدی میں سارا عالم اسلام علم کلام کے مسائل و مباحث سے گونج رہا تھا، جو شخص علم کلام کی اصطلاحات اور معتزلہ و اشاعرہ پھر اشاعرہ و حنابلہ کے مختلف فیہ مسائل سے واقف نہیں ہوتا تھا، وہ پڑھا لکھا انسان نہیں سمجھا جاتا تھا، اسی صدی کی ابتداء میں (۶۰۶ھ میں) امام رازی نے انتقال کیا تھا، جنھوں نے علم کلام کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا تھا کہ اس کی صدائے بازگشت کے علاوہ کوئی آواز سننے میں نہیں آتی تھی، عالم اسلام کے علمی و فکری حلقے استدلال و قیاس کے خوگر تھے، کسی شئی کا وجود، کسی چیز کی حقیقت، دین کا کوئی عقیدہ اس وقت تک قابل تسلیم نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ اس کو عقلی دلائل، منطقی ترتیب اور فلسفیانہ مقدمات سے ثابت نہ کر دیا جاتا۔

متکلمین اشاعرہ نے عام زندگی میں اگرچہ معتزلہ اور فلاسفہ پر فتح حاصل کر لی تھی اور ان کے علم کلام کے مقابلہ میں اعتزال و فلسفہ کی آواز پست ہو چکی تھی، لیکن اعتزال کی روح اور عقلیت خود اپنے فاتحین کو مفتوح بنا چکی تھی، اشاعرہ کے علم کلام میں معتزلہ کی عقلیت پرستی کی روح سرایت کر گئی تھی، انھوں نے بھی عقل کو اتنی وسعت دے دی تھی کہ وہ ذات و صفات کے نازک اور ورائے عقل (نہ کہ مخالف عقل) مسائل و تفصیلات میں آزادانہ بحث کر سکے، انھوں نے بھی ظواہر و محسوسات کو ذہنی حد

فیصلہ کن سمجھا جاتا تھا، انھوں نے بھی دینی مسائل کے ثبات اور حقائق شرعیہ کے وجود کی بنیاد استدلال و قیاس پر رکھی تھی۔

اس کا نتیجہ تھا کہ تمام عالم اسلام پر ایک لفظی و استدلالی ذوق غالب تھا، علم کلام نقل و عقل پر حاوی ہو کر رہ گیا تھا، جس پر عرصہ سے کوئی جدت پیدا نہیں کی جا سکی تھی، اس کے حلقہ میں مدتہائے دراز سے امام ابوالحسن اشعری یا حجۃ الاسلام غزالی سا مجتہد اور ذہین و طباع پیدا نہیں ہوا تھا، قیاس و استدلال کے غلو نے دماغوں کو خواہ کتنی ہی جولانی بخشی ہو، دلوں کی حرارت اور یقین کی روشنی کو نقصان پہنچایا تھا، متکلمین نے اپنی قوت استدلال اور مقدمات و نتائج کی آراستگی سے حریفوں کی زبانوں کو خاموش کر دیا تھا، لیکن وہ قلوب کو سکینت و ایمان، اور اہل شک و ارتیاب کو یقین و اذعان عطا کرنے میں ناکام رہے تھے، ان کے اس طریق بحث و استدلال نے دماغوں اور دلوں میں بیسیوں گرہیں ڈال دی تھیں جن کو علم کلام سلجھانے سے قاصر تھا، "وجدان" جو علم و یقین کا ایک بہت بڑا سرچشمہ ہے، علم کلام کی مسلسل بے اعتنائی بلکہ تحقیر کی وجہ سے بالکل معطل ہوتا جا رہا تھا، ظاہری حواس خمسہ کے علاوہ کسی اور باطنی حاسہ کا وجود تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا، اس نے بہت سے وہ مسائل و حقائق جو حاسۂ باطنی کے بغیر محسوس و معلوم نہیں کئے جا سکتے تھے، محل اعتراض بنے ہوئے تھے، اور ان کے انکار و نفی کا رجحان پیدا ہوتا جا رہا تھا، غرض سارا عالم ایک کلامی بحران میں مبتلا تھا، اور سب پر ایک "عقلی ظاہریت" چھائی ہوئی تھی، امت کی قوت عمل اور اس سے بڑھ کر "حرارت عشق" جو اس امت کا سرمایہ، اس کی طاقت کا سرچشمہ اور نبوت کا فیضان ہے، سرد ہوتی جا رہی تھی، دل سوز سے خالی اور "حرارت عشق" سے عاری ہوتے جا رہے تھے، فلسفیانہ مباحث اور علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام کو ایک مدرسہ میں تبدیل کر دیا تھا، جس میں قیل و قال کی بہتات تھی، مگر "زندگی" اور "محبت، معرفت اور نگاہ" نایاب تھی، اہل قلوب کے روحانی حجروں میں البتہ عشق کا سوز اور یقین کا نور پایا جاتا تھا، ورنہ عالم کا عالم الفاظ کے طلسم کا گرفتار اور ظواہر و محسوسات کا پرستار تھا۔

صاحبِ دل متکلم کی ضرورت

ایسی حالت میں عالمِ اسلام کو ایک ایسی بلند اور طاقتور شخصیت کی ضرورت تھی جو دلِ دردمند اور فکرِ ارجمند دونوں سے فیضیاب ہو، جس کے لیے حقیقت کا سمندر پایاب ہو چکا ہو اور الفاظ و ظواہر کا طلسم ٹوٹ چکا ہو، جو اپنی گرمیِ عشق اور سوز و دروں سے اس یخ بستہ عالمِ اسلام میں زندگی کی نئی حرارت پیدا کر دے اور عقل کے اس نگار خانہ میں عشق کا صور پھونک دے، جو ایک ایسے نئے علم کلام کی بنیاد رکھے جو دماغوں سے زور آزمائی اور حق الیقین کی زبان بندی کے بجائے دماغ کی گتھیاں دور کرے اور دلوں کی گرہ کھولے اور ان کو سکینت و ایمان اور یقین و اطمینان سے بھر دے، یہ شخصیت مولانا جلال الدین رومیؒ (م ۶۷۲ھ) کی تھی جن کی مثنوی علم کلام کی بے اعتدالیوں اور عقل کی زود پرستی کے خلاف ایک صدائے احتجاج بلکہ اعلانِ جنگ ہے اور ایک ایسے نئے علم کلام کی بنیاد جس کی اس وقت عالم اسلام کو سخت ضرورت تھی۔

مختصر حالات

مؤلف مرآۃ المثنوی نے اپنی (غیر مطبوعہ) تصنیف "صاحب المثنوی" میں مولانا کے حالات نہایت تفصیل و تحقیق سے لکھے ہیں، یہاں ان کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔[1]

---

[1] قاضی تلمذ حسین گورکھپوری مرحوم مثنوی کے ترجمان اور صاحب مثنوی کے بہت بڑے مداح اور بڑے صاحبِ علم تھے، ان کی کتاب مرآۃ المثنوی سے تعلق رکھنے والوں میں اپنا جواب نہیں رکھتی، مرآۃ المثنوی کے علاوہ جو طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہے، ان کی دو مختصر تصانیف بھی ہیں جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہیں (۱) صاحب المثنوی (۲) قند مثنوی، ان دونوں کتابوں کی اشاعت ادبیات رومی میں ایک گرانقدر اضافہ اور ایک بڑی خدمت ہوگی، صاحب المثنوی دار المصنفین میں زیر طبع ہے، راقم سطور کو ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر [illegible] حسین کی عنایت سے اس غیر مطبوعہ کتاب سے استفادہ و اقتباس کا موقع ملا، جزاہ اللہ خیرا۔

خاندان اور والد نامدار

محمد نام لقب جلال الدین شہرت مولانا روم یا مولانا رومی کے لقب سے۔ آپ کا نسب باپ کی جانب نو واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مل جاتا ہے اور ماں کی جانب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے۔

مولانا کے آبائے کرام بلخ[۱] واقع خراسان کے رہنے والے تھے مولانا کی وہیں پیدائش ہوئی مولانا کے پدری و مادری سلسلے میں اجلہ علماء اور سلاطین وقت ہیں مولانا کی والدہ ملکہ جہان شاہان خوارزم کے خاندان سے تھیں۔

مولانا کے والد کا نام محمد اور لقب بہاء الدین ولد تھا ان کی ولادت غالباً ۵۴۳ھ میں ہوئی حضرت بہاء الدین ولد نو عمری ہی میں تمام علوم میں کامل و ماہر ہو گئے تھے آپ کے علم و فضل کی کیفیت یہ تھی کہ اقصائے خراسان سے مشکل فتاوے آپ ہی کے پاس آتے تھے مجلس کا طریق بادشاہوں کا سا تھا سلطان العلماء خطاب بھی تھا معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک درس عام ہوتا ظہر کے بعد اپنے خاص اصحاب کے حلقہ میں حقائق و معارف بیان فرماتے دوشنبہ اور جمعہ کو عام وعظ کہتے ہیبت نمایاں رہتی اور ہمیشہ متفکر معلوم ہوتے۔

مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم

آپ کے صاحبزادے مولانا جلال الدین رومی ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ کو پیدا ہوئے سلطان العلماء کے مریدان خاص میں ایک بلند پایہ بزرگ سید برہان الدین محقق ترمذی تھے سلطان العلماء نے آپ ہی کو مولانا کا اتالیق مقرر فرمایا اور ۲۵ سال کی عمر تک مولانا آپ ہی کے زیر تربیت رہے اور اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد آپ ہی کے زیر ہدایت منازل سلوک طے کئے۔

---

[۱] بلخ حال روسی ملک افغانستان۔ (مدیر)

والد کی بلخ سے ہجرت

مولانا کے والد ماجد کا اثر جب زیادہ بڑھا اور آپ کی دعوت و نصیحت کو حد سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا اور مریدوں کی تعداد بے شمار ہو گئی تو بعض علماء معاصرین کو رشک ہونے لگا، حضرت سلطان العلماء اپنے وعظ میں مذہب حکمائے یونان کی مذمت فرمایا کرتے کہ یہ لوگ جو کتب آسمانی کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور فلسفیوں کے از کار رفتہ اقوال کو اپنا مسلک بنا لیا ہے، یہ لوگ کیوں کر نجات کی امید رکھ سکتے ہیں، اس برملا مذمت سے علماء ظاہر کے دلوں میں آپ کی طرف سے کدورت پیدا ہو گئی، مگر چونکہ خوارزم شاہ آپ کا نہایت معتقد تھا، ان لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا، اتفاق کہ ایک روز سلطان آپ کی زیارت کو آیا تو دیکھا کہ مجمع نہایت کثیر ہے، ایک عالم سے جو رکاب شاہی میں تھے مخاطب ہو کر کہا کہ کتنا کثیر مجمع ہے، حاسد مذکور کو موقع ملا اور کہا کہ اگر اس کی تدبیر نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ انتظام سلطنت میں خلل واقع ہو اور تدارک مشکل ہو جائے، یہ بات خوارزم شاہ کے ذہن میں بیٹھ گئی، اس نے پوچھا کہ کیا تدبیر کرنی چاہیے؟ حاسد مذکور نے

---

[1] عام طور پر تذکروں میں یہ شکایت امام فخر الدین رازی کی طرف منسوب ہے جو سلطان کے ساتھ تھے، مصنف صاحب المثنوی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ ایک تاریخی غلطی ہے جو استحالہ کی حد کو پہنچی ہوئی ہے اس لئے کہ حضرت بہاء الدین ولد نے بلخ ۶۰۹ھ یا ۶۱۰ھ میں ترک کیا ہے، امام رازی نے ۶۰۶ھ میں اپنے وطن ہرات میں انتقال کیا، جہاں انہوں نے اپنے انتقال سے کئی سال پہلے سے مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔

مولانا روم کے مستند سوانح نگار بدیع الزمان فروزانفر تہرانی کی تصنیف شرح زندگانی مولانا جلال الدین محمد بھی ایران سے شائع ہو گئی ہے، انہوں نے بھی یہی تحقیق کی ہے کہ یہ روایت تاریخی حیثیت سے ناقابل اعتبار ہے، ان کی بنیاد بھی یہی ہے کہ بہاء الدین ولد کی ہجرت بقول اکثر ۶۱۷ھ کا واقعہ ہے اور امام فخر الدین رازی ۶۰۶ھ میں ہرات میں انتقال کر چکے تھے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۱۔

قاضی تلمذ حسین مرحوم فرماتے ہیں کہ ممکن ہے یہ امام سید بہاء الدین رازی ہوں جو خوارزم شاہ کے مقرب تھے اور طبقات ناصری صفحہ ۲۳ میں ان کا ذکر آتا ہے (مرآۃ المثنوی)

یہ صندوق کہ خزانہ اور فلوس کی کنجیاں ہیں مولانا کے پاس بھیج کر یہ کہلا بھیجا کہ جمعیت و کثرت زر سب کچھ جناب کو حاصل ہے جو کچھ میرے پاس امور سلطنت ہیں صرف کنجیاں رہ گئی ہیں وہ بھی حاضر ہیں۔

اس پیغام کو سن کر آپ نے ارشاد فرمایا کہ سلطان اسلام سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اس ملک فنا کا یہ تمام خزانہ و دفینہ ملک و لشکر بادشاہوں کے لائق ہے ہم درویشوں کو اس سے کیا سروکار ہے میں نہایت خوشی سے سفر کرتا ہوں کہ بادشاہ اپنے اتباع و احباب کے ساتھ یہاں باستقلال سلطنت کرے جمعہ کو وعظ کہہ کر چلا جاؤں گا۔

اہل بلخ کو جب یہ حال معلوم ہوا شہر میں ایک ہنگامہ عظیم برپا ہو گیا خوارزم شاہ سخت متوہم ہوا۔ قاصد بھیجے اور رات کو خود مع وزیر کے آیا کہ ارادۂ سفر سے باز رہے مگر آپ نے قبول نہ کیا آخر یہ استدعا کی کہ آپ اس طرح روانہ ہوں کہ لوگوں کو خبر نہ ہو ورنہ سخت فتنہ برپا ہو جائے گا مولانا نے اس کو منظور فرمایا جمعہ کو وعظ کہہ اور شنبہ کو بلخ سے بغداد کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وعظ میں خوارزم شاہ کو متنبہ کر دیا کہ میرے بعد لشکر تاتار آ رہا ہے[1]۔

سلطان العلماء بلخ سے اس شان کے ساتھ روانہ ہوئے کہ جس شہر کے قریب پہونچتے تھے وہاں کے عمائد و علماء شہر سے باہر نکل کر استقبال کرتے اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ شہر میں لاتے تھے۔

بغداد، مکہ معظمہ، دمشق اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے آپ ملاطیہ پہنچے، اس شہر میں آپ نے چار سال قیام فرمایا اور درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اس شہر سے لارندہ تشریف لائے جو علاقۂ قونیہ سے تھا۔

مولانا قونیہ میں

علاء الدین کیقباد سلطان روم کی فرمائش و درخواست پر آپ [illegible]ھ میں قونیہ تشریف لے گئے

---

[1] [illegible] بہاء الدین ولد کی ہجرت کا اصل سبب [illegible] [illegible] فرمایا [illegible] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱ (اردو)

سلطان نے خود استقبال کیا، محل کے قریب گھوڑے سے اتر پڑا اور بڑی فروتنی کا اظہار کیا، آپ نے مدرسۂ قونیہ میں قیام فرمایا، سلطان مع اکثر امراء کے مرید ہو گیا۔

حضرت بہاء الدین ولد نے قونیہ میں دو برس قیام کے بعد ۶۲۸ھ میں انتقال فرمایا۔

اس تمام مدت میں مولانا ہمیشہ اپنے والد کے ہمراہ رہے اور علوم ظاہری و باطنی آپ سے حاصل کرتے رہے ۲۴ برس کے سن میں آپ شہر (قونیہ) میں وارد ہوئے جو آئندہ آپ کا مسکن و مدفن بننے والا تھا۔

قونیہ میں سلطان کے اتالیق امیر بدرالدین گہرتاش نے آپ کے تبحر علمی اور تعداد و ذہانت سے متاثر ہو کر آپ کے لئے مدرسۂ خداوندگار تعمیر کیا، اور اس کے لئے بہت بڑا وقف کیا۔

سلطان علاء الدین کیقباد آپ کی بڑی تعظیم کرتا تھا، اور آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، سلطان نے جب قونیہ کا قلعہ تیار کیا تو ایک روز آپ سے سیر کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ دفع سیل و منع خیل کے لئے اچھا ہے مگر مظلوموں کی تیروں کا کیا علاج، آپ نے سوچا ہے کہ ہزاروں لاکھوں برجوں سے گذر جاتی اور عالم کو خراب کر ڈالتی ہے، عدل و انصاف کا قلعہ بنایئے کہ اس میں دنیا کا امن اور عافیت کی خیر ہے، سلطان پر اس نصیحت کا بڑا اثر ہوا۔

مولانا بہاء الدین ولد کے انتقال کے بعد سلطان وقت اور علماء و اکابر کے اتفاق رائے سے آپ مولانا کے جانشین ہوئے، اور آپ نے سلسلۂ درس و تدریس اور تلقین و ارشاد کو بدستور جاری رکھا، سید برہان الدین محقق ترمذی جو آپ کے اتالیق رہ چکے تھے، اور ترمذ کو چلے گئے تھے، مولانا بہاء الدین ولد کے انتقال کے بعد قونیہ تشریف لائے، مولانا آپ کے مرید ہو گئے، اور اپنے والد ماجد کے بعد مراتب سلوک آپ ہی سے طے کئے، نو برس مولانا کی آپ سے صحبت رہی، ۶۳۸ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔

آپ کے تعلیمی سفر اور مشاغل

سنہ ۶۳۰ھ میں مولانا نے مزید تکمیل علوم و اکتساب فیض کے لئے شام کا سفر کیا، اور حلب میں وارد ہوئے

سلطان صلاح الدین کے فرزند الملک الظاہر نے قاضی بہاء الدین ابن شداد کی تحریک سے جو اجلہ علماء میں سے تھے ۵۹۵ھ میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کئے تھے جس کی وجہ سے حلب بھی دمشق کی طرح مدینۃ العلوم بن گیا تھا۔

حلب میں مولانا مدرسہ حلاویہ میں قیام پذیر ہوئے اور کمال الدین ابن العدیم سے استفادہ کیا۔ مولانا یہاں اگرچہ تحصیل علم میں مشغول تھے، مگر آپ کے کمال کا یہ حال تھا کہ بقول سپہ سالار جو مشکل مسائل کسی سے حل نہ ہوتے تھے وہ آپ ہی حل کرتے تھے اور ایسے وجوہ بیان کرتے تھے جو کسی کتاب میں درج نہ ہوتے۔

حلب سے مولانا دمشق تشریف لے گئے، یہاں آپ نے مدرسہ مقدسیہ میں قیام فرمایا۔ دمشق اس وقت مجمع علما تھا۔ سپہ سالار نے لکھا ہے کہ دمشق میں شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمان رومی، شیخ اوحد الدین کرمانی، شیخ صدر الدین قونوی سے مولانا کی صحبت رہا کرتی تھی اور باہم دگر حقائق و معارف بیان ہوتے تھے۔

۶۳۴ھ یا ۶۳۵ھ میں آپ نے دمشق سے واپس آکر قونیہ میں مستقل قیام اختیار کیا۔ سید برہان الدین کے انتقال (۶۳۸ھ) کے بعد ۵ سال تک آپ علماء ظاہر کے لباس میں رہے اور علمی و تدریسی مشاغل میں ہمہ تن منہمک رہے۔ ۶۳۸ھ میں شیخ محی الدین ابن عربی نے انتقال کیا، جو بزم علم آپ کے گرد جمع تھی اس کے اکثر افراد قونیہ میں آگئے جن میں شیخ صدر الدین بھی تھے۔ مشرق کی طرف سے جو علماء و فضلاء وہاں کی تباہیوں سے پریشان ہو کر روم کا رخ کرتے تھے وہ بھی اکثر قونیہ کو اپنا ملجا و ماویٰ بناتے۔ اس طرح قونیہ اس زمانہ میں مدینۃ العلماء بن گیا، اور ان علماء میں مولانا کی حیثیت سب سے بلند تھی۔ اس زمانہ میں مولانا کے وہی اشغال تھے جو علماء ظاہر کے ہوتے ہیں یعنی درس و تدریس، وعظ و تذکیر، افتاء نویسی۔ مولانا بہت زیادہ وقت مشغول تدریس میں صرف کرتے، خود آپ کے مدرسہ میں چار سو سے زیادہ طلبہ تھے۔

درس و تدریس کے علاوہ مولانا کا دوسرا شغل یا فرض وعظ کہنا تھا۔ فتویٰ نویسی کا شغل بھی مستقل

تھا۔ بیت المال سے مولانا کے لئے ایک دینار مقرر تھا۔ اسے اسی فتویٰ نویسی کا معاوضہ تصور فرماتے تھے لو اس معاملہ میں اس قدر سخت تھے کہ جب فقر و رنگ غالب ہوا اور مجلس میں مستغرق رہنے لگے اس وقت بھی حکم تھا کہ جس وقت کوئی فتویٰ آئے فوراً خبر کی جائے قلم دوات ہر وقت ساتھ رہتا تھا۔

انقلاب حال

یہ حالت ۶۴۲ھ تک قائم رہی۔ اس کے بعد مولانا کی زندگی میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور مولوی جلال الدین قونوی کو مشہور روزگار مولائے روم بنا دیا۔ یہ واقعہ مولانا کی شمس تبریز سے ملاقات اور ان کی ذات سے شیفتگی و فنائیت تھی۔

مولوی ہرگز نشد مولائے روم ۔ تا غلام شمس تبریزی نہ شد

شمس تبریز

(محمد بن علی بن ملک داد) شمس تبریز کا نسب اور وطن کیا تھا؟ آپ کے مخالفین نے جہاں اور الزامات آپ پر لگائے تھے، وہاں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ کا نسب نامعلوم ہے۔[1]

نے ورد و اصل و نے نسب پیدا ست ۔ می ندانیم ہم کہ او ز کجا ست

آپ بچپن سے اعلیٰ استعداد اور جذبۂ عشق و محبت کے حامل تھے۔ مناقب العارفین میں خود آپ ہی کی زبانی منقول ہے کہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عشق میں

---

[1] بعض تذکروں میں ہے کہ آپ حسن بن صباح اسماعیلی کے جانشین دینی و طریقی کیا بزرگ امید کی نسل سے تھے جن کے والد جلال الدین حسن جب منصب امامت پر فائز ہوئے تو انہوں نے اپنے بزرگوں کا طریقہ ترک کر کے صحیح مسلمانوں کا عقائد اختیار کئے اور نو مسلم کے لقب سے مشہور ہوئے لیکن یہ روایات مشتبہ اور قابل بحث ہیں (ملاحظہ ہو زندگانی مولانا جلال الدین محمد ص ۶۴ [illegible])

تیس تیس چالیس چالیس روز تک آپ کو غذا کی خواہش نہیں ہوتی تھی، علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد آپ شیخ ابوبکر سلہ باف کے مرید ہوئے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شیخ زین الدین سجاسی کے مرید تھے[1] بعض روایتوں میں دوسرے نام لئے گئے ہیں، ممکن ہے آپ نے سب سے اکتساب فیض کیا ہو۔

جب آپ کو اس طرح سیری نہ ہوئی تو آپ اطراف عالم میں مردان خدا کی تلاش میں پھرنے لگے، یہ سفر اس طرح کرتے تھے کہ خود آپ کی ولایت و کمال سے لوگ آگاہ نہیں ہوتے تھے، نمدہ پہنتے اور جہاں جاتے سرائے میں قیام کرتے، دروازہ میں قیمتی قفل لگا دیتے کہ لوگ سمجھیں کہ کوئی بڑا تاجر ہے، مگر اندر سوائے بوریے کے کچھ نہ ہوتا، کثرت اسفار کی وجہ سے لوگ آپ کو شمس پرندہ کہنے لگے تھے، تبریز، بغداد اور دیار روم، قیصریہ، دمشق کا سفر فرمایا، معاش کا طریقہ تھا کہ ازار بند بن لیا کرتے اور اسی کو بیچ کر کام چلاتے تھے، غذا کی کیفیت یہ تھی کہ دمشق میں ایک برس رہے، ہفتہ میں ایک پیالہ سری کا شوربا اور وہ بھی بے روغن پی لیا کرتے، کسی کو اپنی صحبت کا متحمل نہیں پاتے تھے، اکثر یہ دعا فرماتے کہ خدایا کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو۔

مولانا کی ملاقات اور تغیر عظیم

آپ کے شیخ نے آپ سے فرمایا کہ روم جاؤ، وہاں ایک دل سوختہ ہے اسے روشن کر آؤ، ۲۶ جمادی الاخری ۶۴۲ھ کو قونیہ پہنچے اور شکر فروشوں کے محلہ میں قیام فرمایا، ایک روز دیکھا کہ مولانا سوار چلے آ رہے ہیں اور لوگ گرد و پیش استفادہ کرتے ہوئے آ رہے ہیں، شمس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ ریاضات و علوم کی غرض کیا ہے؟ مولانا نے کہا آداب و شریعت کا جاننا، شمس نے کہا نہیں، غرض یہ ہے کہ معلوم تک رسائی ہو جائے اور حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا ؎

---

[1] ہدیۃ الاملی فرید العصر نے بجائے زین الدین سجاسی کے رکن الدین سجاسی لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ سجاس زنجان کے نواح کا ایک قصبہ ہے، (صفحہ ۵) لیکن تاریخی حیثیت سے ان کی اس روایت کی صحت میں کلام ہے۔ (ندوی)

علم کز تو ترا نہ بستاند جہل ازاں علم بہ بود بسیار

مولانا اس سے متاثر و متحیر ہوئے اور تیر نشانہ پر بیٹھا۔[۱]

مولانا حضرت شمس کو ہمراہ لے کر اپنے مقام پر آئے اور بقول افلاکی چالیس روز تک حضرت شمس کے ساتھ ایک حجرہ میں رہے جس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا، سپہ سالار نے لکھا ہے کہ چھ ماہ تک صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں دونوں بزرگ عزلت نشین رہے، سوائے شیخ صلاح الدین کے کسی کی مجال نہ تھی کہ حجرہ میں داخل ہو سکے۔

شمس کی ملاقات نے مولانا کو نئی روح اور حقائق و اذواق کی نئی دنیا عطا کی، وہ خود فرماتے ہیں ؎

شمس تبریزی بما راہ حقیقت بنمود از فیض قدم اوست کہ ایماں دارم

ابھی تک مولانا استاذ زماں تھے اور خود صاحب سجادہ تھے اور علماء و طلبہ و صوفیہ مستفید و طالب، اب مولانا مستفید و طالب تھے اور شمس تبریز صاحب فیض و ارشاد، مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد فرماتے ہیں ؎

شیخ استاد گشت نو آموز درس خواندی بخدمتش ہر روز
گرچہ در علم فقر کامل بود علم نو بود کو بوے بنمود

خود مولانا اپنی زبان سے فرماتے ہیں ؎

زاہد بودم ترانہ گویم کردی سرفتنۂ بزم و بادہ جویم کردی
سجادہ نشین باوقارے بودم بازیچۂ کودکاں کویم کردی

نتیجہ یہ ہوا کہ شمس کی ملاقات کے بعد مولانا نے درس و تدریس، وعظ گوئی وغیرہ سب یک قلم

---

[۱] صاحب مثنوی کی نسبت روایات میں سے اس روایت کو انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ روایت تذکرۂ دولت شاہ کی ہے ص ۱۹۵، ۱۹۶ [illegible] نے [illegible] کی تمام روایات کو نقل کر کے ان سے یہ احتمال پیدا کیا ہے کہ شمس سے مولانا کے تاثر و شیفتگی کا سبب کسی [illegible] حضرت [illegible] شمس سے مولانا کی بیعت طریقت کو قرار دیا ہے ملاحظہ ہو [illegible] صلاح الدین [illegible] (ص [illegible])

ترک کردیا، خود فرماتے ہیں ؎

عطارد وار دفتر پارہ بودم　　زبردست ادیبانے می نشستم
چو دیدم لوح پیشانی ساقی　　شدم مست و قلم ہا را شکستم

شورش عام

مولانا جب اس طرح ہر بات میں حضرت شمس کی پیروی کرنے لگے، اور تمام تعلقات منقطع ہونے لگے تو یہ امر مولانا کے شاگردوں اور مریدوں پر سخت شاق گذرا، ایک شورش کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ایک برہمی کے ساتھ گو حیرت یہ بھی تھا کہ شمس کے حالات سے لوگ واقف نہ تھے، مریدوں کا خیال تھا کہ ہم نے عمریں مولانا کی خدمت میں گذاریں، مولانا کی کراماتوں کو دیکھا، تمام اطراف واکناف میں آپ کی شہرت کا باعث ہوئے اب ایک بے نام و نسب شخص آیا اور مولانا کو سب سے الگ کر لیا کہ آپ کی صورت تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتی، درس و تدریس وعظ سب بند ہوگئے، ضرور یہ کوئی ساحر یا مکار شخص ہے ورنہ اس کی کیا ہستی ہے کہ ایسے پہاڑ کو تنکے کی طرح بہالے جائے۔

غرض سب کے سب شمس کے دشمن ہوگئے، مولانا کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتے تھے، ادھر اُدھر جاتے تو برا بھلا کہتے، اور رات دن اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے کہ کسی طرح حضرت شمس کو وہاں سے نکالیں کہ پھر حسب سابق مولانا کی صحبت سے فیضیاب ہو سکیں۔

شمس کی غیبت

حضرت شمس الدین ان لوگوں کی گستاخیوں کا تحمل کرتے رہے اور سمجھتے رہے کہ مولانا کی وفور عقیدت کی وجہ سے یہ لوگ اس طرح آزردہ ہیں، مگر جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا، اور آپ نے سمجھ لیا کہ اب انجام اس کا

فتنہ و فساد برپا ہوگا تو آپ ایک دن خاموشی کے ساتھ قونیہ سے نکل گئے۔ افلاکی نے اس غیبت اول کی تاریخ روز پنجشنبہ یکم شوال ۶۴۳ھ دی ہے اس طرح بار اول قونیہ میں آپ کا قیام سوا برس رہا۔

شمس کی جدائی مولانا پر سخت شاق گزری، مریدوں نے جو کچھ سوچا تھا اس کے برعکس ہی ہوا یعنی بجائے کہ شمس کے چلے جانے کے بعد مولانا ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے جو کچھ توجہ تھی وہ بھی جاتی رہی، اور ان قصوں کی وجہ سے اصحاب صدق و وفا بھی مولانا کی صحبت سے محروم ہو گئے۔

مولانا کی بیقراری اور شمس کی واپسی

بقول سپہ سالار انقطاع کلی کی یہ حالت اس وقت تک قائم رہی کہ دمشق سے شمس الدین کا خط ایک مولانا کے نام آیا، اس خط کے پانے کے بعد مولانا کی کچھ حالت بدلی، اور شمس کے ذوق و شوق میں سماع کی جانب متوجہ ہوئے، اور جن لوگوں نے حضرت شمس کے خلاف حرکات میں شرکت نہیں کی تھی ان پر حسب سابق عنایت فرمانے لگے، اس مدت میں مولانا نے حضرت شمس کی خدمت میں چار منظوم خطوط لکھے جن میں اپنی کیفیت اور اشتیاق ملاقات کی بیتابی کا ذکر کیا ہے پہلے نامۂ شوق میں فرماتے ہیں ؎

أیها النور فی الفؤاد تعال — غایة الوجد والمراد تعال
أیها السابق الذی سبقت — منك مصدوقة الوداد تعال
چون بیائی زہے گشاد و مراد — چون نیائی زہے کساد تعال
أنت کالشمس إذ دنت ونأت — یا قریبا علی البعاد تعال

اس اثنا میں شورش بہت کچھ فرو ہو گئی، اطمینان ہو جانے کے بعد کہ اب لوگوں نے شمس کی مخالفت ترک کر دی ہے، مولانا نے شمس کو واپس بلانے کی تدبیر کی، صاحبزادہ سلطان ولد سے فرمایا کہ تم میری طرف سے اس شاہ خوباں کی طرف جاؤ۔ اور یہ جا کر ان کے قدموں پر نثار کرو اور میری جانب سے کہو کہ جن

مریدوں نے گستاخی کی تھی، وہ سب صدق دل سے توبہ کرتے ہیں، و التجا کرتے ہیں کہ جو خطا ہوئی درگذر فرمائیں اور اس جانب قدم رنجہ فرمائیں ان کے ہاتھ جو نیاز نامہ بھیجا اس میں اس مفارقت سے اپنی حالت بیان کرتے ہیں

کز زاں دمے کہ تو سفر کردی ‏ از حلاوت جدا شدیم چو موم
ہمہ شب ہمچو شمع مے سوزیم ‏ ز آتشش جفت وز انگبیں محروم
در فراق جمال تو مارا ‏ جسم ویران وجان ازو چون بوم
یک عناں را بدیں طرف برتاب ‏ زفت کن پیل عیش را خرطوم
بے حضورت سماع نیست حلال ‏ ہمچو شیطان طرب شدہ مرجوم
یک غزل بے تو ہیچ گفتہ نشد ‏ تا رسید آں مشرف مفہوم
پس بذوق سماع نامۂ تو ‏ غزل پنج و شش بشد منظوم
شام از تو چو صبح روشن باد ‏ اے بتو فخر شام و ارمن و روم

سلطان ولد حضرت شمس کو عزت و احترام تمام کے ساتھ قونیہ لائے۔

شمس کی دوبارہ غیبت

حضرت شمس کے قونیہ پہنچنے پر مولانا کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جن لوگوں سے گستاخیاں سرزد ہوئی تھیں سب نے آ آ کر معافی مانگی، ایک مدت تک یہ صحبت بے کدورت اسی طرح برقرار رہی، اس اثنا میں شمس کے ساتھ مولانا کا اخلاص و اتحاد پہلے سے زیادہ بڑھ گیا، مگر اس دور خرمی کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ پھر آزردگی کے اسباب پیدا ہو گئے، حضرت شمس کا قیام مولانا کے مکان کے قریب ہی دالان صفہ میں ایک طرف تھا، شمس وہاں اپنی اہلیہ کے ساتھ جن سے قونیہ میں عقد ہوا تھا، مقیم تھے، مولانا کے منجھلے صاحبزادے چلپی علاء الدین، جب مولانا کے گھر جاتے تو اسی طرف سے ہو کر گذرتے، مولانا شمس کی خلوت

کو یہ بات ناگوار ہوئی، کئی مرتبہ مشفقانہ طور پر سمجھایا، علاء الدین کو یہ بات شاق گزری، ان کے دل میں کچھ اس بات سے بھی کدورت تھی کہ حضرت شمس الدین سلطان ولد پر زیادہ نظر عنایت رکھتے ہیں، اس کا چرچا لوگوں سے بھی کیا، جو لوگ اس قسم کے موقع کے منتظر تھے انھوں نے اور بھی حاشیے چڑھائے اور کہنے لگے کہ یہ بھی خوب ہے کہ ایک بیگانہ نے آکر مولانا کے مکان پر قبضہ کر لیا ہے اور فرزند کو گھر میں آنے نہیں دیتا۔

حضرت شمس الدین نے محض لطف و حیا کی وجہ سے مولانا سے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا، مگر جب معاملہ حد سے گزر گیا تو سلطان ولد سے بر سبیل شکایت بیان فرمایا کہ ان لوگوں کے حرکات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ میں اس طرح غائب ہوں گا کہ پھر کسی کو پتہ نہ چلے گا، مولانا کی بعض غزلوں سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا بھی بالکل اس سے بے خبر نہ تھے، بلکہ ان کو اس کا اندیشہ تھا، اور انھوں نے اشعار میں ان سے باز رہنے کی منت سماجت کی ہے۔

بہرحال لوگوں میں حضرت شمس الدین کے خلاف خیالات پھر جوش زن ہو گئے تھے اور آپ تو دو بارہ آزردہ خاطر ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ دفعتہً غائب ہو گئے۔

ناگہان گم شد از میان ہمہ   تا رود از دل اندہان ہمہ

مولانا کی بیتابی

مولانا جب صبح کو مدرسہ تشریف لائے اور شمس کو گھر میں نہ دیکھا تو چیخ اٹھے اور سلطان ولد

۱؎ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ تذکروں میں ہے کہ لوگوں نے حضرت شمس کو قتل کر دیا، مولانا فرماتے ہیں بعض [illegible]

لیکن بہرحال قرینہ غیبت کی اسی روایت کو ترجیح دیتا ہے کہ سلطان ولد جو تمام حالات سے باخبر تھے ان کی روایت اس باب میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے، اس سے شمس کے قتل کی روایت کا بالکل اعتبار نہیں ہوتا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شمس قتل کر دیئے گئے ہوتے اور مولانا کو اس واقعہ کا علم ہوتا تو ان کی تلاش ہی بیکار تھی اور زندہ کی تلاش [illegible]

کے خلوت خانہ پر جا کر آواز دی بہاء الدین بخفتہ ای برخیز وطلب شمس کن کہ باز مشام جان ما از لطف او خالی یابیم

دو تین روز ہر طرف جستجو کرتے رہے مگر کہیں حضرت شمس کا پتہ نہ چلا، اس مرتبہ شمس کی غیبت سے مولانا کا حال پہلے سے بھی زیادہ متغیر ہو گیا۔

شیخ گشت از فراق او مجنون　　　بے سر و پا ز عشق او چو ذو النون

جو لوگ حضرت شمس کی آزردگی کا باعث ہوئے تھے مولانا نے ان سب کو قطعاً اپنی صحبت سے خارج کر دیا لیکن سابق کے برخلاف اس مرتبہ آپ نے غزل گوئی اور سماع میں اپنا وقت صرف کرنا شروع کیا۔ ۶۴۵ھ کا واقعہ ہے

حضرت شمس کے غائب ہو جانے کے بعد مولانا نے دور دراز ہر طرف آپ کی تلاش کی۔ مگر جب کہیں آپ کا کچھ پتہ نہ چلا تو مولانا کی حالت متغیر ہونا شروع ہوئی، طریق سماع تو آپ پہلے ہی اختیار کر چکے تھے اب یہ حالت ہوئی کہ ایک دم سماع کے بغیر نہیں گزرتا تھا، ہر وقت سماع میں مشغول رہتے تھے اور قوال و مغنیان شعر و قصیدہ پڑھا کرتے تھے، تمام شہر میں غلغلہ پڑ گیا، اسی زمانہ میں مولانا نے حضرت شمس کے فراق میں بہت کثرت سے اور نہایت ہی پُر درد غزلیں کہیں، آپ کی درد انگیز فراقیہ غزلیں زیادہ تر اسی زمانہ کی ہیں۔

اس تمام جاں گدازی و بے قراری کے باوجود مولانا کے دل سے یہ خیال محو نہ ہو سکا کہ دمشقیوں کی خانہ جنگی، مصریوں کی ترکتازی اور تاتاریوں کی تاراجی کے باعث سارا ملک تہ و بالا ہو رہا ہے، معلوم نہیں اس عالم آشوب میں حضرت شمس پر کیا گزری؟!

شمس الدین کے غائب ہو جانے کے بعد آپ کے اشتیاق میں مولانا کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص جھوٹوں بھی کہہ دیتا کہ میں نے حضرت شمس کو فلاں جگہ دیکھا ہے تو مولانا لباس تک اتار کر اس کی نذر کر دیتے شکرانے دیتے اور بہت کچھ اظہار شکر کرتے۔

سفر شام اور سکون خاطر

اسی جوش و خروش کے عالم میں مولانا نے سفر کا ارادہ کیا، اور شام کی طرف روانہ ہو گئے، آپ کے اصحاب بھی آپ کے ساتھ چل کھڑے ہوئے، اسی طرح دمشق پہنچے، اور وہاں بھی لوگوں کے دلوں میں آتش عشق بھڑکا دی، تمام لوگ حیران تھے کہ ایسا عالم و فاضل شخص کیوں اس طرح دیوانہ ہو رہا ہے، شمس تبریز کیا چیز ہیں جو کہ ایسا فرد فرید ان کے پیچھے یوں مارا مارا پھر رہا ہے، یہ راز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

جب دمشق میں بھی شمس کا کچھ پتہ نہ چلا، اس وقت مولانا نے فرمایا کہ میں اور شمس دو نہیں ہیں، وہ اگر آفتاب ہیں تو میں ذرہ ہوں، وہ اگر دریا ہیں تو میں قطرہ ہوں، ذرہ کی ہستی آفتاب ہی سے ہے اور قطرہ کی تری دریا ہی سے ہے بس فرق کیا ہوا، چند روز بعد آپ نے شام سے روم کی جانب مراجعت فرمائی۔

چند برس تو قونیہ میں قیام فرمایا، مگر پھر عشق نے جوش کیا، اور کچھ لوگوں کو لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوئے اور آخر پھر... قونیہ تشریف فرما ہوئے اور اس مرتبہ یہ خیال لے کر آئے کہ میں خود ہی شمس ہوں، کس کی جستجو کیا تھی، درحقیقت خود اپنی ہی جستجو کر رہا تھا، اس مرتبہ قونیہ اس خیال کے ساتھ واپس آئے کہ شمس میں جو کچھ تھا، وہ خود مجھ میں موجود ہے۔

اس مرتبہ دمشق سے واپس آنے کے بعد مولانا حضرت شمس کے ملنے سے بالکل مایوس ہو گئے تھے مگر جس کیفیت کو آپ شمس میں ملاحظہ فرماتے تھے اسے اب خود اپنے میں ملاحظہ فرمانے لگے، سلطان ولد کے الفاظ ہیں کہ "اگرچہ مولانا قدس اللہ سرہ شمس الدین تبریزی را عظم اللہ ذکرہ بصورت در دمشق نیافت لیکن در خود بیافت زیرا آں حال کہ شمس الدین را بود حضرت او را ہماں حاصل شدہ"

شیخ صلاح الدین زرکوب

دمشق سے دوسری مرتبہ واپس آنے کے بعد تو کچھ دنوں سکون رہا، اس کے بعد آپ نے شیخ

صلاح الدین کو اپنا ہمراز و خلیفہ بنایا، ۶۴۷ھ میں آپ نے ان کو اپنا جلیس و انیس بنایا، اور حضرت شمس الدین کے بجائے ان کو اپنا معین و دمساز قرار دیا۔[1]

شد صلاح الدین ز بعد شمس دین　　گشت او را ہمدم و رازش معین
حال و قالش از وجودش می فزود　　سر ہائے نادرہ از وے می شنود

شیخ صلاح الدین قونیہ کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، فریب الدین کی اولاد تھے جو ماہی گیری کیا کرتے تھے، خود شیخ صلاح الدین نے زرکوبی کا پیشہ اختیار کیا، ابتدائے حال سے امانت و دیانت میں مشہور تھے، سید برہان الدین جب قونیہ آئے تو آپ ان کے مرید ہوگئے اور ان کی نظروں میں اختصاص خاص پیدا کیا، سید کے انتقال کے بعد مولانا سے تجدید بیعت کی، انتقال سے دس برس قبل مولانا سے آپ کو وہ رتبہ حاصل ہوا، اس دس سال مدت میں آپ مولانا کے خلیفہ خاص رہے، شیخ نے یکم محرم ۶۶۲ھ میں انتقال فرمایا۔

لوگوں میں اس تقرب و اختصاص سے پھر شورش پیدا ہوئی، سب لوگوں کو تعجب تھا کہ ان سے تو شمس تبریز ہی بہتر تھے، وہ بہرحال صاحب علم تھے، یہ صاحب تو ہمیں کے رہنے والے ہیں، سب جانتے ہیں کہ ایک عامی آدمی ہیں، عمر بھر ورق کوٹتے رہے، اب مولانا کے رفیق بنے ہیں، حیرت ہے کہ مولانا اس رتبہ اور پایہ کے باوجود ایسے شخص کی تعظیم و تکریم میں یہ مبالغہ کرتے ہیں، شیخ نے سنا تو فرمایا کہ لوگوں کو ملال اس کا ہے کہ مولانا نے مجھے سب پر مخصوص کر دیا مگر اصل بات کو نہیں سمجھے کہ مولانا خود اپنے پر عاشق ہیں، میں تو محض ایک حیلہ ہوں۔[2]

---

[1] [illegible] لکھتا ہے مولانا [illegible] شمس [illegible] گشت [illegible] دل [illegible] صلاح [illegible] منصب [illegible] (ماخوذ [illegible])

[2] [illegible] مولانا جلال الدین نے لکھا ہے مولانا [illegible] صلاح الدین [illegible] شمس [illegible] صلاح الدین [illegible] مولانا [illegible] شنیدہ [illegible]

دس برس کی خدمت و صحبت کے بعد شیخ ناگہاں بیمار ہوئے اور یکم محرم کو نہایت طمانیت قلب کے ساتھ اس دارِ غرور سے دارِ سرور کی طرف سفر کیا۔

چلپی حسام الدین

شیخ صلاح الدین کے انتقال کے بعد مولانا نے چلپی[1] حسام الدین ابن اخی ترکؒ کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا۔ چلپی حسام الدین مولانا کے ممتاز مریدوں میں سے تھے اور مولانا کے انتقال کے بعد ۱۱ برس تک مولانا کی خلافت کے فرائض انجام دیئے۔ آپ اصلاً ترک اور وطناً ارموی تھے، اور روم کے مشہور اور ذی اثر خاندان اخی سے تعلق رکھتے تھے۔[2]

حضرت شمس الدین تبریزی اور شیخ صلاح الدین سے بھی آپ کو ارادت تھی اور ان لوگوں کے فیض سے بھی آپ بیش از بیش متمتع ہوئے تھے۔

حضرت حسام الدین چلپی نے اپنے تمام ملازموں اور غلاموں کو حکم دیا کہ اپنے طور پر کام کریں، آہستہ آہستہ اپنا کل مال مولانا کی خدمت میں صرف کر دیا۔ آخر میں غلاموں کو بھی آزاد کر دیا۔ مولانا کا پاس و ادب اس قدر ملحوظ تھا کہ مولانا کے وضو خانہ میں کبھی وضو نہ کرتے، سخت جاڑے میں سخت سردی ہوتی، برف پڑتی ہوتی، مگر گھر جا کر وضو کر کے آتے۔ دوسری طرف مولانا بھی آپ سے اس طرح پیش آتے کہ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا کہ مرید ہیں۔[3]

---

[1] چلپی ترکی زبان میں سید کا ہم معنی ہے [2] فروزانفر نے ان کی تاریخ وفات ۶۸۳ھ لکھی ہے [3] مولانا کو جو کچھ فتوحات ہوتیں سب چلپی کے پاس بھیج دیتے، صاحبزادہ سلطان ولد نے ایک مرتبہ شکایت کی تو فرمایا کہ بہاء الدین اگر مجھ کو سو جو کا ملتا تو وہ سب انہی کو حوالہ کرتا [illegible] خیر و برکت باشد [illegible] مولانا حضرت چلپی کو نسیم [illegible] کہا کرتے ان کے بغیر بیٹھنا [illegible] ہوتی تھی جب مجلس میں چلپی نہ ہوتے مولانا کی طبیعت میں جوش و گرمی نہ پیدا ہوتی اور اسرار و معرفت کا [illegible] نہ کرتے جن لوگوں کو حقیقت معلوم تھی وہ مجلس میں ہوتے تو مولانا سے [illegible] کرتے کہ حضرت چلپی موجود ہوں [illegible] یہ بات بعض جاہلوں کو [illegible] تذکرہ [illegible]

مثنوی کی تحریک

مثنوی شریف کی تصنیف اسی زمانہ کا کارنامہ ہے اس میں حضرت حسام الدین کی تحریک کو بہت بڑا دخل ہے بلکہ یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ مثنوی شریف کا وجود میں آنا آپ ہی کی وجہ سے ہوا۔[1]

رفقاء کے انتخاب کا سبب

مولانا کو کسی نہ کسی رفیق کے بغیر راحت نہیں ملتی تھی شمس الدین کے بعد صلاح الدین اور صلاح الدین کے

---

[1] فروزانفر نے لکھا ہے کہ مثنوی کی تصنیف چلپی حسام الدین کی فرمائش پر ہوئی، انھوں نے دیکھا کہ [illegible] کے احباب حکیم سنائی کی تصنیفات اور عطار کے منطق الطیر [illegible] بڑے شوق سے پڑھتے ہیں [illegible] تصوف و سلوک سے زیادہ [illegible] ایک رات مولانا کو تنہا پا کر انھوں نے عرض کیا کہ اگر کوئی کتاب بطریقہ سنائی یا منطق الطیر کے طرز پر لکھی جائے [illegible] مولانا نے فوراً اپنی دستار سے ایک کاغذ نکالا جس میں اٹھارہ شعر لکھے ہوئے تھے جن میں پہلا شعر جو مثنوی کا مطلع ہے یہ تھا

بشنو از نے چوں حکایت می کند وز جدائی ہا شکایت می کند

آخری مصرعہ تھا یہ

پس سخن کوتاہ باید والسلام

بس مثنوی کی تالیف کا آغاز تھا مولانا [illegible] اکثر آمد ہوتی حسام الدین لکھتے جاتے لکھ لینے کے بعد حسام الدین پڑھ کر سناتے، وہ خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے، بعض وقت رات رات بھر یہی صحبت رہتی [illegible] مثنوی کی تالیف شروع [illegible] مثنوی کا دفتر اول مکمل ہوئی تھی کہ حسام الدین کی بیوی نے انتقال کیا اور حسام الدین کی طبیعت پر سخت اثر پڑا اور وہ معتکف ہو گئے ان کے اس ملال سے مولانا [illegible] اور دو سال تک مثنوی کا سلسلہ بند رہا، پھر دوبارہ حسام الدین کی تحریک اور تقاضا سے[2] پھر سلسلہ شروع ہوا اور مولانا کی وفات تک [illegible] یہ مدت دس سال کی [illegible] (۶۶۲ھ تا ۶۷۲ھ) اردو

بعد حسام الدین آپ کے ہمراز و دمساز رہے بلکہ سلسلۂ خیال کو اور آگے بڑھایا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سید برہان الدین ترمذی بھی اسی زمرہ میں داخل تھے اگرچہ دوسری حیثیت کے تھے۔ سید موصوف کے انتقال اور شمس کی آمد کے درمیان پانچ برس کا زمانہ مولانا نے اس طرح گزارا گویا اس دوران میں آپ کچھ کمی محسوس کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا کے باطن میں جو کمالات مخفی تھے ان کے اظہار کے لئے کسی نہ کسی محرک کی ضرورت تھی۔ دیوان و مثنوی دونوں حضرت کی تحریک باطنی کے شواہد ظاہری ہیں صرف حسام الدین کی عدم فرصت کی وجہ سے مثنوی شریف کی تصنیف دو برس معطل رہی۔

مولانا نے جن اصحاب کو اپنی ہم نشینی کے لئے منتخب کیا، ان کے انتخاب کی وجہ کشف و کرامت نہیں تھی۔ آپ کا قول اور مسلک یہ تھا کہ محبت کا سبب جنسیت ہوا کرتی ہے۔ خود مولانا نے سلطان ولد کے سوال پر فرمایا کہ میں مناسبت جنسیت کی وجہ سے ان کو خاص طور پر دوست رکھتا ہوں، فرمایا کہ جو محبت مناسبت کی وجہ سے ہوتی ہے اس کا نتیجہ پشیمانی نہیں ہوتا۔ حقیقی محبت اور مناسبت سے دنیا و آخرت کہیں بھی پشیمانی نہیں ہوتی چنانچہ اہل غرض دوستوں کو آخرت میں یہ تمنا ہوگی کہ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا ۔ محبانِ حقیقی کی صفت یہ ہوگی اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ۔

خود فرماتے ہیں:۔

موجبِ ایماں نہ باشد معجزات ۔۔۔ لیک جنسیت بود جذب صفات

مولانا کی وفات

سپہ سالار کا قول ہے کہ مولانا کے انتقال سے قبل قونیہ میں چالیس روز زلزلہ آتا رہا۔ افلاکی کا بیان ہے کہ مولانا بستر صاحب فراش تھے کہ سات روز برابر زلزلہ رہا۔ تمام لوگ عاجز آگئے مولانا سے طلب امداد کی فرمایا زمین بھوکی ہوگئی ہے لقمۂ چرب چاہتی ہے جلد کامیاب ہوجائے گی اور بہ رحمت تم لوگوں سے

رخصت ہو جائے گی اور اسی زمانہ میں یہ غزل ارشاد فرمائی:-

با ایں ہمہ مہر و مہربانی　　دل می دہدت کہ خشم رانی
وین جملہ شیشہ ہائے جان را　　درہم شکنی بہ لن ترانی

چلپی حسام الدین کی روایت ہے کہ ایک روز شیخ صدر الدین اکابر درویشوں کے ساتھ مولانا کی عیادت کو آئے مولانا کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوئے اور فرمایا خدا شفائے عاجل عطا فرمائے امید ہے کہ صحت کلی حاصل ہو جائے گی مولانا نے فرمایا اب شفا آپ ہی کو مبارک ہو عاشق و معشوق میں بال کا پیراہن رہ گیا ہے کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور نور میں شامل ہو جائے۔

مرض ہی میں یہ غزل شروع کی، حسام الدین چلپی لکھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

رو سر بنہ ببالین تنہا مرا رہا کن　　ترک من خراب شب گرد مبتلا کن
ماییم و موج سودا شب تا بروز تنہا　　خواہی بیا ببخشا خواہی برو جفا کن
از من گریز تا تو ہم در بلا نیفتی　　بگزیں رہ سلامت ترک رہ بلا کن
ماییم و آب دیدہ در کنج غم خزیدہ　　بر آب دیدۂ ما صد جائے آسیا کن
خیرہ کشی است ما را دارد دلے چو خارا　　بکشد کسش نگوید تدبیر خوں بہا کن
بر شاہ خوبرویاں واجب وفا نباشد　　اے زرد روئے عاشق تو صبر کن وفا کن
دردیست غیر مردن کاں را دوا نباشد　　پس من چگونہ گویم کاں درد را دوا کن
در خواب دوش پیری در کوئے عشق دیدم　　با دست اشارتم کرد کہ عزم سوئے ما کن

عین انتقال کے قریب فرمایا:-

گر مومنی و شیریں ہم مومنست مرگت　　ور کافری و تلخی ہم کافرست مردن

۵ جمادی الآخری ۶۷۲ھ کو بوقت غروب آفتاب حقائق و معارف بیان فرماتے ہوئے انتقال ہو

فرمایا انتقال کے وقت مولانا کی عمر ۶۸ برس تین ماہ کی تھی۔

جنازہ کو جب باہر لائے قیامت کا اژدحام برپا ہوا۔ ہر قوم و ملت کے لوگ ساتھ تھے اور سب روتے جاتے تھے یہودی اور عیسائی توریت و انجیل پڑھتے جاتے تھے مسلمان ان کو ہٹاتے تھے مگر وہ باز نہیں آتے تھے فساد کا اندیشہ ہوا جب یہ خبر پروانہ[1] کو پہونچی تو اس نے راہبوں اور قسیسوں سے پوچھا کہ تمہیں اس امر سے کیا تعلق ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہم نے انبیائے سابقین کی حقیقت کو انہی کے بیان سے سمجھا اور اولیائے اکمل کی روش کو انہی کی روش سے جانا۔ وہ لوگ اسی طرح تابوت کے ساتھ رہے ہجوم کی حالت یہ تھی کہ تابوت صبح سویرے مدرسے سے روانہ ہوا تھا اور شام کے قریب قبرستان پہونچا۔ آخر بوقت شب یہ آفتاب فقر و تصوف دیدۂ ظاہر سے نہاں ہو گیا۔

اخلاق و خصوصیات

مولانا شبلی مرحوم سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں:۔

> "مولانا جب تک تصوف کے دائرہ میں نہیں آئے آپ کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی ایک شان رکھتی تھی ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء و طلبہ بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا۔ سلاطین و امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی۔ درس و تدریس، پند و افتاء کا سلسلہ اب بھی جاری تھا لیکن وہ پچھلی زندگی کی صرف ایک یادگار تھی۔ ورنہ زیادہ تر کیفیت و حالت کے نشہ میں سرشار رہتے تھے۔"

ریاضت و مجاہدہ

ریاضت و مجاہدہ حد سے بڑھا ہوا تھا۔ سپہ سالار جو برسوں ساتھ رہے ہیں ان کا بیان ہے کہ

---

[1] معین الدین پروانہ حاکم قونیہ۔

میں نے کبھی ان کو شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا، بچھونا اور تکیہ بالکل نہیں ہوتا تھا، قصداً لیٹتے نہیں تھے، نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے، ایک غزل میں فرماتے ہیں:۔

چہ آساید بہر پہلو کہ خسپد کسے کز خار دارد او نہالین

سماع کے جلسوں میں مریدوں پر جب نیند غالب ہوتی تو ان کے لحاظ سے دیوار سے ٹیک لگا کر زانو پر سر رکھ لیتے کہ وہ لوگ بے تکلف ہو کر سو جائیں، وہ لوگ پڑ کر سو جاتے تو فوراً اٹھ بیٹھتے، اور ذکر و شغل میں مصروف ہوتے، ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہمہ خفتند و من دل شدہ را خواب نبود ہمہ شب دیدۂ من بر فلک استارہ شمرد
خواہم از دیدہ چناں رفت کہ ہرگز ناید خواب من زہر فراق تو بنوشید و بمرد

روزہ اکثر رکھتے تھے اور مسلسل کئی کئی روز کچھ نہ کھاتے تھے۔

نماز کی کیفیت

نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ کی طرف مڑ جاتے اور چہرہ کا رنگ بدل جاتا، نماز میں نہایت استغراق ہوتا تھا، سپہ سالار کہتے ہیں کہ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اول عشاء کے وقت سے نیت باندھی، اور دو رکعتوں میں صبح ہو گئی، مولانا نے ایک غزل میں اپنی نماز کی کیفیت بیان کی ہے، فرماتے ہیں:۔

چو نماز شام ہر کس بنہد چراغ و خوانے منم و خیال یارے غم و نوحہ و فغانے
چو وضو ز اشک سازم بود آتشیں نمازم در مسجدم بسوزد چو بدو رسد اذانے
عجبا نماز مستاں تو بگو درست ہست آں کہ نداند او زمانے نہ شناسد او مکانے
عجبا دو رکعت است ایں عجبا چہارم است ایں عجبا چہ سورہ خواندم چو نداشتم زبانے
در حق چگونہ کوبم کہ نہ دست ماند نہ دل دل و دست چوں تو بردی بدہ اے خدا امانے

بخدا خبر ندارم چو نماز می گزارم
کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

ایک دفعہ جاڑوں کے دن تھے، مولانا نماز میں اس قدر روئے کہ تمام چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی، جاڑے کی شدت کی وجہ سے آنسو جم کر یخ ہو گئے، لیکن وہ اسی طرح نماز میں مشغول رہے۔

زہد و قناعت

مزاج میں انتہا درجہ کا زہد و قناعت تھی، تمام سلاطین و امراء نقدی اور ہر قسم کے تحائف بھیجتے تھے لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے، جو چیز آتی اسی طرح صلاح الدین زرکوب یا چلپی حسام الدین کے پاس بھجوا دیتے، کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں نہایت تنگی ہوتی، اور مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد اصرار کرتے تو کچھ رکھ لیتے، جس دن گھر میں کھانے کا سامان کچھ نہ ہوتا تو بہت خوش ہوتے، اور فرماتے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بو آتی ہے۔

فیاضی و ایثار

فیاضی و ایثار کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو عبا یا کرتا یا جو کچھ بدن پر ہوتا اتار کر دے دیتے، اسی لحاظ سے کرتا عبا کی طرح سامنے سے کھلا ہوتا تھا کہ اتارنے میں زحمت نہ ہو۔

بے نفسی اور فنائیت

ایک دفعہ مریدوں کے ساتھ راہ میں جا رہے تھے، ایک تنگ گلی میں ایک کتا سر راہ سو رہا تھا، جس سے راستہ رک گیا تھا، مولانا وہیں رک گئے، اور دیر تک کھڑے رہے، اُدھر سے ایک شخص آ رہا تھا، اس نے کتے کو ہٹا دیا، مولانا نہایت آزردہ ہوئے، اور فرمایا کہ ناحق اس کو تکلیف دی۔

ایک دفعہ دو شخص باہم برسرِ راہ لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ او لعین! تو ایک کہے گا تو دس سنے گا۔ اتفاق سے مولانا کا ادھر گزر ہوا، آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی جو کچھ کہنا ہے مجھ کو کہو، تم مجھ کو اگر ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے، دونوں مولانا کے پاؤں پر گر پڑے اور آپس میں صلح کر لی۔

کسب حلال

معاش کا یہ طریقہ تھا کہ اوقاف کی مد سے پندرہ دینار ماہوار روزینہ مقرر تھا، چونکہ مولانا مفت خوری کو نہایت ناپسند کرتے تھے اس لئے اس کے معاوضہ میں فتویٰ لکھا کرتے تھے، مریدوں کو تاکید تھی کہ اگر کوئی فتویٰ لائے تو گو میں کسی حالت میں ہوں، ضرور خبر کر دو تاکہ یہ آمدنی مجھ پر حلال ہو۔

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ شیخ صدر الدین کو ہزاروں روپیہ کا وظیفہ ہے اور آپ کو کل پندرہ دینار ماہوار ملتے ہیں، مولانا نے کہا کہ شیخ کے مصارف بھی بہت ہیں اور حق یہ ہے کہ یہ پندرہ دینار بھی انہی کو ملنے چاہئیں۔

اہلِ دنیا سے یکسوئی

مولانا کو بالطبع امراء و سلاطین سے نفرت تھی، امراء حسنِ تعلق کی وجہ سے آکر ملتے تھے، وہ ان کی صحبت سے گھبرا کر دور بھاگتے تھے، ایک دفعہ ایک امیر نے معذرت کی کہ اشتغال سے فرصت نہیں ہوتی اس لئے کم حاضر ہو سکتا ہوں، مولانا نے فرمایا معذرت کی ضرورت نہیں، میں تمہارے نہ آنے سے زیادہ ممنون ہوتا ہوں۔[1]

مثنوی معنوی اور اس کا علمی و اصلاحی مقام و پیغام

مثنوی معنوی

مولانا کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے پرجوش طبیعت پائی تھی، عشق ان کی فطرت

---

[1] سوانح مولانا روم، باختصار و تغیر یسیر۔

میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا ظاہری علم اور عقلیات کے توغل نے اس آگ کو دبا رکھا تھا شمس تبریز کی آتشیں صحبت نے ان کی فطرت کو چھیڑ دیا اور تربیت و ماحول نے اس پر جو پردے ڈال دیئے تھے وہ دفعۃً اٹھ گئے اور وہ سراپا سوز و ساز بن گئے۔

شعلہا آخر ز ہر موئم دمید از رگ اندیشہ ام آتش چکید[1]

اس مقام پر پہنچ کر عارف کے ہر بُن مو سے صدا آتی ہے کہ۔

در جہاں یا رب ندیم من کجاست نخل سینا ئیم کلیم من کجاست[2]

یہی وجہ تھی کہ ہمدم و ہمراز کے بغیر ان کے لئے جینا محال تھا شمس تبریز کے بعد جب تک ان کو صلاح الدین زرکوب اور صلاح الدین زرکوب کے بعد جب تک ان کو حسام الدین چلپی نہیں مل گئے ان کی بے قرار طبیعت کو سکون نہیں ہوا۔

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست[3]

یہی آتش سوزاں تھی جو ان کو کشاں کشاں سماع کی طرف لے جاتی تھی اور وہ اس سے قوت اور غذا حاصل کرتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں۔

پس غذائے عاشقاں آمد سماع کہ ازو باشد خیال اجتماع
قوتے گیرد خیالات ضمیر بلکہ صورت گردد از بانگ صفیر
آتش عشق از نواہا گرد تیز آنچنانکہ آتش آن جوز ریز[4]

اسی سوز نے ان کے ساز کو چھیڑا اور خاموش رہنا ان کے لئے ناممکن کر دیا اس لئے ان کے بقول۔

چوں ز نطق از دل نشان روشنیست بستگی نطق از بے الفتی است
دل کہ دلبر دید کے ماند ترش بلبلے گل دیدہ کے ماند خمش[5]

---

[1] اقبال در مثنوی اسرار خودی [2] ایضاً۔ [3] مثنوی ص ۱۷۳ دفتر ششم [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۱۹۹

اس ساز سے جو نغمے نکلے ان کے مجموعے کا نام مثنوی ہے، یہ ان کے خیالات، حالات، واردات و تاثرات اور مشاہدات و تجربات کا آئینہ ہے، اس میں صاحب کلام کا سوز و درد، جوش و مستی، علو ایمانی و یقین بھرا ہوا ہے، اور یہی اس کی عالمگیر مقبولیت اور بے نظیر تاثیر کی اصل وجہ ہے۔ [1]

ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید

مولانا کا علمی نشو و نما تمام تر اشاعرہ کے علمی ماحول میں ہوا تھا، وہ خود ایک کامیاب مدرس اور معقولی عالم تھے، توفیقِ الٰہی نے جب ان کو معرفت و آگہی کے مقام تک پہونچایا، اور قال سے حال، خبر سے نظر، لفظ سے معانی اور اصطلاحات و تعریفات کے لفظی طلسم سے ترقی کر کے حقیقت و مغز تک پہونچے تو ان کو فلسفہ و علم کلام کی کمزوریاں اور استدلال و قیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا، اور فلاسفہ و متکلمین اور اہل استدلال کی بے بضاعتی اور حقیقت ناشناسی کی حقیقت ان پر منکشف ہو گئی، تو انھوں نے بڑی قوت اور وضاحت کے ساتھ علم کلام پر تنقید کی، وہ چونکہ اس کوچہ کے ذرہ ذرہ سے آشنا ہیں اس لئے وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہوتا ہے، اور اس کی واقعیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس عصر کے فلسفہ و عقلیات کا سب سے زیادہ زور حواسِ ظاہری پر تھا، ان حواس خمسہ کو علم اور حصول یقین کا سب سے زیادہ مستند اور قابلِ وثوق ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اور جو چیز ان کی گرفت میں نہ آسکے اور ان کے ذریعہ اس کی تصدیق نہ ہو سکے اس کی نفی اور اس کے انکار کی طرف رجحان روز بروز ترقی کر رہا تھا، معتزلہ اس حیثیت کے سب سے بڑے نقیب تھے، اس حواس پرستی نے ایمان بالغیب کو بہت نقصان پہونچایا تھا، اور شریعت اور وحی کے پیش کئے ہوئے حقائق کی طرف سے ایک طرح کی بے اعتمادی پیدا کر دی

---

[1] اقبال بال جبریل۔

بھی مولانا اسی حواس پرستی اور اس کے پرجوش وکیلوں پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

چشم حس را ہست مذہب اعتزال   دیدۂ عقل است سنی در وصال
سخرۂ حس اند اہل اعتزال   خویش را سنی نمایند از ضلال
ہر کہ در حس ماند او معتزلی است   گرچہ گوید سنیم از جاہلی است
ہر کہ بیروں شد ز حس سنی وے است   اہل بینش اہل عقل خوش پے است[1]

انھوں نے جا بجا ثابت کیا ہے کہ ان حواس ظاہری کے علاوہ انسان کو کچھ حواس باطنی عطا ہوئے ہیں، یہ حواس باطنی حواس ظاہری کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع اور دقیق ہیں، فرماتے ہیں:۔

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس   آں چو زر سرخ و ایں حسہا چو مس
اندراں بازار کاہل محشر اند   حس مس را چوں حس زر کے خرند
حس ابداں قوت ظلمت می خورد   حس جان از آفتابے می چرد[2]

ان کے نزدیک کسی چیز کے انکار کے لئے یہ ثبوت بالکل کافی نہیں کہ وہ دیکھنے میں نہیں آتی یا حواس اس کی تصدیق نہیں کرتے، ان کے نزدیک باطن ظاہر کے پیچھے پنہاں اور دوا میں فائدہ کی طرح اس میں پنہاں ہے، منکرین باطن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

حجت منکر ہمی آمد کہ من   غیر ازیں ظاہر نمی بینم وطن
ہیچ نندیشد کہ ہر جا ظاہر است   آں ز حکمتہائے پنہاں مخبر است
فائدہ ہر ظاہرے خود باطنیست   ہمچو نفع اندر دواہا مضمریست[3]

ان کا کہنا ہے کہ منکرین اپنی اسی ظاہر بینی اور کوتاہ نظری کی عادت کی وجہ سے ان حقائق باطنی کی دید سے محجوب اور اصل غایت و مقصد سے محروم ہیں:۔

---

[1] مثنوی ص [illegible] [2] ایضاً [3] ایضاً ص [illegible]

چونکہ ظاہرہا گرفتند احمقاں آں دقائق شد ازیشاں بس نہاں
لاجرم محجوب گشتند از عرض کہ دقیقہ فوت شد در معترض[۱]

وہ اس سے آگے بڑھ کر وہ عقل پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ عالم غیب کے حقائق اور انبیاء کے علوم و معارف کے بارے میں عقل بھی کوتاہ اور نارسا ہے، اس کے پاس قیاس کی کوئی بنیاد نہیں، اور وہ اس عالم کا کوئی تجربہ نہیں رکھتی، دریائے شور کا رہنے والا آب شیریں کا کیا اندازہ کر سکتا ہے؟

اے کہ اندر چشمۂ شور است جات تو چہ دانی شط و جیحون و فرات[۲]

وہ اس عقل کو جو محسوسات اور معقولات کی پابند ہو عقل جزوی کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان کے نزدیک اوہام و شکوک اس کا ثمرہ، عالم ظلمات اس کا وطن ہے، وہ عقل کے لئے باعث بدنامی اور انسان کے لئے سبب ناکامی ہے، اس عقل جزوی سے دیوانگی اچھی!

عقل جزوی آفتش وہم است و ظن زانکہ در ظلمات شد او را وطن[۳]
عقل جزوی عقل را بدنام کرد کام دنیا مرد را بے کام کرد[۴]
زیں خرد جاہل ہمی باید شدن دست در دیوانگی باید زدن[۵]

وہ کہتے ہیں کہ میں نے خود اس عقل دور اندیش کا تجربہ کیا ہے، اور اس نتیجہ تک پہنچا ہوں۔

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را[۶]

پھر وہ ایک سیدھی اور عام فہم بات کہتے ہیں کہ اگر عقل دینی حقائق و معارف کے ادراک کے لئے کافی ہوتی تو اہل منطق و استدلال اور ائمہ کلام سب سے بڑے عارف اور دین کے محرم اسرار ہوتے۔

اندریں بحث ار خرد رہ بیں بدے فخر رازی رازدار دیں بدے[۷]

ان کے نزدیک انسانوں کے ساختہ پرداختہ علوم، علم حقیقی کے لئے حجاب اور رسائی کے لئے

---

[۱] مثنوی ص[illegible] [۲] ایضاً ص[illegible] [۳] ایضاً ص[illegible] [۴] ایضاً ص[illegible] [۵] ایضاً ص[illegible] [۶] ایضاً ص[illegible] [۷] ایضاً ص[illegible]

انتشار و اضطراب کا موجب ہیں، اس لئے یقین و معرفت کے لئے ان میں اضافہ و ترقی کے بجائے کمی اور ان سے گلو خلاصی کی ضرورت ہے، فرماتے ہیں:-

گر تو خواہی کت شقاوت کم شود   جہد کن تا از تو حکمت کم شود
حکمتے کز طبع آید وز خیال   حکمتے بے فیض نور ذوالجلال
حکمت دنیا فزاید ظن و شک   حکمت دینی برد فوق فلک [1]

ان کے خیال میں استدلال، مقدمات کی ترتیب اور نتیجہ کا استخراج ایک مصنوعی طریقہ ہے اور اس سے بہت محدود اور ناقص نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں، اس سے دینی حقائق کا ثابت کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے لکڑی کے مصنوعی پاؤں کے ذریعہ آزادانہ چلنا پھرنا اور سفر طے کرنا، ان کی یہ تمثیل ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے اور زبان زد خاص و عام ہے کہ:-

پائے استدلالیان چوبیں بود   پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود [2]

ان کے نزدیک علم کلام اور متکلمانہ بحث و استدلال سے یقین کی کیفیت اور حلاوت ایمانی حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کہ متکلم جو تقلیداً متقدمین کے دلائل و براہین کو نقل کر دیتا ہے اور آموختہ سنا دیتا ہے خود بے روح اور ذوق و کیفیات یقین سے محروم ہے۔

آں مقلد صد دلیل و صد بیان   بر زبان آرد ندارد ہیچ جان
چونکہ گوینده ندارد جان و فر   گفت او را کے بود برگ و ثمر [3]

وہ اس عقل جزوی کے بجائے جو محسوسات و معلومات اور تجربات کی پابند اور دنیا کے اندر محدود ہے اس عقل ایمانی کے قائل ہیں، جو خود عقل کے لئے رہنما اور اس کے لئے چراغ راہ ہے اور جو اس سے وہ نسبت رکھتی ہے جو عقل جزوی جسم کے ساتھ، اور جس کے بغیر یہ عقل، عقل کہلانے کی مستحق نہیں، اس لئے اس کو عقل

---

[1] مثنوی ص [illegible] [2] ایضاً ص [illegible] [3] ایضاً ص [illegible]

کہہ سکتے ہیں کہ عقلِ عقل ان لوگوں کا حصہ ہے جو نور ایمان اور دولت یقین سے بہرہ ور ہیں۔

بند معقولات آمد فلسفی   شہسوار عقل عقل آمد صفی[۵]

عقل جزوی سے انسان کے دفتر کے دفتر سیاہ ہیں، عقل عقل سے عالم مطلع انوار ہے۔

عقل دفترہا کند یکسر سیاہ   عقل عقل آفاق دارد پر زماہ
از سیاہی و سپیدی فارغ است   نور ماہش بر دل وجاں بازغ است[۶]

عقل ایمانی شہر کے لئے پاسبان کا حکم رکھتی ہے، عقل جزوی کا تقاضا خوف و ہراس اور دنیا کے اندیشے ہیں، عقل ایمانی کا تقاضا اطمینان و سکون اور خواہشات نفس سے حفاظت ہے۔

عقل ایمانی چو شحنہ عادل است   پاسبان و حاکم شہر دل است
عقل در تن حاکم ایمان بود   کز بیمش نفس در زندان بود[۷]

ان کے نزدیک جس طرح حواس عقل کے تابع اور محکوم ہیں اسی طرح عقل پر روح کو تفوق اور حکومت حاصل ہے، روح ایک اشارہ میں عقل کی سیکڑوں گرہیں کھول دیتی ہے اور ذکی دماغوں کی مشکل آسان کر دیتی ہے۔

حس اسیر عقل باشد اے فلاں   عقل اسیر روح باشد ہم بداں
دست بستہ عقل را جاں باز کرد   کارہائے بستہ را ہم ساز کرد[۸]

فلسفی دنیا معقولات اور ابتدائی معلومات کی منزل سے آگے نہیں بڑھتا، اس کی عقل نے ابھی دروازہ سے باہر قدم بھی نہیں نکالا ہے۔

فلسفی گوید ز معقولات دوں   عقل از دہلیز می ناید بروں[۹]

فلسفی جو اپنی عقل و فکر کا مارا ہوا ہے وہ ایسا بدقسمت مسافر ہے کہ اس کی پشت منزل کی طرف اور رخ صحرا کی طرف ہے، اس لئے وہ جس قدر تیز قدم بڑھاتا ہے منزل مقصود سے دور ہو جاتا ہے۔

---

[۵] مثنوی ص [illegible] [۶] ایضاً ص [illegible] [۷] ایضاً ص [illegible] [۸] ایضاً ص [illegible] [۹] ایضاً ص [illegible]

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت   گو بدو کو راست سوئے گنج پشت
گو بدو چندانکہ افزون می دود   از مراد دل جدا تر می شود[1]

فلسفی دنیا کے علوم سے باخبر، بڑا وسیع النظر، صدہا چیزوں سے آشنا، مگر اپنے سے ناآشنا ہے، حالانکہ سب سے بڑا علم خود شناسی ہے۔

صد ہزاراں فضل داند از علوم   جان خود را می نداند این ظلوم
داند او خاصیت ہر جوہرے   در بیان جوہر خود چون خرے
قیمت ہر کالہ می دانی کہ چیست   قیمت خود را ندانی ز احمقیست
جان جملہ علمہا این است این   کہ بدانی من کیم در یوم دین[2]

وہ اپنے زمانہ کے عالموں و متکلموں کو حکمت یونانی سے حکمت ایمانی کی طرف ہجرت کی دعوت دیتے ہیں، جو حقیقی علم اور حکمت ہے۔

چند چند از حکمت یونانیان   حکمت ایمانیان را ہم بخوان[3]

وہ کہتے ہیں کہ تزکیہ نفس سے صحیح معرفت نفس حاصل ہوگی، اور جب دل جتنی صاف ہوگی حکمت ایمانی کے نقوش اتنے ہی روشن اور اجاگر ہوں گے، اس وقت بغیر کتاب و استاد کے انبیاء علیہم السلام کے علوم و معارف وارد ہوں گے اور حکمت کے دہانے کھل جائیں گے۔

خویش را صافی کن از اوصاف خود   تا ببینی ذات پاک صاف خود
بینی اندر دل علوم انبیاء   بے کتاب و بے معید و اوستا[4]

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

آئینہ دل چون شود صافی و پاک   نقشہا بینی برون از آب و خاک

---

[1] مثنوی ص۳۳۵ [2] ایضاً ص۲۲۴ [3] ایضاً ص۵۰ [4] ایضاً۔

روزن دل گر گشادست و صفا   می رسد بے واسطہ نور خدا

دعوتِ عشق

ساتویں صدی میں علم کلام اور عقلیت کی جو سرد ہوا عالم اسلام میں مشرق سے مغرب تک چل گئی تھی اس سے دل کی انگیٹھیاں سرد ہو گئی تھیں، اگر کہیں عشق کی چنگاریاں تھیں تو راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی تھیں، ورنہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک افسردہ دلی بلکہ مردہ دلی چھائی ہوئی تھی، اور کہنے والا دیر سے کہہ رہا تھا کہ۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے   مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

اس سرد اور خواب آور فضا میں مولانا نے عشق کی صدا بلند کی، اور اس زور سے بلند کی کہ ایک بار عالم اسلام کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔

مولانا نے کھل کر عشق کی دعوت دی اور محبت کی کرامت اور عشق کی کرشمہ سازیاں بیان کیں۔

از محبت تلخہا شیریں شود   وز محبت مسہا زریں شود
از محبت دردہا صافی شود   وز محبت دردہا شافی شود
از محبت سجن گلشن می شود   بے محبت روضہ گلخن می شود
از محبت سنگ روغن می شود   بے محبت موم آہن می شود
از محبت سقم صحت می شود   وز محبت قہر رحمت می شود
از محبت مردہ زندہ می شود   وز محبت شاہ بندہ می شود[1]

وہ عشق کی طاقت و رفعت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

---

[1] مثنوی ص ۱۱۔

جسم خاک از عشق بر افلاک شد　　کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جان طور آمد عاشقا　　طور مست و خر موسیٰ صاعقا لہ

وہ فرماتے ہیں، عشق نہایت غیور و خود دار ہے، وہ ہفت اقلیم کی سلطنت کو خاطر میں نہیں لاتا، جس نے ایک بار اس کا مزہ چکھ لیا، اس نے پھر کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو　　عجب چیز ہے لذت آشنائی کہ

وہ دو عالم سے بیگانہ اور دنیا کا سب سے بڑا مست و دیوانہ ہے۔

با دو عالم عشق را بیگانگی　　اندرو ہفتاد و دو دیوانگی سہ

وہ شاہوں کا شاہ اور سلطانوں کا مطلوب ہے، بادشاہوں کے تخت و تاج اس کے قدموں کے نیچے ہیں۔

سخت پنہاں است و پیدا حیرتش　　جان سلطانان جاں در حسرتش
غیر ہفتاد و دو ملت کیش او　　تخت شاہان تختہ بندے پیش او کہ

اس فقر جسور اور عشق غیور کا جب وہ تذکرہ کرنے لگتے ہیں تو خود ان پر جوش و سرمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بے خود ہو کر کہنے لگتے ہیں۔

ملک دنیا تن پرستان را حلال　　ما غلام ملک عشق بے زوال ھہ

وہ کہتے ہیں کہ عشق کیا ہی وہ بیماری ہے جس سے بیمار کبھی شفا نہیں چاہتا بلکہ اس میں اضافہ و ترقی ہی کی دعا کرتا ہے۔

جملہ رنجوراں شفا جویند و این　　رنج افزون جوید و درد و حنین
خوشتر زین سم ندیدم شربتے　　زین مرض خوشتر نباشد صحتے لہ

لیکن وہ ایسی بیماری ہے کہ پھر کوئی بیماری نہیں ہوتی۔

لہ مثنوی ص۵　کہ بال جبریل ص[illegible]　سہ ایضاً ص[illegible]　کہ ایضاً ص[illegible]　ھہ ایضاً ص[illegible]　لہ ایضاً ص[illegible]

آں کرامت نی ربود از قبول   واں ملامت کی جہاند از مقام[1]

ملامت بھی ایسی بری ہے کہ ہزار حسنیں اس پر قربان اس کی کلفت ایسی کلفت ہے کہ ہزاروں راحتیں اس پر نثار۔

ایں مقام عشق جان محنت است   رنج ایں محنت بہ از راحت است[2]

یہ عشق کا بازار گرم ہے تو ایسا گرما ہے کہ کاملین اس کے سامنے ہیچ ہیں، اس سے ایک گھڑی میں جو ترقی حاصل ہوتی ہے وہ سالہا سال کی ریاضت سے میسر نہیں۔

زیں کشش بہتر بباشد لحظہ   سالہا صحبت بدیں دم ساختے[3]

راہ عشق میں جو خون بہے وہ کسی پانی سے کم نہیں، شہید عشق کو پانی کے غسل و وضو کی ضرورت نہیں۔

خون شہیداں را ز آب اولیٰ تر است   ایں خطا از صد صواب اولیٰ تر است[4]

عاشق وہ جگر سوختہ و دل باختہ ہیں کہ ان پر عام انسانوں کے قوانین جاری نہیں کیے جا سکتے جو گاؤں سراسر ویران ہو گیا ہو اس پر خراج کیسا؟

عاشقاں را ہر نفس سوزیدنیست   بردہ ویراں را خراج و عشر نیست[5]

عشق آدم کی میراث اور زیرکی و چالاکی شیطان کا سرمایہ ہے۔

داند آں کو نیک بخت و محرم است   زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است[6]

زیرکی و چالاکی میں اپنے دست و بازو اور عقل و خرد پر اعتماد ہوتا ہے عشق میں کسی کے دامن سے وابستگی ہوتی ہے اور بے بسی۔ زیرکی و چالاکی شناوری (تیراکی) کا فن ہے عشق کشتی ہے، زیرک و چالاک کم ہی طوفان سے بچتے اور ساحل تک پہنچتے اور صاحب عشق کو غرق ہوتے کب دیکھا گیا ہے؟

زیرکی سباحی آمد در بحار   کم رہد غرق است او پایان کار

---

[1] مثنوی [illegible] [2] ایضاً [3] ایضاً [4] [illegible] [5] ایضاً [6] ایضاً [7] ایضاً [illegible] ۲۳۲

عشق چوں کشتی شود بہر خواص   کم بود آفت بود اغلب خلاص[1]

عقل کی ہوشمندی عشق کی حیرانی پر قربان کر دینے کے قابل ہے، وہ ہوشمندی محض ظن و قیاس ہے اور یہ حیرانی مشاہدہ و عرفان۔

زیرکی بفروش و حیرانی بخر   زیرکی ظنیست، حیرانی نظر[2]

مولانا عشق کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ محبوب بننا تو ہر ایک کے بس میں نہیں، لیکن عاشق بننا ممکن ہے اگر خدا نے تم کو محبوب نہیں بنایا ہے تو تم عاشق بن کر زندگی کا لطف حاصل کرو۔

تو کہ یوسف نیستی یعقوب باش   ہمچو او با گریہ و آشوب باش
تو کہ شیریں نیستی فرہاد باش   چوں نئی لیلیٰ تو مجنوں گرد باش[3]

وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عاشق بننے میں جو مزہ ہے اور ترقی ہے وہ محبوب بننے میں کہاں ہے، اگر محبوبانِ عالم کو اس دولت سرمدی کا پتہ چل جائے، محبوبوں کی صف سے نکل کر عشاق کی صف میں شامل ہو جائیں۔

ترک کن معشوقی و کن عاشقی   اے گمان بردہ کہ خوب و فائقی[4]

لیکن عشق کی یہ دولت بیدار کسی مردہ و ناپائیدار محبوب کے لائق نہیں، عشق خود زندہ ہے، اسے ایک زندہ و پائندہ محبوب چاہیے۔

عشق بر مردہ نباشد پائدار   عشق را بر حیّ جاں افزائے دار[5]

اسی زندہ و پائندہ حی و قیوم محبوب سے عشق جاوداں کی تشفی و استواری ہے، اسی سے اس کی تازگی اور آبیاری ہے۔

عشق زندہ در رواں و در بصر   ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر

---

[1] مثنوی ص۲۲۴ [2] ایضاً [3] ایضاً ص۲۴ [4] ایضاً ص۲۲۳ [5] ایضاً ص۲۴

عشق آں زندہ گزیں کو باقیست   وز شراب جانفزایت ساقیست
عشق آں گزیں کہ جملہ انبیاء   یافتند از عشق او کار و کیا[1]

حسن کی اس بارگاہ عالی میں عشق کو اپنی نارسائی کا شکوہ نہیں ہونا چاہیے کہ حسن ازل سدا سے عشق نواز اور دوست طلب ہے۔

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست   با کریماں کارہا دشوار نیست[2]

یہ عشق دیکھنے میں ایک بیماری ہے جو دل کی شکستگی سے پیدا ہوتی ہے، یہ بیماری بڑی جان لیوا ہے لیکن آدمی اگر اس کو برداشت کرے جائے تو اس کا نتیجہ معرفت حقیقی اور حیات ابدی ہے۔

عاشقی پیداست از زاری دل   نیست بیماری چوں بیماری دل
علت عاشق ز علتہا جداست   عشق اصطرلاب اسرار خداست[3]

یہ بیماری سب بیماریوں کی دوا اور ہر قسم کے نفسانی و اخلاقی امراض کے لیے شفا ہے جن روحانی امراض کے علاج سے طبیب مایوس اور مصلح و مرشد بیزار ہو چکے ہوں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی ہو عشق ایک نگاہ میں اس کو اچھا کر سکتا ہے، برسوں کا مریض جب عشق کے ہاتھوں اپنے روحانی امراض کہنہ سے شفا پاتا ہے تو سرور و بےخودی کے عالم میں پکار اٹھتا ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما   اے تو افلاطون و جالینوس ما[4]

عشق ایک شعلہ ہے جو خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتا ہے اور محبوب کے سوا کسی کا روادار نہیں، وہ بڑا موحد بڑا غیور ہے۔

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت   ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

---

[1] مثنوی ص۱ [2] ایضاً ص۱ [3] ایضاً ص۲ [4] ایضاً ص۵

تیغ لا در قتل غیر حق براند　　درنگر زاں پس کہ بعد از لا چہ ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت　　شاد باش اے عشق شرکت سوز زفت

یہ عشق الٰہی ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اس کی داستان ختم ہونے والی نہیں، زمانہ کی وسعت بھی اس کے لئے تنگ اور دنیا کی عمر بھی اس کی داستان سرائی کے لئے کوتاہ ہے، یہ تو حسن ازل کا قصہ ہے جس کا نہ اول ہے نہ آخر، اس لئے یہاں خاموشی ہی بہتر اور اعتراف عجز ہی مناسب ہے۔

شرح عشق ار من بگویم بر دوام　　صد قیامت بگذرد واں ناتمام
زانکہ تاریخ قیامت را حد است　　حد کجا آنجا کہ وصف ایزد است

جہانِ دل

لیکن یہ عشق جس کی دعوت مولانا اس درجہ جوش و خروش سے دیتے ہیں، دل کی زندگی، دل کی بیداری اور دل کی گرمی کے بغیر ممکن نہیں ہے، بدقسمتی سے مولانا کے زمانہ میں بھی ظاہری قوتوں اور محسوسات کی عظمت اور اہمیت بڑھتی جا رہی تھی اور ذہانت کی عظمت کا سکہ لوگوں پر بیٹھتا جا رہا تھا، دماغ روشن اور دل سرد ہوتے جا رہے تھے، معدہ زندگی کا مرکز بن گیا تھا، تمام مسائل کا حل کیا جا رہا تھا، مولانا نے دل کی عظمت و وسعت کی طرف توجہ کی اور اس کے عجائبات و فتوحات بیان کئے، اور باور دلایا کہ انسان اپنے اس جسم خاکی میں کیسا سدا بہار باغ رکھتا ہے، اور اس کے پہلو میں کیسی دنیا آباد ہے جس میں ملک کے ملک گم ہو جائیں، جس کو کسی دشمن کا خطرہ اور کسی رہزن کا اندیشہ نہیں۔

ایں آباد است دل اے مردماں　　حصن محکم موضع امن و اماں
گلشن خرم بکام دوستاں　　چشمہا و گلستاں در گلستاں

۱؎ مثنوی [illegible]　۲؎ ایضاً [illegible]　۳؎ ایضاً ص ۲۹

مضمون نے مبتلا کر دیا ہے۔ بہت سے جسم دلوں کے مہمان ہیں لیکن کسی کا دل سدا جوان اور ہنستا ہوا بہار بے خزاں ہے۔ جسم کا باغ برسوں میں لگتا ہے اور دم میں اجڑ جاتا ہے، دلوں کے باغ لگنے میں دیر نہیں لگتی مگر اس کی رعنائی اور تازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔

گلشنے کز بقل روید یک دم است　　گلشنے کز عقل روید خرم است
گلشنے کز گل دمد گردد تباہ　　گلشنے کز دل دمد وا فرحتاہ[۱]

وہ تلقین کرتے ہیں کہ جسم کو جوان بنانے کی سعی لاحاصل اور سکندر کی طرح چشمۂ حیوان کی ناکام تلاش کے بجائے عشق کے آب حیات کا ایک جرعہ نوش جان اور دل کی زندگی کا سامان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ صحیح معنی میں زندہ دلی اور نشاط روح حاصل ہو اور ہر دور زندگی میں توانائی و رعنائی محسوس ہو۔

دل بجو تا جاوداں باشی جواں　　از تجلی چہرہ ات چوں ارغواں
طالب دل شو کہ باشی چو دل　　تا شوی شاداں و خنداں ہمچو گل[۲]

لیکن دل کے لفظ سے دھوکہ نہ ہو، دل وہ نہیں ہے جو سینہ میں دھڑکتا ہے اور خواہشات نفس اور بوالہوسی کی آماجگاہ ہے، جو محبت کی لذت سے ناآشنا، یقین کی دولت سے محروم، ذوق و شوق سے خالی ہے، جس کی کلی کبھی کھلتی نہیں، اور جس کی قسمت کبھی چمکتی نہیں، یہ دل دل نہیں، پتھر کی ایک سل ہے۔

تنگ و تاریک است چوں جان یہود　　بینوا از ذوق سلطان ودود
نے دراں دل تاب و نور آفتاب　　نے فضا و وسعتے فتح باب[۳]

یہ دل اپنی ساخت اور اپنی صورت و شکل جسامت کے لحاظ سے ایسا ہی ایک دل ہے جیسے اہل دل کا بیدار و بینا دل، لیکن حقیقت کے لحاظ سے دیکھئے تو سوائے لفظی اشتراک اور زبانی نسبت کے دونوں میں کوئی مناسبت نہیں، وہ بھی پانی ہے جو نہر آسمانی میں رواں ہے اور وہ بھی پانی ہے جو کسی نالی

---

[۱] مثنوی صفحہ ۵۸　[۲] ایضاً صفحہ ۱۹۶　[۳] ایضاً صفحہ ۱

یا کیچڑ کے اندر ہے لیکن پہلا پانی خالص پانی ہے جس سے پیاس بھی بجھائی جا سکتی ہے اور ہاتھ بھی صاف ہو سکتے ہیں دوسرا پانی میں مٹی کا اتنا جز ہے کہ اس سے پانی کا کام لینا مشکل ہے یہی فرق دل اور دل میں ہے ایک دل مادہ پرست اور بوالہوس ایک ہے جس میں درد وہ دل انسان کا ہے لیکن دل انبیاء و اولیاء کا ہے جس کی بلندی کے سامنے آسمان بھی پست اور جس کی وسعت کے آگے سارے عالم کی وسعت گرد ہے اس لئے سوچ سمجھ کر دیکھو کہ اپنے پہلو میں بھی دل ہے

تو ہمی گوئی مرا دل نیز ہست — دل فراز عرش باشد نے بپست
در گِل تیرہ یقیں ہم آب ہست — لیک ازاں آبے نباید آبدست
زانکہ گر آب ست مغلوب گِل ست — پس دل خود را مگو کایں ہم دل است
آں دلے کز آسمانہا برتر است — آں دل ابدال یا پیغمبر است[1]

لیکن پھر تسلی دیتے ہیں کہ دل بہرحال دل ہے اور خدا کے یہاں کوئی دل مردود نہیں وہ ہر دل کا خریدار ہے اس لئے کہ خریداری سے اس کو کوئی فائدہ مقصود نہیں۔

کالۂ کہ ہیچ خلقش ننگرید — از خلاقت آں کریم آں را خرید
ہیچ قلبے پیش او مردود نیست — زانکہ قصدش از خریدن سود نیست[2]

پھر وہ فرماتے ہیں کہ معدہ کے قفس زریں کو چھوڑ کر دل کی آزاد بستی کی سیر کرو اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو، تمہارے اور خالق کے درمیان بڑا حجاب یہی معدہ اور شکم پرستی ہے تم اس حجاب سے نکلو کہ تم کو اس بارگاہ عالی سے سلام پہونچے۔

معدہ را بگذار سوئے دل خرام — تا کہ بے پردہ ز حق آید سلام[3]

مقام انسانیت

مستبد شخصی سلطنتوں کے اثرات اور پیہم مظالم مسلسل جنگوں کے نتیجے میں عام انسانوں میں

---

[1] مثنوی ص ٢٢ [2] ایضاً ص ٥ [3] ایضاً ص ٢٥

زندگی سے بیزاری اپنے مستقبل سے مایوسی اور احساس کمتری پیدا ہو گیا تھا، اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گیا تھا، بعض تصوف نے فنائیت، انکارِ ذات، خود شکنی کی تلقین اتنے جوش اور تسلسل سے کی تھی کہ خودنگری اور خودشناسی جس پر ترقی جدوجہد اور کشمکش موقوف ہے ایک اخلاقی جرم اور مانع ترقی سمجھی جانے لگی تھی، انسانوں کے سامنے ملکوتی صفات کے حصول اور لوازم بشریت سے انسلاخ، تجرد و تفرید کی تبلیغ اس انداز پر ہوئی تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی تھی اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں بلکہ ترکِ انسانیت میں سمجھنے لگا تھا۔ عام طور پر مقام انسانیت سے غفلت اور انسان کی رفعت و شرافت سے ذہول پیدا ہو گیا تھا، اور اس وقت کی ادبیات اور شعر و شاعری میں تحقیرِ انسانیت کی روح سرایت کر گئی تھی، اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ تھا کہ لوگوں میں عام طور پر اپنے بارہ میں بے اعتمادی، ناامیدی، افسردگی اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی اور انسان بعض اوقات حیوانات اور جمادات پر رشک کرنے لگتا تھا، وہ جوہرِ انسانیت سے ناواقف اور اپنی عظمتوں اور ترقیات سے غافل تھا، مولانا نے مخصوص انداز میں اس پہلو کو ابھارا اور انسان کی بلندی کا ترانہ اس جوش سے بلند کیا کہ اس کی سوئی ہوئی خودی بیدار ہو گئی، اور وہ اپنے مقام سے آگاہ ہو گیا، مولانا کی اس رجز خوانی کا پوری اسلامی ادبیات پر اثر پڑا اور اس نے شعر و شاعری اور تصوف میں ایک نیا رجحان پیدا کر دیا۔

مولانا انسان کو اپنی انسانی عظمت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا "احسن تقویم" کے خطاب سے یاد فرمایا ہے، یہ لباس موزوں خاص طور پر اسی کے لئے قطع کیا گیا ہے، اور اسی کی قامت پر راست آتا ہے۔

احسن التقویم در والتین بخواں   کہ گرامی گوہر است اے دوست جاں
احسن التقویم از فکرت بروں   احسن التقویم از عرش ست فزوں[1]

---

[1] مثنوی ج ۶ ص ۵۸۵

وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے سوا اور کسی کے سر پر کرامت کا تاج رکھا گیا ہے اور نہ ”انا اعطیناک“ کے خطاب سے مشرف کیا گیا ہے؟!

ہیچ کرمنا شنید ایں آسمان　　کہ شنید ایں آدمی پر غمان[1]
تاج کرمناست بر فرق سرت　　طوق اعطیناک آویز برت[2]

وہ فرماتے ہیں کہ انسان خلاصۂ کائنات اور مجموعۂ اوصافِ عالم ہے انسان کیا ہے ایک کوزہ میں دریا بند ہے اور ایک قطرے کے وجود میں پورا عالم پنہاں ہے۔

آفتابے در یکے ذرہ نہان　　ناگہاں آں ذرہ بکشاید دہان
ذرہ ذرہ گردد افلاک و زمین　　پیش آں خورشید چوں جست از کمین[3]
بحر علمے در نمی پنہاں شدہ　　در سہ گز تن عالمے پنہاں شدہ[4]

انسان آفرینشِ عالم کا مقصود اور تمام کائنات کا محسود ہے اسی سے اس عالم کا رنگ و بو اور زندگی کی آبرو ہے اسی کی اطاعت تمام موجودات پر فرض ہے۔

ہر شرابے بندۂ آں قد و خد　　جملہ مستاں را بود بر تو حسد
ہیچ محتاج مئے گلگوں نۂ　　ترک کن گلگونہ تو گلگونۂ
جوہر است انسان و چرخ او را عرض　　جملہ فرع و سایہ اند و تو غرض
علم جوئی از کتبہا اے فسوس　　ذوق جوئی تو ز حلوائے سبوس
خدمتت بر جملہ ہستی مفترض　　جوہرے چون عجز دارد با عرض[5]

یہی نہیں بلکہ انسان مظہرِ صفاتِ الٰہی ہے وہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تجلیات و آیات کا عکس نظر آتا ہے۔

۱؎ مثنوی [illegible]　۲؎ ایضاً [illegible]　۳؎ ایضاً [illegible]　۴؎ ایضاً [illegible]　۵؎ ایضاً

آدم اسطرلاب اوصاف علوست ۔۔۔ وصف آدم مظہر آیات اوست
ہرچہ در وے می نماید عکس اوست ۔۔۔ ہمچو عکس ماہ اندر آب جوست
خلق را چوں آب داں صاف و زلال ۔۔۔ اندر و تاباں صفات ذوالجلال
علمشان و عدلشان و لطفشان ۔۔۔ چوں ستارہ چرخ در آب رواں[1]

اس سب کے فرمانے کے بعد وہ محسوس کرتے ہیں۔ انسان کی تعریف اور اس کی قدر و قیمت کا بیان اب بھی مکمل نہیں اور سچ پوچھئے تو کسی میں اس کے سننے کی تاب بھی نہیں۔

گر بگویم قیمت آں ممتنع ۔۔۔ من بسوزم ہم بسوزد مستمع[2]

اس رفعت و بلندی کے بعد خدا کے سوا انسان کا کون خریدار ہو سکتا ہے، اور کون اس کی قیمت لگا سکتا ہے۔ حیف ہے کہ انسان خود اپنی قیمت نہ جانے اور ہر قیمت پر ہر ایک کے ہاتھ بک جانے کے لئے تیار ہو۔ وہ بڑی دل سوزی سے فرماتے ہیں۔

اے غلامت عقل و تدبیرات و ہوش ۔۔۔ چوں چنینی خویش را ارزاں فروش[3]

پھر فرماتے ہیں کہ انسان کا سودا ہو چکا ہے اللہ اس کا خریدار ہے اور وہی انسان کا سچا قدر دان ہے

مشتری ما است اللہ اشتریٰ ۔۔۔ از غم ہر مشتری ہیں برتر آ
مشتری جو کہ جویاں تو است ۔۔۔ عالم آغاز و پایان تو است[4]

لیکن یہ سب ان انسانوں کا تذکرہ ہے جو جوہر انسانیت سے آراستہ اور حقیقت انسانیت سے آشنا ہیں ان انسان نما آدمیوں کا ذکر نہیں جو انسانیت کا قول اور صورت ہی صورت ہیں جو اپنے نفس کے لئے جیتے ہیں، وہ خواہشات نفس کے قتیل ہیں، یہ آدمی نہیں ہیں آدمی کی بے جان تصویریں ہیں۔

ایں ہمہ را [illegible] صورت اند ۔۔۔ مردۂ نان اند و کشتۂ شہوت اند[5]

---

[1] مثنوی [illegible] [2] ایضاً [illegible] [3] ایضاً [illegible] [4] ایضاً [illegible] [5] ایضاً [illegible]

ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی حقیقی انسان کمیاب اور عنقا صفت تھا، عام طور سے وہی انسان ملتے تھے جو چوپایوں اور درندوں کے اخلاق رکھتے تھے، مولانا ان بہائم صفت اور درندہ خصلت انسانوں سے اکتا گئے تھے اور ان کو انسان کی تلاش تھی، اپنی تلاش تھی اپنی کوشش کا واقعہ ایک دلچسپ مکالمہ کی شکل میں بیان فرماتے ہیں۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

دعوتِ عمل

مولانا کا تصوف اہمال کی تلقین، تعطل، بے عملی اور رہبانیت کی تبلیغ نہیں، وہ عمل، جدوجہد، کسب اور اجتماعی زندگی کے داعی اور مبلغ ہیں، رہبانیت اور ترکِ دنیا کو اسلام کی روح کے منافی اور تعلیمات نبوت کا مخالف سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اگر اجتماعی زندگی مطلوب نہ ہوتی تو جمعہ و جماعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کیوں ہوتی؟ فرماتے ہیں۔

مرغ گفتش خواجہ در خلوت مایست — دین احمد را ترہب نیک نیست
از ترہب نہی فرمود آں رسول — بدعتے چوں در گرفتی اے فضول
جمعہ شرط است و جماعت در نماز — امر معروف و ز منکر احتراز
در میان امت مرحوم باش — سنت احمد مہل محکوم باش[1]

ان کے زمانہ میں توکل، تعطل ہی کا مرادف بن کر رہ گیا تھا، کسی قسم کی احتیاط و انتظام توکل

---

[1] [illegible]

کے مسائل سمجھا جاتا تھا اور بڑی قدر سے دیکھا جاتا تھا، مولانا نے توکل کا شرعی مفہوم بیان کیا، اور کسب کی ترغیب دی، اور اس کی فضیلت بیان کی "اعقلہا و توکل علی اللہ"[1] کا مضمون حدیث بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

گفت پیغمبر بآواز بلند — با توکل زانوے اشتر ببند
رمز الکاسب حبیب اللہ شنو — از توکل در سبب کاہل مشو
رو توکل کن تو با کسب اے عمو — جہد می کن کسب می کن مو بمو
جہد کن جدے نما تا وارہی — ور تو از جہد تہی بمانی ابلہی

انھوں نے نخچیر (جانوروں) کی زبان سے توکل و تعطل کے وہ تمام دلائل نقل کر دیئے ہیں جو عام صوفیہ ضعیف الہمت اشخاص پیش کیا کرتے ہیں، یہ دلائل بڑے معقول اور وزنی معلوم ہوتے ہیں پھر ان کا تفصیل سے جواب دیا ہے شیر کا جواب مولانا کے اصلی خیالات کا آئینہ ہے۔

شیر کی زبان سے وہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کو جو اعضاء و جوارح اور جو صلاحیتیں اور طاقتیں دی گئی ہیں ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے کوشش اور جد و جہد مطلوب ہے، اگر کوئی شخص اپنے غلام کے ہاتھ میں کدال یا پھاوڑا دے دے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے وہ زمین کھودے یا چٹان توڑے اس کے لئے زبان سے کہنے کی کچھ ضرورت نہیں، اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قدرت دی گئی ہے تو اس کا منشا یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں اور جسمانی قوت سے کام لیں اور اپنے ارادہ و اختیار کو عمل میں لائیں، اسی بنا پر سعی و عمل اور کسب و جہد میں خدا کی مرضی اور فطرت کا اشارہ ہے، تعطل اور ترک عمل قضائے الٰہی کے خلاف اور کفران نعمت ہے، صحیح توکل یہ ہے کہ کوشش میں کمی نہ کی جائے اور نتیجہ کے بارے میں خدا پر بھروسہ کیا جائے کہ پھل کا دینا خدا کے ہاتھ میں ہے فرماتے ہیں:۔

---

[1] اس کو باندھ دو پھر خدا پر توکل کرو۔ ج ۱ ص ۳۰

گفت شیر آری ولے رب العباد   نردبانے پیش پائے ما نہاد
پایہ پایہ رفت باید سوئے بام   ہست جبری بودن اینجا طمع خام
پائے داری چوں کنی خود را تو لنگ   دست داری چوں کنی پنہاں تو چنگ
خواجہ چوں بیلے بدست بندہ داد   بے زباں معلوم شد او را مراد
چوں اشارتہاش را بر جاں نہی   در وفائے آں اشارت جاں دہی
پس اشارتہاش اسرارت دہد   بار بردارد ز تو کارت دہد
سعی شکر نعمت قدرت بود   جبر تو انکار آں نعمت بود
شکر نعمت نعمتت افزوں کند   کفر نعمت از کفت بیروں کند
ہاں مخسپ اے جبری بے اعتبار   جز بزیر آں درخت میوہ دار
تا کہ شاخ افشاں کند ہر لحظہ باد   بر سر خفتہ بریزد نقل و زاد
گر توکل می کنی در کار کن   کسب کن پس تکیہ بر جبار کن[1]

پھر شیر کی زبان سے وہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جدوجہد اور سعی و عمل سنت انبیاء اور طریق اولیاء ہے پھر وہ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ مال و اولاد دنیا نہیں ہے جس کی شریعت میں مذمت ہے اور جو خدا کی رحمت سے دور ہے وہ غفلت کی زندگی ہے وہ فرماتے ہیں:۔

شیر گفت آرے ولیکن ہم ببیں   جہد ہائے انبیاء و مرسلیں
حق تعالے جہد شاں را راست کرد   آنچہ دیدند از جفا و گرم و سرد
جہد می کن تا توانی اے کیا   در طریق انبیاء و اولیاء
چیست دنیا از خدا غافل بدن   نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

---

[1] دیوان ص ۲۴

مال را کز بہر دیں باشی حمول | نعم المال صالح گفت آں رسول
جہد حق است و دوا حق است و درد | منکر اندر نفی جہدش جہد کرد

وہ صرف اپنے زمانہ کے علماء ہی پر تنقید نہیں کرتے، اور صرف ان غلطیوں ہی پر نہیں ٹوکتے جن کا تعلق علمی اور دینی حلقوں سے ہے بلکہ وہ پوری جرأت کے ساتھ حکمراں طبقہ کی بھی تنقید کرتے ہیں جن کے ہاتھوں میں زمام حکومت تھی، وہ برملا اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ حکومت نااہلوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے اور بازیچۂ اطفال بن گئی ہے، مطلق العنان شخصی سلطنت کے زمانہ میں یہ تنقید بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے، مگر مولانا کی حق گو زبان خاموش نہیں رہتی، وہ فرماتے ہیں۔

حکم چوں در دست نادان اوفتاد | لاجرم ذوالنون بزندان اوفتاد
چوں قلم در دست غدارے بود | لاجرم منصور بر دارے بود
چوں سفیہاں را بود کار و کیا | لازم آمد یقتلون الانبیاء

حکومت کے نا اہل ہاتھوں میں ہونے کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے اپنے زمانہ کی شکایت فرماتے ہیں۔

حکم چوں در دست گمراہے بود | جاہ پندارید و در چاہے فتاد
احمقاں سرور شدستند و ز بیم | عاقلاں سرہا کشیدہ در گلیم

عقائد و علم کلام

مولانا نے عقلیات و الہیات پر صرف تنقید اور اپنے زمانہ کے علم کلام کی بے اعتدالی ظاہر کرنے پر ہی اور عقلی معرکہ آرائی پر گرفت ہی نہیں کی اور صرف بدیہی احساسات و وجدان اور دل سے کام لینے اور عشق کو دعوت دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کلامی مسائل و مشکلات کو اپنے مخصوص انداز سے حل کرنے

---

[1] مثنوی دفتر [illegible] [2] ایضاً [illegible] [3] ایضاً [illegible]

اور اپنے مخصوص پیرایہ میں بیان کرنے اور دل نشین کرنے کی کوشش بھی کی ہے گویا مولانا کی دعوت اور ان کا فلسفہ صرف سلبی اور ناقدانہ ہی نہیں ہے بلکہ ایجابی اور معلمانہ بھی ہے جن مسائل کے حل کرنے میں علم کلام کے بازو شل ہو کر رہ گئے ہیں اور جن گتھیوں کے سلجھانے کی کوشش میں اور بے شمار گتھیاں پڑ گئی ہیں مولانا ان مسائل کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی پیچیدگی ہی نہیں تھی اور وہ بدیہی حقائق اور روزمرہ کی زندگی کی باتیں اور واقعات ہیں مولانا کا خاص طرز یہ ہے کہ وہ دماغ کو شکست دینے کی اور مخاطب کو لاجواب کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنی بات کو اس کی خوشی اور رضامندی سے دل میں بٹھانے اور ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں اور مخاطب کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ بات پہلے سے اس کے دل میں تھی اور مولانا نے اس کی ترجمانی کی ہے اس طرز کلام کا نتیجہ ہے کہ مثنوی سے دینی اصول وعقائد اور کلامی مسائل ومباحث کے بارہ میں جیسا اذعان و شرح صدر اور اطمینان قلب پیدا ہوتا ہے جو علم کلام کے پورے کتب خانہ سے نہیں پیدا ہوتا اس کے ساتھ ہی ایک ذوق وسرور بھی پیدا ہوتا ہے جو ایک صاحب یقین اور صاحب عشق ہی کے کلام سے پیدا ہو سکتا ہے۔

مولانا اگرچہ اشعری مکتب خیال کے ایک کہنہ مشق استاد اور متبحر عالم ہیں مگر وہ اپنے ذاتی تجربہ اور موہبت ربانی سے عقائد وکلام میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں اور ایک نئے علم کلام کے بانی ہیں ان کی روش علم متکلمین اور ان کے عقائد سے بالکل علیحدہ ہے اور جتنا قرآن مجید کے طرز استدلال اور فطرت سلیم سے زیادہ قریب ہے۔

وجود باری

وجود باری کا مسئلہ علم کلام اور تمام مذاہب کا معرکۃ الآرا اور بنیادی مسئلہ ہے۔ قدیم علم کلام نے اس کے وجود کے دلائل دیئے ہیں وہ محض منطقی ہیں ان سے اذعان اور یقین کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی زیادہ تر

(زیادہ آدمی) بے جواب ہو کر رہ جاتا ہے، قرآن مجید کا طرز یہ ہے کہ وہ اس بارہ میں انسان کی فطرت سلیم کو اکساتا ہے اور اس پر اظہار اعتماد کر کے اس کے سوئے ہوئے احساس کو بیدار کر دیتا ہے، وہ ضمیر کی زبان سے بے ساختہ کہلواتا ہے۔

أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ	بھلا اللہ کے بارہ میں بھی شک ہو سکتا ہے جو آسمان
(ابراہیم۔ ۱۰)	زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

اس بے ساختگی اور استعجاب سے انسان کی فطرت چونک پڑتی ہے اور وہ اپنا صحیح کام کرنے لگتی ہے پھر زمین و آسمان کی پیدائش سے پیدا کرنے والے، مصنوعات سے صانع اور آثار سے مؤثر کی طرف خود رہبری ہو جاتی ہے، سارے قرآن مجید میں یہی طرز استدلال ہے کہ اللہ کی نشانیاں دیکھو اور مخلوقات سے خالق اور مصنوعات سے صانع تک پہنچو، قرآن کے نزدیک خدا کی معرفت کا یہی یقینی، مختصر اور بے خطر راستہ ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ	اب ہم دکھلا دیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں
حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ	اور خود ان کی جانوں میں یہاں تک کہ کھل جائے
بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝	ان پر کہ یہ ٹھیک ہے، کیا تیرا رب تھوڑا ہے ہر چیز
(حم السجدہ ۵۳)	پر گواہ ہونے کے لئے۔

مولانا نے بھی مثنوی میں یہی طرز استدلال اختیار کیا ہے، وہ جا بجا کائنات سے خالق کائنات کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے لیکن کرنے والا ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا، مگر جو کچھ ہو رہا ہے یہ خود اس کی دلیل ہے کہ اس پردہ کے پیچھے کوئی کرنے والا ہے لیکن فعل ظاہر اور فاعل مخفی ہے۔

دست پنہاں و قلم بیں خط گزار   اسپ در جولان و ناپیدا سوار

تیر پیدا بیں و ناپیدا کمان ۔ جانہا پیدا و پنہاں جانِ جاں[۱]

لیکن حرکت خود محرک کے وجود کی دلیل ہے اگر تیر ہوا کی فضا میں ہے تو تیر کو چلانے والا بھی ہے۔

باد را دیدی کہ می جنبد بدان ۔ باد جنبانیست اینجا بادران
بر یقین دان نقش ہر راندہ ہست ۔ اینکہ ہر جنبیدہ جنبانندہ ہست[۲]

اگر تمہیں مؤثر نظر نہیں آتا تو آثار تو نظر آتے ہیں ان آثار سے پتہ لگاؤ کہ مؤثر ضرور ہے جسم میں یہ حرکت یہ زندگی روح سے ہے روح اگرچہ نظر نہیں آتی مگر جسم کی حرکت اس کا ثبوت ہے۔

گر تو او را می نبینی در نظر ۔ فہم کن آن را با ظہار اثر
تن بجان جنبد نمی بینی تو جان ۔ لیک از جنبیدن تن جان بدان[۳]

مؤثر کے لئے اس کے آثار اور صانع کے لئے اس کی مصنوعات سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ آفتاب کے وجود کے لئے اس کی روشنی سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہے؟

خود نباشد آفتابے را دلیل ۔ جز کہ نور آفتاب مستطیل[۴]

پھر کائنات صرف موجود ہی نہیں ہے بلکہ منظم باقاعدہ اور مرتب ہے۔ ہر چیز اپنے چوکھٹے میں جڑی ہوئی ہے سیاروں کی گردش کا ایک نظام ہے آفتاب و ماہتاب کے لئے بھی اصول و ضوابط ہیں، ابر و باد بھی بے زنجیر نہیں کہ جدھر کو چاہیں اُدھر کو چل دیں ان کے لئے بھی تازیانہ مقرر ہے اگر ذرا سرتابی کریں فوراً گوشمالی کی جائے یہ نظام و ترتیب صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کے اوپر کائنات کا خالق اور مدبر ہے اور وہ حکیم و علیم بھی ہے اور کائنات اس کے اختیار و انتظام سے کسی وقت خارج نہیں۔

---

[۱] مثنوی معنوی [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ایضاً

گرمی تو شد بیرون ستد در　　در عناصر گردش و جوشش نگر
آفتاب و ماه دو گاو خراس　　گرد می گردند و می دارند پاس
اختران هم خانه خانه می روند　　مرکب هر نحس و سعدے می شوند
ابر را هم تازیانهٔ آتشیں　　می زند کاں سو چنیں رو نے چنیں
بر فلاں وادی ببار ایں سو مبار　　گوشمالش می دہد کہ گوش دار

پھر وہ فرماتے ہیں کہ اس کائنات کو حق تعالیٰ نے اپنے فائدہ کے لئے نہیں پیدا کیا بلکہ انسان کے فائدہ اور اس کی ترقیات کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس طرح وہ خلق عالم کی مصلحت کو تسلیم کرتے ہیں فلاسفہ و متکلمین سب مگر وہاں بھی بڑے دلنشین پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ اس میں بھی ان کا اچھوتا پن اور سوز و ذوق موجود ہے۔

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است　　قصد من از خلق احسان بودہ است
آفریدم تا ز من سودے کنند　　تا ز شہدم دست آلودے کنند
نے برائے آں کہ من سودے کنم　　وز برہنہ من قبائے برکنم
من نکردم خلق تا سودے کنم　　بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

نبوت اور انبیاء

انبیاء علیہم السلام کا تعارف وہ خود ان کی زبان سے کراتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ طبیبان الٰہی اور معالجین قلوب ہیں۔ [illegible] طبیب نبض تک پہونچتے ہیں انبیاء براہ راست دل تک پہونچ جاتے ہیں [illegible] طبیبوں کا مقصد [illegible] اور [illegible] لوگوں کی غذا اور افعال و اعمال کی اصلاح و اعتدال پر توجہ دیتے ہیں

ما طبیبانیم شاگردان حق　　بحر قلزم دید ما را فانفلق

[illegible] ۱۹۵

آں طبیباں طبیعت دیگراند   کہ بدل از نبضے بنگرند
مابدل بے واسطہ خوش بنگریم   کز فراست ما باعلیٰ منظریم
آں طبیبانِ غذا اند و ثمار   جانِ حیوانی بدیشاں استوار
آں طبیبانِ فعالیم و مقال   ملہم ما پرتو نور جلال
کایں چنیں فعلے ترا نافع بود   واں چناں فعلے ز رہ قاطع شود
ایں چنیں قولے ترا پیش آورد   واں چناں قولے ترا پیش آورد
آں چناں وایں چناں از نیک بد   پیش تو جیتم و بنمائیم جسد
آں طبیباں را بود بولے دلیل   ویں دلیل ما بود وحی جلیل

دلائل نبوت میں بھی وہ عقلی دلائل و مقدمات سے استدلال کرنے کے بجائے عموماً ذوقی اور وجدانی دلائل سے استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کی ہر ادا ناطق ہے کہ وہ پیغمبر ہے، وہ سرتاپا اعجاز ہوتا ہے دیکھنے والوں کے لئے (بشرطیکہ ان میں عناد اور تکبر نہ ہو) وہ خود اپنی نبوت کا دلیل ہوتا ہے یہی وہ چیز ہے کہ عبداللہ بن سلام نے جمال جہاں آرا پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ فرمایا تھا۔

واللہ ھذا لیس بوجہ کذاب   بخدا یہ کسی دروغ گو کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔

در دل ہر کس کہ دانش را مزہ ست   روئے و آواز پیغمبر معجزہ است

وہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اور امت کے ضمیر میں ایک ایسی مناسبت ہوتی ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہتا ہے امت کا ضمیر اس پر آمنا و صدقنا ہی پکارتا ہے، امت کا ضمیر پیغمبر کی ہر صدا پر وجد کرنے لگتا ہے اس لئے کہ وہ صدا ایسی دلکش ایسی معصوم اور دنیا میں ایسی انوکھی اور نرالی ہے کہ اس میں اور کسی صدا اور دعوت میں کوئی مناسبت اور کسی اشتباہ کا موقع نہیں، فرماتے ہیں۔

---

[1] مثنوی صفحہ ۲۵

چون پیمبر از برون بانگی زند　　جان امت در درون سجدہ کند
زانکہ جنس بانگ او اندر جہان　　از کسی نشنیدہ باشد گوش جان
آن غریب از ذوق آواز غریب　　از زبان حق شنود انی قریب[1]

وہ کہتے ہیں کہ سننے والوں کو پیغمبر کی صداقت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ان کا کہنا دعوٰی بھی ہے اور دلیل بھی اور نظام عالم اسی پر قائم ہے پیاسے کو اگر کسی پیالہ میں پانی کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ پانی کا ثبوت نہیں، بچہ کو ماں دودھ پلانا چاہتی ہے تو وہ دلیل کا انتظار نہیں کرتا طلب اور محبت اعتبار اور حقیقی تصدیق کے لئے کافی ہے۔

تشنہ را چون بگوئی تو شتاب　　در قدح آب است بستان زود آب
ہیچ گوید تشنہ کین دعوی است رو　　از برم ای مدعی مہجور شو
یا بطفل شیر مادر بانگ زد　　کہ بیا من مادرم ہان ای ولد
طفل گوید مادرا حجت بیار　　تا کہ با شیرت بگیرم من قرار[2]

ان کے نزدیک معجزہ موجب ایمان نہیں ہے یعنی ضروری نہیں کہ معجزہ دیکھنے والا ایمان لے ہی آئے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ معجزہ دیکھ کر ایمان لانے والوں کے نام سیرت میں مشکل سے ملیں گے، اکثر صحابہ وہی ہیں جو خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر ایمان لائے تھے اور اصل ایمان انہی کا ہے مولانا فرماتے ہیں کہ معجزات تو مغلوب اور لاجواب کرنے کے لئے ہیں اور جو مغلوب و لاجواب ہوتا ہے وہ مشکل سے یار بنتا اور جان نثار بنتا ہے، اصل کشش اور تسخیر کی چیز جنسیت اور مناسبت ہے۔

موجب ایمان نباشد معجزات　　بوی جنسیت کند جذب صفات[3]

---

[1] مثنوی دفتر ۲　[2] ایضاً

معجزات از بہر قہر دشمن است　　بوئے جنسیت سوئے دل بردن است
قہر گردد دشمن اما دوست نے　　دوست کے گردد بہ بستہ گردنے[1]

انبیاء کے تذکرہ میں وہ فرماتے ہیں کہ وہ بڑے غیور اور خوددار ہوتے ہیں، ان سے استفادہ کے لئے ادب اور نیاز مندی شرط ہے، وہ سلطان مزاج[2] ہیں، ان کا منصب یہ ہے کہ وہ فرمائیں اور دوسرے سنیں، مساوات اور مجادلہ محرومی کا باعث اور حجاب اکبر ہے۔

گر ہزاراں طالب اند و یک ملول　　از رسالت باز می ماند رسول
ایں رسولان ضمیر راز گو　　مستمع خواہند اسرافیل خو
نخوتے دارند و کبرے چوں شہاں　　چاکری خواہند از اہل جہاں
تا ادبہا شان بجا گہ ناوری　　از رسالت شان چگونہ برخوری[3]

فرماتے ہیں کہ اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ یہ دیکھو کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کس کا پیام لائے ہیں۔

ہر ادب شان کے ہمی آید پسند　　کامدند ایں از در ایوان بلند[4]

معاد

مولانا کے نزدیک موت حقیقی زندگی کا پیش خیمہ اور انسان کی ترقی کا زینہ ہے، آبادی ویرانی کے بغیر ممکن نہیں، خزانہ جب ہی دستیاب ہوتا ہے جب زمین کھود دی جاتی ہے، جب بنے ہوئے مکان کو ویران کیا جا رہا ہو تو سمجھو کہ دوبارہ آباد کرنے کا سامان کیا جا رہا ہے۔

شاہ جان جسم را ویران کند　　بعد ویرانیش آبادان کند
کرد ویران خانہ بہر گنج زر　　وز ہمان گنجش کند معمور تر[5]

---

[1] مثنوی [illegible]　[2] [illegible]　[3] مثنوی [illegible]　[4] ایضاً　[5] ایضاً ص ۱۲

اس جسم خاکی کی شکست ایک بڑی تعمیر کی علامت ہے کلی کے چٹکنے سے سمجھ لینا چاہیے کہ پھل آنے والے ہیں۔

چوں شگوفہ ریخت میوہ سر کند
چونکہ تن بشکست جاں سر بر کند[1]

وہ جواد مطلق وہ دنیا میں برحق جان جیسی دولت ختم کرکے بالکل بخیل بنے گا۔ اس لئے سمجھنا چاہیے کہ وہ زار و نزار جان لے کر زندگی جاوداں عطا فرمانا چاہتا ہے وہ اس خاکدان سے نکال کر وہ نعمتیں عطا فرمانا چاہتا ہے جو وہم و خیال میں بھی نہیں۔ مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر

آں کسے کاں چنیں شاہے کشد
سوئے تخت و بہتریں جاہے کشد
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد
انچہ در وہمت نیاید آں دہد[2]

ترقی کے مدارج عالیہ کے لئے فنا اور نیستی ضروری ہے۔ کبھی کسی نے اگلی تختی دھوئے اور پہلے نقش مٹائے بغیر تختی لکھی ہے؟ کبھی مٹی نکالے بغیر زمین کے اندر سے پانی نکلا ہے؟ لکھنے کے لئے آدمی سادہ کاغذ اور بونے کے لئے آدمی خالی زمین ڈھونڈتا ہے۔

لوح را اول بشوید بے وقوف
آنگہے بروے نویسد او حروف
وقت بشستن لوح را باید شناخت
کہ مر آں را دفترے خواہند ساخت
چوں اساس خانۂ نو افگنند
اولیں بنیاد را برمی کنند
گل برآرند اول از قعر زمیں
تا بآخر برکشی ماء معیں[3]
کاغذے جوید کہ آں بنوشتہ نیست
تخم کارد موضعے کہ کشتہ نیست

نیستی ہی ہستی کا استحقاق پیدا کرتی ہے اور خالق کی رحمت کو جوش میں لاتی ہے، شعر

---

[1] مثنوی ص [illegible] [2] ایضاً ص [illegible] [3] ایضاً ص [illegible]

ہمیشہ فقیروں ہی پر سخاوت کرتے ہیں۔

ہستی اندر نیستی بتواں نمود　　مالداران بر فقیر آرند جود

تم خود اپنی حالت پر غور کرو تم برابر ارتقا کے منازل طے کرتے آئے ہو اور ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے، تم نے ایک جامۂ ہستی اتارا، دوسرا پہنا، ایک فنا سے تم نے بقا حاصل کیا، اگر تم پہلی حالت پر رہتے تو تم کو یہ ترقی و کمال کہاں سے حاصل ہوتا اور تم آب و گل میں مقید رہتے اب آخری ترقی سے کیوں گھبراتے ہو، اور تمہارا طائر روح قفس عنصری سے نکلتے ہوئے کیوں ڈرتا ہے۔

تو ازاں روزے کہ در ہست آمدی　　آتشے یا خاک یا بادے بدی
گر بداں حالت ترا بودے بقا　　کے رسیدے مر ترا ایں ارتقا
از مبدل ہستی اول نماند　　ہستی دیگر بجائے او نشاند[1]
ایں بقاہا از فناہا یافتی　　از فنایش رو چرا بر تافتی
ایں فناہا چہ زیاں بودت کہ تا　　بر بقا چفسیدۂ اے بے نوا[2]

اس لئے دراصل موت موت نہیں زندگی کی تمہید ہے اور مرنے کا دن مومن کے لئے شام غم نہیں صبح عید ہے۔

آزمودم مرگ من در زندگی است　　چوں رہم زیں زندگی پایندگی است[3]

عارفوں کی موت کو عامیوں کی موت پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، ان کو اس جہان فانی سے چھوٹنے کا غم نہیں ہوتا موت ان کے لئے مژدۂ جانفزا اور موت کا جھونکا ان کے حق میں باد بہاری کا بن کر آتا ہے قوم عاد پر جو ہوا چلائی گئی تھی وہ حضرت ہودؑ اور ان کے ساتھیوں کے لئے نسیم بن گئی تھی۔

ہود گرد مومناں خطے کشید　　نرم می شد باد کانجا می رسید

---

[1] مثنوی صفحہ [illegible]　[2] ایضاً　[3] ایضاً صفحہ [illegible]

همچنین باد اجل با عارفان　　　نرم و خوش همچو نسیم بوستان[1]

جبر و اختیار

جبر و اختیار کی بحث علم کلام کی مشکل ترین بحثوں میں سے ہے ایک فرقہ اختیار کا منکر اور جبر محض کا قائل ہے اور عقائد و فرق کی تاریخ میں جبریہ کے لقب سے مشہور ہے مولانا فرماتے ہیں کہ اگر انسان مجبور محض ہوتا تو وہ خدا کی طرف سے امر و نہی کا مخاطب کیوں بنتا اور شریعت کے احکام اس کی طرف کیوں متوجہ ہوتے کیا کسی نے کسی پتھر کو بھی حکم دیتے سنا ہے۔

جبر مطلق گر بدی کہ امر و نہی راست　　　اختیارے نیست وین جملہ خطاست
جملہ قرآن امر و نہی است و وعید　　　امر کردن سنگ مرمر را کہ دید[2]

فرماتے ہیں کہ اختیار کا عقیدہ انسان کی فطرت میں داخل ہے اور وہ روزمرہ کی زندگی میں اس عقیدہ کا اقرار اور جبر کا انکار کرتا رہتا ہے کسی پر چھت کی لکڑی گر جاتی ہے تو اس کو چھت پر غصہ نہیں آتا سیلاب سامان بہالے جاتا ہے تو کسی کو اس پر غصہ اتارتے نہیں دیکھا گیا ہوا کسی کی ٹوپی اڑا لے جاتی ہے تو کوئی ہوا سے نہیں الجھتا سب جانتے ہیں کہ یہ مجبور و بے قصور ہیں البتہ انسان کے ساتھ انسان کا یہ معاملہ نہیں گویا صرف وہی صاحب اختیار ہے۔

گر ز سقف خانہ چوبے بشکند　　　بر تو افتد سخت مجروحت کند
ہیچ خشمے آیدت بر چوب سقف　　　ہیچ اندر کین او باشی تو وقف
کہ چرا بر من زد و دستم شکست　　　یا چرا بر من فتاد و کرد پست
وان کہ قصد عورت تو می کند　　　صد ہزاراں خشم از تو سر زند[3]

---

[1] ایضاً مثنوی　[2] ایضاً [illegible]

ور بیاید سیل رخت تو برد — ہیچ با سیل آورد کینی خرد
گر بیاید باد و دستارت ربود — کے ترا با باد دل خشمے نمود
خشم در تو شد بیان اختیار — تا نگوئی جبریانہ اعتذار[۱]

وہ ایک قدم آگے بڑھا کر فرماتے ہیں کہ جانور تک جبر و قدر کے مسئلے سے فطری طور پر واقف ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ آلات و جمادات کا کچھ قصور نہیں کیونکہ کوئی اگر پتھر مارا جائے تو وہ پتھر پر نہیں لپکتا، بلکہ انسان کے پیچھے دوڑتا ہے شتربان اونٹ کو مارتا ہے تو اونٹ کو لکڑی پر غصہ نہیں آتا شتربان سے انتقام لینا چاہتا ہے جب حیوان تک اس حقیقت سے واقف ہیں تو انسان کو جبری بننے سے شرم آنی چاہئے۔

ہمچنیں گر بر سگے سنگے زنی — بر تو آرد رو و گردد منثنی
گر شتربان اشترے را می زند — آں شتر قصد زنندہ می کند
خشم اشتر نیست با آں چوب او — پس ز مختاری شتر بردہ است بو
عقل حیوانی چو دانست اختیار — ایں مگو اے عقل انسان شرم دار
روشن است ایں لیک از طمع سحور — آں خورندہ چشم بر بندد ز نور
چونکہ کلی میل آں نان خوردنیست — رو بتاریکی کند کہ روز نیست[۲]

علت و معلول

اسباب و علل کے بارہ میں اسلامی فرقوں میں بڑی افراط و تفریط تھی فلاسفہ کے نزدیک کائنات میں علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے اور معلول کبھی علت، مسبب کبھی سبب سے متخلف نہیں ہو سکتا معتزلہ بھی اسی رائے سے بڑی حد تک متاثر ہیں ان کا بھی رجحان یہ ہے کہ جو چیز جس کی علت مان لی گئی ہے اس کا

---

[۱] مثنوی ص[illegible] [۲] ایضاً

پر زیادہ اصرار اور تسلیم کیا گیا، اس پر ایک انقلاب کے بجائے کم امکان ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ طبعی تسلسل سے خرق عادت کا وجود تسلیم کرتے ہیں اور کسی شئی کے اپنے خاصہ کے خلاف وقوع پذیر ہونے اور کسی حادثہ کے بغیر سبب کے وجود میں آنے کو بہت بعید سمجھتے ہیں، اشاعرہ دوسرے سرے پر ہیں، ان کے نزدیک کوئی چیز کسی چیز کی علت نہیں، نہ کسی شئی میں کوئی خاصہ اور تاثیر ہے، اس بے اعتدالی اور انتہا پسندی سے بھی نقصان پہنچا، ہر شخص کو معجزات کے اور اسباب کے انکار و ترک کا بہانہ مل گیا، اور اس سے ایک بے عملی اور تعطل پیدا ہوا۔

مولانا کا مسلک ان دونوں سروں کے درمیان ہے، وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اسباب کی ایک حقیقت ہے، وہ علل و معلولات، اسباب و مسببات کا ایک سلسلہ ہے جس کا انکار نہ ممکن ہے نہ معقول، عام سنت الٰہی یہی ہے کہ مسببات اسباب کے تابع ہوں اور اشیاء سے ان کے خواص برآمد ہوں، البتہ خرق عادت ممکن ہے اور کبھی کبھی اس کا وقوع بھی ہوتا ہے، فرماتے ہیں :۔

بیشتر احوال بر سنت رود   گاہ قدرت خارق سنت شود
سنت و عادت نہادہ با مزہ   باز کردہ خرق عادت معجزہ
بے سبب گر عز بما موصول نیست   قدرت از عزل سبب معزول نیست[1]

عام لوگ انہی اسباب کو دیکھتے ہیں، وہ معذور ہیں، ان کو کچھ اور نظر نہیں آتا :۔

حاصل آنکہ در سبب پیچیدہ   لیک معذوری کہ آنہا را ندیدہ[2]

فرماتے ہیں کہ حقیقتہً اسباب مناسب ہیں یا اسباب کی ایک حقیقت ہے لیکن مسبب الاسباب کی بھی بالاتر حقیقت ہے، وہ مسبب الاسباب، رب الارباب، قادر مطلق ہے، اسی طرح اسباب پر نگاہ نہ کرنے لگو کہ اور مخلوق کو بالکل معزول و معطل سمجھنے لگو۔

---

[1] مثنوی [illegible] [2] ایضاً [illegible]

اے گرفتارِ سبب بیروں مپر لیک عزلِ آں مسبب ظن مبر
ہر چہ خواہد آں مسبب آورد قدرتِ مطلق سببہا بر درد[1]

یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ اسباب صرف وہی نہیں ہیں جو ہمارے علم اور مشاہدہ میں ہیں بلکہ ان اسباب ظاہری سے اوپر کچھ اسباب اور ہیں جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں یہ اسباب باطنی ان اسباب ظاہری کے لئے اس طرح سے سبب اور محرک ہیں جس طرح یہ اسباب ظاہری مسببات و نتائج کے لئے سبب حقیقی اسباب ظاہری کو کبھی متحرک و فعال کر دیتا ہے اور کبھی بیکار و معطل کر کے رکھ دیتا ہے سب سے اعلیٰ اور اصل سبب ارادۂ الٰہی اور امرِ الٰہی ہے:۔

سنگ بر آہن زنی آتش جہد ہم بامرِ حق قدم بیروں نہد
سنگ و آہن خود سبب آمد ولیک تو بالاتر نگر اے مردِ نیک
کایں سبب را آں سبب آورد پیش بے سبب کے شد سبب ہرگز ز خویش
ایں سبب را آں سبب عامل کند باز گاہے بے بر و عاطل کند[2]

ہم جس طرح ان اسباب ظاہری کو جانتے پہچانتے ہیں انبیائے کرام ان اسباب حقیقی کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں:۔

واں سببہا کانبیا را رہبر است آں سببہا زیں سببہا برتر است
ایں سبب را محرم آمد عقلِ ما واں سببہا راست محرم انبیاء[3]

وہ اسباب حقیقی اسباب ظاہری کے حاکم اور اُن پر غالب ہیں:۔

ہست بر اسباب اسبابے دگر در سبب منگر دراں افگن نظر[4]

یہ اسباب ظاہری اسباب حقیقی کے سامنے بہت حقیر و ضعیف ہیں مسالۂ حقیقی اسباب ہی سے وابستہ

---

[1] مثنوی ص۲۲ [2] ایضاً ص۲۳ [3] ایضاً [4] ایضاً ص۱۲۱

ایں سبب ہمچو طبیب است و علیل　　ایں سبب ہمچو چراغ است و فتیل
شب چراغت را فتیلے نو بتاب　　پاک دان زینہا چراغ آفتاب[۱]

انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں چونکہ ساری دنیا اسباب ظاہری میں الجھی ہوتی ہے اور اسباب پرستی اپنے پورے عروج پر ہوتی ہے، خالق اسباب اور اس کی قدرت مطلقہ بالکل نگاہوں سے اوجھل اور دماغوں سے محو ہو چکی ہوتی ہے اور عالم کا عالم شرک اور ظواہر و مظاہر پرستی میں گرفتار رہتا ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام اسباب پر ضرب لگاتے ہیں اور اسباب کے بجائے مسبب اور فاعل مطلق کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی ان کے ہاتھوں سے سلسلۂ اسباب کے بالکل خلاف واقعات ظاہر کرکے اور معجزات دکھا کر اسباب کی بے حقیقتی اور کمزوری ظاہر کرتا ہے:۔

انبیاء در قطع اسباب آمدند　　معجزات خویش بر کیوان زدند
بے سبب بر بحر را بشگافتند　　بے زراعت چاش گندم یافتند
ریگہا ہم آرد شد از سعی شان　　پشم بز ابریشم آمد کش کشان
جملہ قرآن است در قطع سبب　　عز درویش و ہلاک بولہب[۲]

لیکن اللہ تعالیٰ کی عمومی عادت اور سنت جاریہ اسباب سے مسببات کا وجود ہے اور اس سے بندوں کو سعی کی تعلیم مقصود ہے:۔

لیک اغلب بر سبب راند نفاذ　　تا بداند طالبے جستن مراد[۳]

اسی انداز پر مولانا ان تمام کلامی مسائل اور مذہب کے اصول و عقائد کی تشریح اور تحقیق کرتے چلے جاتے ہیں جن کو متکلمین و اشاعرہ کے مناظرانہ طرز استدلال اور فلاسفہ کی طلسم آرائی نے چیستان اور نہایت خشک اور محدود موضوع بحث بنا دیا تھا، مولانا نے ان مباحث و حقائق کو علم کلام اور فلسفہ

---

[۱] مثنوی صفحہ [illegible]　[۲] ایضاً صفحہ [illegible]　[۳] ایضاً صفحہ [illegible]

اسے تنگ کوچے سے نکال کر عام فہم اور قابل تسلیم کے وسیع آفاق میں لے جا کر بحث کی، اور دل نشین مثالوں، عام فہم تمثیلوں اور سادہ و موثر طرز بیان سے اس کو روز مرہ کی حقیقت اور زندگی کا واقعہ بنا دیا۔

مثنوی کا اثر

مثنوی نے عالم اسلام کے افکار و ادبیات پر بڑا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا، اسلامی ادب میں ایسی شاذ و نادر کتابیں لکھی گئی ہیں جنہوں نے عالم اسلام کے اتنے وسیع حلقہ کو اتنی طویل مدت تک متاثر رکھا ہے، چھ صدیوں سے مسلسل دنیائے اسلام کے عقلی، علمی، ادبی حلقے اس کے نغموں سے گونج رہے ہیں، اور وہ دماغ کو نئی روشنی اور دلوں کو نئی حرارت بخش رہی ہے، اس سے ہر دور میں شاعروں کو نئے مضامین، نئی زبان، نیا اسلوب ملتا رہا، اور وہ ان کے قوائے فکر اور ادبی صلاحیتوں کو ابھارتی رہی، معلمین و متکلمین کو اپنے زمانہ کے سوالات و شبہات کو حل کرنے کے لئے اس سے نئے نئے دلائل، دل نشین مثالیں، دلآویز نکتے اور جواب کی نئی نئی راہیں ملتی رہیں، اور وہ اس کے سہارے اپنے زمانہ کی بے چین طبیعتوں اور ذہین نوجوانوں کو مطمئن کرتے رہے، اہل سلوک و معرفت کو اس سے عارفانہ مضامین، دقیق و عمیق علوم اور سب سے بڑھ کر محبت کا پیغام اور سوز و گداز اور جذب و مستی کا سامان ملتا رہا، اور وہ ان کی خلوتوں اور انجمنوں کو صدیوں تڑپاتی اور گرماتی رہی، اس لئے ہر دور کے اہل محبت اور اہل معرفت نے اس کو شمع محفل اور ترجمان دل بنا کر رکھا۔

اس کے مضامین یکسر تنقید سے بالاتر اور ہر قسم کی لغزش اور خطا سے مبرا نہیں، بہت سے نا سمجھ نافہمیدہ صوفیوں اور اہل ہوس نے اس سے کبھی کبھی غلط فائدہ بھی اٹھایا ہے، وحدت وجود کے قائلین کو اب بھی اس سے اپنے مسلک کے لئے دلائل و شواہد مل جاتے ہیں، وہ بہرحال ایک

انسان کا کلام ہے جو معصوم نہ تھا، اور جس کے مضامین میں اس کے قلبی واردات اور حالات نازلہ کو بھی دخل ہے، اس سب کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے وقت کا ایک بڑا علمی کارنامہ اور اسلام کی عقلی برتری اور اس کی غیر فانی زندگی کا ثبوت ہے، اس نے عالم اسلام کے فکری تعطل، علمی و ادبی جمود، اور تقلیدی ادب و علم کلام پر کاری ضرب لگائی، اور اسلام کے کاروانِ فکر کو جو ساتویں صدی میں آمادۂ قیام اور مائل بہ آرام تھا، دوبارہ متحرک و سرگرم سفر کر دیا۔

اس کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر دوبارہ مادیت و حسیت کا حملہ ہوا، اور یورپ کے نئے فلسفہ اور سائنس نے قلوب میں شکوک و شبہات کی تخم ریزی کی، اور ایمانیات و غیبیات کی طرف سے ایک عام بے اعتمادی پیدا ہونے لگی، اس کا رجحان بڑھنے لگا کہ ہر وہ چیز جو مشاہدہ و تجربہ کے ماتحت نہ آسکے، اور حواس ظاہری اس کی گرفت نہ کر سکیں، وہ موجود نہیں، عقائد کی قدیم کتابوں اور قدیم طرز استدلال و علم کلام نے اس کا مقابلہ کرنے سے معذوری ظاہر کی، تو مثنوی نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا (جو یورپ کی مادی و سیاسی فتوحات سے کم خطرناک نہ تھا) کامیاب مقابلہ کیا، اور دلوں میں دوبارہ دینی و غیبی حقائق کی وقعت، علوم انبیاء کی عظمت، عالم غیب کی وسعت اور قلب و روح، ایمان و وجدان کی اہمیت کا نقش قائم کر دیا، اور فلسفہ و مادیت کے صدہا زخم خوردہ نوجوانوں اور فاضلوں کو جو الحاد و ارتداد کے دروازہ پر کھڑے تھے، یا ایمان و اسلام کی سرحد عبور کر چکے تھے، دوبارہ ایمان و یقین کی دولت عطا کی، ہندوستان میں ان اہل علم کی ایک بڑی تعداد ہے، جو اس حقیقت کا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو مثنوی کی بدولت دوبارہ دولت اسلام نصیب ہوئی، اور وہ اس کے فیض سے مسلمان اور صاحب ایمان ہیں، بیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان فلسفی اور مفکر ڈاکٹر محمد اقبال

نے شیخ رومی کے فیض و ارشاد اور اپنے تلمذ و استرشاد کا جا بجا اعتراف کیا ہے اور اس کا برملا اظہار کیا ہے کہ مثنوی نے ان کو ایک نئی روح اور ایک نیا جذبہ عطا کیا، ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

پیر رومی مرشد روشن ضمیر   کاروان عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب   خیمہ را از کہکشان ساز د طناب
نور قرآن درمیان سینہ اش   جام جم شرمندہ از آئینہ اش
از نے آں نے نواز پاک زاد   باز شورے در نہاد من فتاد[1]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

رومی آں عشق و محبت را دلیل   تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل[2]

لیکن اس کے ساتھ وہ شکایت اور احتجاج کرتے ہیں کہ ایک طبقہ نے اپنی نظر اس کے الفاظ اور ظاہری مطالب ہی پر محدود رکھی اور اس کو جان گدازی اور دل سوزی کے بجائے رقص و وجد کا ذریعہ بنا لیا۔

شرح او کردند و او را کس ندید   معنی او چوں غزال از ما رمید
رقص تن از حرف او آموختند   چشم را از رقص جان بر دوختند[3]

لیکن یہ نقص ہمارا ہے، مثنوی کا نہیں، مثنوی اس دور انقلاب میں بھی رفیق راہ بن سکتی ہے اور اس مادہ پرست دور کی سب سے زیادہ نایاب جنس سوز و گداز اور محبت پاک باز ہے:۔

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے   پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن   پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے[4]

یہ دولت بیدار مثنوی سے حاصل کی جا سکتی ہے، عصر حاضر کے نوجوانوں کو وصیت کرتے ہوئے

---

[1] مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ص۔ [2] جاوید نامہ ص ۲۲ [3] پیام مشرق ص ۲ [4] بال جبریل۔

[illegible]

پیروی با رفیقی راه مساز ‏ ‏ ‏ تا خدا گفته ترا سوز و گداز
زانکه روی سفر را واقف نیست ‏ ‏ ‏ پای او گم شده در کوه و دشت

* * *

[illegible] صـ ۲۴۳

INDEX

اشاریہ

(انڈکس: تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول)

مرتب

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

سیدنا نبینا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]

الف

سیدنا حضرت آدم علیہ السلام [illegible]

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام ۱۳۳، ۱۳۹

حضرت ابوبکر صدیقؓ [illegible]

ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ ۵۵

حضرت ام عاصمؒ ۴۳

حضرت ابن عباسؓ ۹۷

حضرت ابو ایوب انصاریؓ ۲۳۲

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ۱۰۵

ابراہیم بن ادہم ۲۳۷

ابراہیم بن عبداللہ ۹۰

ابراہیم بن مصعب ۹۹

ابراہیم بن مہدی ۹۵

ابراہیم الحربی ۹۲

ابن ابی داؤد [illegible]

ابن اثیر [illegible]

ابن اسحاق ۶۴

ابن الاشعث ۵۳

ابن بطوطہ ۳۳۰

(شیخ الاسلام) ابن تیمیہؒ [illegible]

ابن جریج مکی ۶۴

(عبدالرحمٰن) ابن الجوزی [illegible]

ابن حبان ۶۵

ابن خلدون [illegible]

ابن خلکان [illegible]

ابن دقیق العید ۲۸۷
ابن ابی داؤد ۱۱۳
ابن حبیب ۱۹۰، ۲۰، ۲۸۱
ابن رشد ۱۴۵
ابن السبکی ۲۰۸، ۲۹۵، ۲۶۰، ۲۶۳، ۲۵۹، ۲۰۲
ابن سعد ۵۲، ۹۳
ابن السمعانی ۶۲
ابن سینا ۲۰۵
ابن شہاب زہری ۴۳
ابن عبد الحکم ۴۷
ابن عساکر دمشقی ۱۰۵، ۱۱۹، ۱۸
ابن العاقولی (زین الدین یا ابو طالب مکی) ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۹۱، ۲۱۸
ابن الفارسی ۲۷۶
ابن فراس ۵۲، ۱۹۰
ابن قزل ارسلان ۲۶۸
ابن قیم ۲۷۵
ابن کثیر [illegible]
[illegible]
ابن ماکولا ۸۰
ابن الزبیر الظالم ۲۱۶
ابن المسیب ۸۸
ابن المقفع ۲۳۹
ابن ناصر (کویت) ۲۲۵
ابن نجار ۲۰۰، ۲۳۴، ۲۲۲، ۲۲۶
ابو اسحاق اسفرائنی ۱۰۸، ۱۲۹، ۲۹
ابو اسحاق شیرازی ۱۱۶، ۱۹۵
ابو بکر ابن العربی ۱۸۹
ابو بکر اسماعیلی ۱۱۳
ابو بکر باقلانی ۱۰۸، ۱۴۹، ۱۸۳، ۱۸۵
ابو بکر بن حزم ۳۹، ۴۳، ۴۷
ابو بکر بن عیاش ۸۶
ابو بکر بن صیرفی ۱۱۲
ابو بکر خلال ۸۳
ابو بکر سکر بانک ۲۴۴
ابو بکر قرابادی ۶۵، ۶۹
ابو بکر محمد بن ولید ۲۸۱
ابو جعفر ۲۴۳
ابو حیان ۲۳۸

ابوالخطابی ۴۵
امام ابوالحسن اشعری [illegible]
۳۳، [illegible]
ابوالحسن البلی ۱۰۸
ابوالحسن البصری ۱۰۹
ابوالحسن الخباز ۱۰۵
ابوالحسن خرزی ۳۱
ابوالحسن شاذلی ۲۱۹
ابوالحسن علی ندوی ۱۰، ۱۹
ابوالحسین النوری ۲۰۴
امام ابو حنیفہ [illegible]
ابویحییٰ الموصلی ۵۰
ابو حمزہ بزاز ۱۲۸
امام ابو داؤد سجستانی ۹۰
ابو زکریا تبریزی ۱۹۵، ۱۹۷
ابو سعید حسانی ۲۰۹
ابو سعید مخرمی (مبارک بن علی) ۱۴۰
ابو سلیمان خطابی ۲۰۳
ابو طالب مکی ۳۴
ابو العباس رقی ۱۰۰
ابو عبدالرحمن سلمی ۹۷
ابو عبداللہ بن خفیف ۲۰۶
ابو عبداللہ محمد بن یوسف البنانی ۲۹۲
ابو عثمان نہدی [illegible]
ابو علی غزال ۲۰۱، ۲۰۵
ابو علی فارمدی ۱۹۲
ابو عمر بن راشی ۵۳
ابو الفرج اصبہانی ۳۱
ابو القاسم رازی ۱۹۵
ابو القاسم بن عساکر ۲۹۶
ابو عمرو الدانی ۲۹، ۳۰
ابو المظفر ۲۲۷
امام الحرمین ابو المعالی عبدالملک جوینی ۷۹، ۱۰۹، ۱۱۳
۱۳۷، ۱۸۵، ۲۳۳
ابو منصور ماتریدی ۱۱۵
ابو نجیب سہروردی ۲۲۳
ابو نصر بن سلیم ۲۳۰
ابو ہریرہ ۲۹۳

ابو نصر فارابی ۱۲۱
ابو نعیم اصبہانی ۱۳۰، ۲۱۰، ۳۰۲
ابو الوفا ابن عقیل ۱۹۵، ۱۹۶
ابو زکریا یحییٰ بن سعید ۲۰۹
(امام) ابو یوسف ۳۴، ۸۱، ۸۴
اتابک بیاز اقدین ۳۲۸
احمد بن ابراہیم دورقی ۱۰۱
احمد بن جعفر ۷۹
(امام) احمد بن حنبل [illegible]
[illegible]
احمد بن علی جصّہ ۱۱۳
احمد بن نظام الملک ۱۸۴، ۱۸۸
احمد الرازکانی ۱۳۰
احمد الغزالی ۱۹۰
اخطل ۳۲
(سیدنا) ادریس (علیہ السلام) ۱۲۵
ارسطو ۲۰، ۱۱۰، ۱۲۲، ۱۳۵
ارغون خاں ۳۲۳، ۳۲۹
آرنلڈ [illegible]
ارنسٹ ڈی ولیمس (ERNEST DE [illegible]) ۲۱
اسپرنگر ۷۹
اسٹیفن ۳۱
اسحاق بن ابراہیم ۹۲، ۹۳، ۹۵
اسماعیل اشعری ۱۰۵
اسماعیل بن عبد الغافر ۳۹
اشہب بن عبد العزیز ۸۲
ایشو داد ۲۳
افلاطون ۱۳۲
وقانی ۳۲۵، ۳۳۵
(علامہ) اقبال ۳۶۰، ۳۸۰، ۳۹۱
اکبر ۲۸
الپ ارسلان سلجوقی ۱۱۲
امیر الشراب ۲۰۹
ایچی ۳۱۹
وتیل حق ۳۱۳
اوحد الدین کرمانی ۳۴۳
اوگتائی خاں ۳۳۲
ایل خاں ۳۲۴

[illegible] ۲۹۱

ب

بابا (بابا فرید...) ۲۲۷

باتا خان [illegible]

بایزید بسطامی [illegible]

(قاضی) [illegible] جام ۳۹۸

(امام) بخاری [illegible]

بدر الدین اسحاق [illegible]

بدیع الزمان [illegible] [illegible]

برقی خان [illegible]

برکا خان [illegible]

(سید) برہان الدین ۲۵۳

برہان الدین محقق ترمذی [illegible]

بغدادی ۹۸

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

بقراط [illegible]

[illegible] ۱۳

[illegible] ۳۶

[illegible] ۱۳

[illegible] [illegible]

بو علی ابن سینا ۲۱

(ابو) علی [illegible] ۹۲

(قاضی) بہاء الدین ابن شداد [illegible]

(سید) بہاء الدین ترمذی ۲۵۵

(شیخ) بہاء الدین زکریا ملتانی ۲۲۳

(سید) بہاء الدین [illegible] [illegible]

(سلطان) بہاء الدین ولد [illegible]

پ

پاپائے روم [illegible]

پطرس راہب ۱۵۲

ت ث

تاتاری خان [illegible]

تاج الدین سبکی [illegible]

(قاضی القضاۃ) تاج الدین [illegible] [illegible]

(امام) ترمذی ۸۰
ترکان خاتون ۱۳۱
تغلق تیمور خاں ۳۳۱–۳۲
تقی الدین ۲۵۸
تمرتاش خاں ۳۲۶، ۳۲۹
تلمذ حسین گورکھپوری ۳۳۶
تنکز ۲۴۸
(الملک المعظم) توران شاہ ۲۹۸
(الامیر) توزون (توروز بیگ) ۳۳۰
توکل حسین ۳۳۷
ثابت بن قرہ ۵۶

ج

جاحظ ۴۰
جبرئیلؑ ۱۲۶
جریر بن عبد الحمید (محدث) ۸۸
جسر بن ولید ۹۵
جلال الدین حسن ۳۲۳
(سلطان) جلال الدین منکبرنی ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۳۸
۲۲۹، ۲۳۲، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۴۰
جمال الدین ۳۳۱–۳۲
جمال الدین حاجب ۲۸۸
جنید بغدادیؒ ۱۴
جنید قبا ۱۴۳
جواہر لال نہرو ۲۴
جوجی خاں ۲۲۵
جے ایس ٹرمنگھم (J. S. TRIMINGHAM) ۲۳

چ

چانچوی ۲۶۵
چغتائی خاں ۲۲۰–۲۲
چلپی حسام الدین ۲۱۴، ۲۵۰، ۲۵۲، ۲۵۸، ۲۸۱، ۲۸۴
چلپی علاء الدین ۲۸۸
چنگیز خاں ۲۰۴، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۳، ۲۱۶، ۲۱۸–۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۴

ح

(حضرت) حسنؓ ۱۹۶
(حضرت) حسینؓ ۲۴، ۹۸
(حضرت) حواؑ ۲۱۴
حدیث کساء ۱۴۴
حاکم بامر ۲۸۵

حبیب عرف بانزدہانی ۷۹
حجاج بن یوسف ۵۲، ۶۳
حرارہ ۱۰۹
حسن بصری ۱۲، ۲۵، ۳۱، ۵۰-۵۷، ۵۵، ۱۳۳، ۲۷-۳۵، ۲۸۰
حسن بن سہل ۷۰
حسن بن صباح اسماعیلی ۲۳۴
حسن بن قحطبہ ۱۸
حسن المثنیٰ ۲۳
حلاج ۲۰۹
حنبل بن یونس ۸۹
حسین (المثنیٰ) ۲۲
حوشب ۳۱

خ

(حضرت) خبابؓ ۱۰۲
خان احمد ۳۴۳
خطیب بغدادی ۵۱، ۲۰

د ذ

دانشمند سرقندی ۲۹
(حافظ) ذہبی ۳۳، ۳۴، ۸۰، ۹۶، ۱۳۰

ر

(امام) رازی ۲۳۵، ۲۴۹
راشد ۲۰۹
ربیع (شافعی) ۸۴
ربیع بن انس ۵۱
ربیع بن صبیح ۷۴
رجاء بن حیوہ ۲۵
دحیمؒ ۲۶۹
رشید الدین ۲۲۹، ۲۳۲
رکن الدین بیبرس ۲۳۵، ۲۲۶
رکن الدین سمانی ۳۴۴
(مولانا) روم دیکھئے جلال الدین
(سر) [illegible] (SAYIS [illegible]) ۲۳
ریجی نالڈ وان گرگ ۳۰۴، ۲۹۵، ۲۹۹

ز

(حضرت) زید بن ثابتؓ ۵۵
(امام) زفر ۸۲
(امام) زہری ۹۰
زید بن علی ۵۹

زین الدین سنجاسی ۳۴۴
زین الدین عراقی ۱۷۶، ۱۸۲، ۱۸۸

س

سالم بن عبداللہ ۳۲
سالم حسینی ۴۰۵
سپہ سالار ۳۴۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۴۲، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۸۵
سجادہ ۹۵
سعد الدین حموی ۳۴۴
(شیخ) سعدی ۳۱۹
سعید بن ابی عروبہ مدنی ۶۴
سعید بن جبیر ۵۵
سعید بن المسیب ۴۳
سفیان ثوری ۶۷، ۱۵۴، ۳۶۳
سقراط ۱۳۴
سکندر ۳۶۴
سلیمان بن عبدالملک ۳۲-۳۴، ۱۵۰، ۲۵۵، ۲۶۸
(سید) سلیمان ندوی ۶۹
(سلطان) سنجر ۱۹۰، ۱۹۴، ۱۸۶، ۲۸۸، ۲۷۰
سیراوادیرا ۳۲۵

سیف الدین آمدی ۳۸۷
سینٹ پال ۱۱۲۰
سیوطی ۲۸۸، ۲۹۹

ش

(امام) شافعیؒ ۱۸، ۲۸، ۵۴، ۸۷، ۸۸، ۹۷، ۱۲۴، ۱۵۳، ۱۵۸
شبلی نعمانی ۱۸، ۲۸، ۵۴، ۹۷، ۱۲۸، ۱۳۱، ۳۵۷
(شیخ) شبلی ۲۴۸
شرف الدین عبداللطیف ۲۹۳
شرف الدین عیسیٰ ۲۲۲
(قاضی) شریح ۲۲۵
(قاضی) شریک ۲۳۸
(امام) شعبی ۵۵
(امام) شعرانی ۱۹۸
شمس الدین تبریزی ۲۳۵-۲۴۲، ۲۴۵، ۲۵۵، ۲۹۶
شنکر آچاریہ ۲۵، ۲۶، ۳۱
شہاب الدین ابوشامہ ۲۸۸، ۳۰۵
شہاب الدین سہروردی ۲۲۴، ۲۹۹
شیردل ۳۶۹
شیرکوہ اسد الدین ۲۹۱

شیطانی ۱۳۸، ۲۴۰، ۲۴۲، ۲۳۳، ۲۷۵، ۲۷۰

ص ض

صالح اسماعیل ۲۹۱، ۲۹۲

صالح بن امام احمد ۹۳

صدر الدین ۱۰۸

صدر الدین قونوی ۲۳۲، ۲۴۵، ۳۶۱

صدیق حسن خان ۱۸۳، ۲۲۴

صلاح الدین الیبلی ۲۵۲، ۲۵۴، ۲۲۶–۲۱۱، ۱۳۷، ۱۳۸، ۲۸۲، ۲۸۲، ۲۸۶–۲۸۸، ۲۹۶، ۳۰۳، ۳۲۹، ۳۳۴

صلاح الدین زرکوب ۲۳۵، ۲۸۳–۲۸۵، ۳۰۹، ۳۴۵، ۳۶۱

ضحاک بن عبدالرحمن ۳۱

ط

طاہر ۳۱۹

(امام) طحاوی ۱۰۵

طرشتری بن خاقان ۳۲۱

طیفور ۹۵

ظ

(ملک) ظاہر بیبرس ۲۱۹، ۲۱۴، ۲۱۸، ۲۲۰

(الملک) الظاہر غازی بن یوسف ۲۰۹، ۲۸۵، ۲۹۰، ۲۹۲، ۳۰۰

ع

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۳۶، ۱۲۰

(حضرت) عمرؓ ۲۴۹، ۲۵۳

(حضرت) علیؓ ۱۸۵، ۲۷۹، ۲۸۰، ۳۲۰

ام المومنین حضرت عائشہؓ ۲۱۲

(حضرت) عبداللہ بن مسعودؓ ۱۶۴

عارم ابوالنعمان ۹۰، ۹۱

عاصم بن علی ۴۹

عاصم بن عمر ۲۰

عاضد لدین اللہ ۲۰۳

عالمگیر اعظم ۳۰۴

(شیخ) عبدالجواد ۳۴۳

(قاضی) عبدالجبار ۲۸۰

عبدالرحمن بن اسحاق ۹۴

عبدالرحمن بن قاسم ۴۲

عبدالرحمن بن مہدی ۹۶

(شیخ) عبدالرزاق ۳۴۳

عبدالرزاق بن ہمام ۸۸

عبدالعزیز ۳۴۳

عبدالعزیز بن سلیمان ۲۳۸
عبدالعظیم المنذری ۲۸۸
عبدالغافر فارسی ۱۳۱، ۱۳۵
عبدالغنی بن نافور فراش ۳۰۶
(شیخ) عبدالقادر جیلانی ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۴۹، ۲۵۰، ۳۰۳
۳۰۵، ۳۰۹، ۳۴۰
عبدالقاہر آمدی ۱۳۵
عبدالقاہر جرجانی ۱۹۵
عبداللہ بن امام احمد ۹۳
عبداللہ بن زبیر ۴۳
عبداللہ بن سلام ۲۸۵
عبداللہ بن عبدالحکم ۸۴
عبداللہ بن مبارک ۷۱، ۱۵۹
عبداللہ بن وہب ۸۴
عبداللہ المعتز ۴۲
عبدالملک بن مروان ۴۲
(شیخ) عبدالوہاب ۲۲۲
عبدالمومن ۱۹۴
عبید ۲۸۱
عثمان رومی ۲۴۲
عجیبت ۸۹
عروہ بن زبیر ۴۳
(شیخ الاسلام) عزالدین بن عبدالسلام ۲۰۶، ۲۸۷
۲۸۸، ۲۹۳ ـ ۲۹۹، ۲۹۷، ۳۰۲، ۳۰۳
عکرمہ ۴۱، ۴۲
علاؤالدین الطرسی الظاہری ۳۰۶
علاؤالدین کیقباد ۳۲۰، ۳۲۱
علاؤالدین محمد خوارزم شاہ ۳۰۴، ۳۱۴ ـ ۳۲۱، ۳۲۹
۳۳۰
علی بن حسین (زین العابدین) ۴۲، ۴۳
علی بن مدینی ۱۰۵
علی بن یوسف تاشفین ۱۴۱ ـ ۴۷
عمادالدین زنگی ۲۵۳، ۲۶۱
عمادالدین الکاتب ۲۸۰
عمر بن ابی الحسن رواسی ۲۸۹
(حضرت) عمر بن عبدالعزیز ۴۲، ۴۶، ۷۲، ۷۶
۸۰، ۸۱، ۸۲ ـ ۸۴، ۸۶، ۸۸، ۹۲، ۹۴، ۹۸، ۹۹ ۹۵
عمر کیسانی ۲۰۱
عمرہ بنت عبدالرحمن ۴۰

عمار بن یاسر	۲۲۲، ۲۳۱، ۲۷۰
عوام بن حوشب	۹۹

غ

غازان	۲۳۰
(امام ابو حامد محمد) الغزالیؒ	۱۲۷، ۱۲۹–۲۲۲، ۵۶
۴۴	۱۵۵–۱۵۰، ۱۵۳، ۱۵۱، ۱۴۵–۴۹، ۴۷
	۱۰۹، ۱۳، ۱۸۷، ۱۶۵، ۱۵۷، ۱۴۶، ۱۲۷، ۱۰۷
	۲۳۸، ۲۹۶، ۲۹۵، ۲۹۳، ۲۳۰، ۱۸۷–۱۹۰
	۳۳۹، ۳۰۲، ۲۳۸
(سلطان) غیاث الدین	۲۲۱

ف

(حضرت) فاطمہؓ	۲۸۲، ۲۴۸
(قاضی) فاضل	۲۶۵
فخر الدین الفخر	۲۸۳
فخر الدین عثمان	۲۹۳، ۲۹۳
فخر الملک طوسی	۱۸۶، ۱۹۶، ۱۲۸
فرزدق	۳۳
فرعون	۱۴۲
فرخ زاد الفر دیکھئے	بدیع الزمان
فریابی دیکھئے	ابوبکر
فربری	۴۹
فرید الوحید	۲۴۲
فرید الزمان	۱۸۸
فریڈرک	۲۷۹–۲۷۵
فضل بن عیاض	۷۱

ق

قاآن	۲۲۶
قاسم بن محمد	۳۳، ۳۲
قتادہ تمیمی	۳۰۵
قتیبہ	۱۰۰
قرطبی	۲۴۹
قطب الدین شیرازی	۳۲۸
قواریری	۹۵
قوام الدین	۱۸۸
قبلائی خان	۲۲۲، ۲۱۴
قیصر	۲۶۹–۲۰۱، ۶۵

ک

کافلین	۲۶۲

(شمس الائمہ) کردری ۸۲
کرگز ۴۲۲
کسریٰ ۳۵
کمال الدین ابن العدیم ۲۴۲

گ ل

گاندھی جی ۲۶
گاؤ ۲۲۵، ۲۲۶
گبن ۳۱۷
گورجیسے ۲۵۸
گیوک قاآن ۲۲۴
(واشنگٹن) لین پول ۸۵، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۲۰، ۲۷۳، ۲۸۱

م

سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام ۱۲۶، ۲۲۶
(حضرت) مثنیٰ بن حارثہؓ ۸۹
(حضرت) معاویہؓ ۲۸۲
مارکو ۳۱۵
مارٹن لوتھر (M. LUTHER) ۲۱
(امام) مالک ۹۵، ۱۲۰، ۱۲۸، ۱۴۵، ۱۴۸، ۲۵۲
مالک بن دینار ۲۴۸
مامون ۶۹، ۱۷۰، ۱۸۵، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۵۱، ۲۹۸، ۳۱۹
متنبّی ۲۳۱
متوکل باللہ ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۱۰۰، ۱۱۹
مجاہد الدین ایبروز ۲۹۱
مجاہد الدین ایبک الدویدار ۳۰۶
مجیر الدین ۱۹۳
(امام) محمد ۸۲
(سلطان) محمد (ثانی) ۳۲۴
محمد القوز بیرا ۸۹، ۱۱۵
محمد بن اسمٰعیل ۹۶، ۱۲۵
محمد بن حسن باقلانی ۱۹۷
محمد بن حسن دیکی یاوی ۱۲۲
محمد بن سیرین ۵۵
محمد بن عبدالحکم ۳۹
محمد بن عبداللہ تومرت ۱۹۱–۹۳
محمد بن ملک شاہ ۱۷۹، ۱۸۶
محمد بن نصر مروزی ۹۲، ۹۳، ۹۴
محمد بن نوح ۹۵
محمد بہاء الدین ۳۳۸

محمد خدابندہ (اولجایتو) ۳۳۰
محمد ذوالنفس الزکیہ ۹۸
محمد عاشق کاکوروی ۲۰۳، ۲۰۵
محمد عبدہ ۱۱۵
محمد علی ۱۲۶
محمد کازرونی ۱۲۶
محمد طاہر پٹنی ۱۲۲، ۳۴۵
محمد یوسف ترکی ۲۵۰
محمد یوسف سورتی ۱۲۸
(سلطان) محمود غزنوی ۲۵۸
محی الدین ابن العربی ۳۴۲
محی الدین ابو [illegible] ۲۰۰
مرزا (غلام احمد) ۱۲۶
مزنی (شافعی) ۸۲
مسترشد ۲۰۹
مستظہر باللہ ۱۲۸، ۲۰۹، ۲۳۰
مستنصر باللہ ۲۲۸، [illegible]
مستعصم باللہ ۲۰۳، ۲۴۰، [illegible]
(ال)مستضیٔ باللہ ۲۰۹
(سلطان) مسعود ۲۰۹، ۲۰۷، ۲۱۶
مسعودی ۷۸
(امام) مسلم ۸۰
(امام) معاذ بن معاذ ۷۷
معتصم باللہ ۱۹۶، ۲۰۵، [illegible]
معتضد ۲۱۹
معروف کرخی ۲۶۲، ۲۳۳، ۳۶۴
معز الدین باللہ فاطمی ۱۲۵
معمر یمنی ۴۳
معین الدین پروانہ ۳۸۷
مقتدی باللہ ۲۰۸، ۲۱۲
المقتفی لامر اللہ ۲۰۹
مقدسی ۲۸۰، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵
مقریزی ۲۸۲، ۲۸۴
الملک الاشرف ۲۸۹، ۲۹۸، ۲۹۹
الملک [illegible] ۳۰۵
ملک شاہ سلجوقی [illegible]
الملک الصالح نجم الدین ایوب [illegible]، ۲۹۰
الملک الکامل ۲۸۸، ۲۹۰

الملک المظفر سیف الدین قطز ۳۲۱
الملک المنصور ۲۹۳
ملک ایوب ۳۳۸
مناظر احسن گیلانی ۹۸
منصر بن بشیر ۳۱۹
منصور بن غالب ۹۵، ۹۶، ۹۸
منکوقاآن ۳۱۸، ۳۱۹
منکوخان ۳۲۳
(شیخ) موسیٰ ۳۲۲، ۳۲۳
موسیٰ بن ملک العادل ۲۸۹، ۳۰۵
مہبر ۱۱۳
موفق عبد اللطیف ۲۲۹

ن

سیدنا حضرت نوح علیہ السلام ۱۲۶
ناجی معروف ۳۰۶، ۳۱۰
الناصر لدین اللہ ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۱۰
نجم الدین ابن تاز ظاہری ۳۲۵
(امام) نسائی ۸۰
نصرۃ الدین امیر اران ۳۲۱
نصیر الدین طوسی ۳۱۸، ۳۲۱
نظام الملک طوسی [illegible]، ۱۸۸
نمرود ۱۳۲
نور الدین زنگی ۲۶۴، ۲۷۱ــ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۸۵، ۲۸۹
(امام) نووی ۲۸۸

و

واثق ۹۲، ۱۰۳
وتان ۲۲۶، ۲۲۹
(امام) وکیع ۶۶
(سلطان) ولید دیکھیے بہاء الدین
ولید ۳۳، ۵۰
(شاہ) ولی اللہ ۱۶۵-۲۰۸، ۳۰۲
ویلز (WELLS.H.G) ۱۱۳

ہ

سیدنا حضرت ہود علیہ السلام ۲۹۰
ہارون الرشید ۶۱، ۸۲، ۸۵، ۸۶، ۸۸، ۹۸
ہشام بن عبد الملک ۳۳، ۹۸
ہلاکو خان ۳۱۳، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۵، ۳۲۶
ہمفری ۲۹۵

[ہرکیولیز] ہیرالٹ ۱۲۴
ہیثم بن بشیر ۸۴
ہیثم بن جمیل ۸۶
ہیراقلیس ۱۳-۳۱۰

ی

سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام ۲۴۴
یاجوج ۳۱۵
یحییٰ بن اکثم ۸۵
یحییٰ بن سعید ۵۰
یحییٰ بن معین ۱۸۸-۹
یحییٰ بن یحییٰ لیثی ۸۲
یزید بن الاشب ۵۱
یزید بن عبد الملک ۶۳
یزید بن المہلب ۶۳
یزید بن ہارون ۴۹
یسار ۵۵
یعقوب کندی ۱۲۱

اقوام وقبائل۔ طبقات وملتیں

ارباب کلیسا ۸۶
ارتھوڈکس مسیحی ۳۱
ازدی ۲۵۴
اشعری، اشاعرہ [illegible]
[illegible]
انبیاء [illegible]
[illegible]
اہل اعتزال ۱۲۲
اہل بغداد [illegible]
اہل بیت کرام، خاندان نبوت [illegible] ۲۴۲
اہل سنت ـ حنفی [illegible]
[illegible]
اہل ظاہر ۱۲۶
اہل عراق ۱۲۹، ۲۱۰
اہل مدینہ ۹۸
اہل مصر (مصری) [illegible]
اہل مغرب ـ مغربی [illegible]

اہل مغرب ۲۹
اہل کر ۵۷
اہل منطق ۴۳
ایرانی ۷۳
ایلخانیہ ۳۲۹، ۳۳۰
باطنی ۷۷، ۸۰، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۸
بدھ ۳۲۰، ۳۳۹
بربر ۲۹
بنی اسرائیل ۲۰۳
بنی امیہ۔ اموی ۲۱، ۲۳، ۳۳، ۳۴، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۵۴، ۸۵، ۹۱
۸۶، ۱۵۳
بنی ایوب۔ ایوبی ۲۶۱، ۳۰۷
بنی حسن ۶۸
بنی عباس۔ عباسی ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۳، ۲۵۸، ۲۸۳، ۳۱۰
بنی عبید۔ عبیدی (فاطمی) ۲۳۴، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹
بنی مخزوم ۴۱
بنی ہاشم۔ خاندان ہاشم ۶۰، ۸۲
بیانی ۱۲۷
البیعار (عیسائی فرقہ) ۲۳۹، ۲۴۰
تابعین ۵۵، ۶۳، ۶۷، ۷۹، ۸۵، ۱۸۹
تاتاری ۱۹۵، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۲۰، ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۹، ۲۵۰
۳۰۲، ۳۲۰، ۳۲۴، ۳۲۹، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۵۰
ترک ۲۸۹، ۳۱۰، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۵، ۳۸۳
ترکمان ۲۶۱
تشیع ۲۹
جبریہ ۲۹۲
جالیہ ۳۰۴، ۳۱۰، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۸۵، ۳۸۹
خاندان اتابک ۳۰۴
خاندان اخی ۳۵۳
خاندان مروانی ۳۳
خلفائے راشدین ۱۰۵، ۲۵۸، ۲۷۳
خوارزم ۲۳۰، ۲۳۸
دادیہ (عیسائی فرقہ) ۲۳۹، ۲۴۰
دہریہ ۱۱۳
ذمی ۲۸۵
راہب۔ قسیس ۱۲۱، ۲۵۵
روافض ۱۱۵
رومی ۴۳، ۲۵۰

سلاطین بنی ایوب ۳۰۷

سلاطین خوارزم شاہیہ ۳۱۳

سلاطین سلجوقیہ ۱۹۱، ۲۰۹

سمرقند ۲۸۵، ۲۱۶

سکھ ۳۴

شیبان (ابن ثعلبہ) ۵۳

شیعہ ۳۰۸، ۳۹۰

صابئی ۴۲

صحابہ کرام [illegible]

[illegible]

صفین [illegible]

[illegible]

عباسی خلفاء [illegible]

عجمی ۲۹

عرب [illegible]

[illegible]

عیسائی [illegible]

[illegible]

[illegible]

غزنوی [illegible]

قبائل عرب ۱۴۰

قبائل مضر [illegible]

[illegible]

قادیانی ۱۲۶

قبیلہ ربیعہ ۳۷۹

قبیلہ عبد القیس ۹۶

قبیلہ ہمدان ۱۶۳

قبیلہ ہذانیہ ۲۱۲

قدریہ ۱۰۹

قرامطہ ۱۱۵

قربانی (کردستانی) ۲۷۶

قریش ۸۰

کرد [illegible]

کفار و مشرکین ۳۳

[illegible] ۱۱۵

متکلمین [illegible]

[illegible]

کلدانی [illegible]

کوفیین [illegible]

مسلمان [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مشائخ صوفیہ [illegible]

مصری [illegible]

معتزلہ [illegible]

مغل [illegible]

ہاشمی ۱۹۳

نو مسلمین ۹۳—۹۵

ہندی ۱۹۳

ہند ۱۱۳

یہودی [illegible]

یورپی [illegible]

یونان [illegible]

کتابیات

قرآن مجید

(الف)

[illegible] [illegible]

ابن تیمیہ (ابو زہرہ) ۸۵

ابن حنبل (ابو زہرہ) ۸۹

ابو حنیفہ [illegible]

اتحاف السادۃ المتقین [illegible]

اتحافات السادۃ (شرح احیاء) [illegible]

احیاء علوم الدین (احیاء العلوم) [illegible]

اخبار و آثار ۲۱۰

اخبار [illegible] ۱۹۳

اخلاق جلالی ۱۱۶

[illegible] ۸۲

اسرار خودی ۲۱۰

اسلام اینڈ کرسچیانٹی (Islam and Christianity) ۴۲
اشارات (ابن سینا) ۲۸۵
الاشعری ابوالحسن ۱۱۲، ۱۱۳
الاصابہ فی احوال الصحابہ ۶۱
الاغانی ۲۳۰، ۳۲۲، ۴۰۰
(رسالہ) الاقلام ۳۰۰، ۳۰۲
الجام العوام عن علم الکلام ۱۳۱، ۱۴۰
العبر ۱۸۳، ۱۸۷
امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ۲۸
انجیل ۲۱، ۳۵
انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۲۲، ۲۳، ۲۵۲، ۲۵۳
انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ۲۵
ایضاح البرہان ۱۰۳

ب

بال جبریل ۲۷۹، ۲۹۹
البدایہ والنہایہ [illegible]
ایران ۱۸۹
بطون گیتی ۳۵

ت

التاج المکلل ۱۸۳
تاریخ ابن خلکان [illegible]
تاریخ الخلفاء للسیوطی ۳۲۱، ۳۲۲
تاریخ الاخلاق ۱۵۸
تاریخ الاسلام للذہبی [illegible]
تاریخ اصبہان ۳۰
تاریخ انحطاط و سقوط روما ۳۱۶
تاریخ بغداد ۲۲۲، ۲۹۹، ۳۰۱
تاریخ دعوت و عزیمت ۹
تاریخ صغیر ۹۳
تاریخ طبری ۵۰، ۹۵
تاریخ عہد وسطی ۳۱۶
تاریخ فلاسفۃ الاسلام ۱۴۳، ۱۴۵
تاریخ الکامل لابن اثیر [illegible]
تاریخ کبیر ۹۳
تاریخ القرآن ۱۰۵
التبیین عن اصول الدین ۱۱۳

تبیین کذب المفتری ۱۰۳-۱۰۵، ۱۱۳، ۱۱۴، ۲۸۹

تثبیت النبوۃ ۲۸۱

تذکرۃ الحفاظ ۴۳، ۵۹

تذکرہ دولت شاہ ۲۴۵

الترغیب والترہیب ۲۸۸

تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء ۱۳۷

تفسیر مولوی محمد علی ۱۲۸

تقصار جیود الاحرار ۲۲۴

التکشف رموز الغیب ۲۲۴

تلاش ہند (Discovery of India) ۲۴۲، ۲۵۰

تلبیس ابلیس ۴۳-۴۴، ۲۴۸، ۲۹۴، ۳۱۱، ۳۲۱

تلقیح فہوم اہل الاثر فی عیون التاریخ والسیر ۲۵۰

توریت ۲۵۷

تہافت الفلاسفہ ۱۳۲-۳۵

ج چ

جامع ترمذی ۸۰

الجامع العلوم ۸۲

جاوید نامہ ۲۹۹، ۳۰۰

جلاء العینین ۲۰۱

جواہر القرآن ۱۳۹

[illegible] (کتاب) ۲۱۰-۱۳، ۲۱۴، ۳۱۷

ح

حاضر العالم الاسلامی ۱۲۷

حجۃ الحق ۱۳۶

حجۃ اللہ البالغہ ۸۰، ۳۰۲

حدیقہ سنائی ۲۵۴

الحسن البصری ۹۰

حسن البنا ۲۸۸، ۲۹۸، ۲۹۹

حلیۃ الاولیاء ۴۲، ۵۹، ۸۸-۹۰، ۳۴۲

حماسہ ۲۸۱

الحوادث الجامعہ ۳۰۶-۳۰۷

خ

خبر الواحد ۱۱۳

خطبات مدراس ۶۶، ۱۰۴

د

دائرۃ المعارف بستانی ۴۹، ۵۶، ۹۰، ۹۱، ۲۴۴، ۳۴۷

دعوت اسلام (آرنلڈ) ۲۳-۲۵، ۲۹، ۳۰، ۳۲، ۲۳۲

الدرر الکامنہ ۳۰۴

دلی گیبن ۴۲۳
دیوان مولانا روم ۲۵۵، ۳۶۹

ذ

ذیل طبقات الحنابلہ ۱۱۹، ۱۴۳، ۴۰۳
ذیل المرآۃ ۳۲۱

ر

الرد علی المنطقیین ۱۱۹
رسائل اخوان الصفا ۲۲، ۳۸۵
رموز الغیب ۲۰۸، ۲۲۳، ۲۵۱، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۴، ۲۹۲
رنات المثالث ۳۲

ز

زاویہ غزالیہ ۳۸۰
زندگانی مولانا جلال الدین ۲۴۹، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۸، ۳۷۳
۳۵۶، ۳۸۲

س

سلطان صلاح الدین (ہیرلڈ لیمب) ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۵، ۲۶۲
۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۷۰، ۲۷۴، ۲۸۱
سنن ابی داؤد ۸۰
سوانح مولانا روم ۳۹۰
سیرت عمر بن عبد العزیزؒ ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۵۱، ۲۶۰، ۲۴۵
سیرۃ النعمان ۸۲

ش

الشامل ۲۲۸
شجرۃ المعارف ۳۰۳
شذرات الذہب فی اخبار من ذہب ۸۲
شرح احیاء العلوم دیکھئے اتحاف السادۃ
الشرح والتفصیل فی الرد علی اہالی الافک والتضلیل ۱۱۳
شفاء (ابن سینا) ۲۸۵

ص ض

صاحب المثنوی ۳۳۴، ۳۴۵
صحاح ستہ ۷۹
صحف مقدسہ ۳۱
صحیح بخاری ۲۰، ۷۹، ۸۰، ۱۸۹
صحیح مسلم ۸۰، ۱۸۹
صحیحین ۸۰
صفوۃ الصفوۃ ۳۲، ۱۱۵، ۲۱۴
صفۃ النفاق وذم المنافقین ۹۵
صلاح الدین ایوبی (محمد فرید) ۲۶۱

الصواعق المرسلہ ۲۸۵، ۲۸۶
صیدالخاطر [illegible] — ۲۴۱
۲۴۸ — ۲۴۵، ۲۵۰
ضحی الاسلام ۱۲۳
ط
طبقات ابن سعد ۶۵
طبقات ابن السبکی ۹۲، ۲۹۵
طبقات الشافعیۃ الکبریٰ [illegible]، ۲۸۰، ۲۹۳
۲۹۵، ۲۹۴، ۲۴۹، ۲۳۰، ۲۲۰، ۲۱۹
طبقات الکبریٰ للشعرانی ۱۹۹، ۲۰۲، ۲۰۳
ع غ
عاصمہ نفوس المستدین وقاصمہ ظہر المستدین ۱۲۵
العسجد المسبوک ۳۰۶
عقائد صفدیہ ۸۵
علماء سلف ۴۶، ۴۹
عوارف المعارف ۲۲۴
الغزالی ۱۲۴، ۱۷۵، ۱۸۹، ۱۹۳
ف
فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۸۳، ۱۸۲
الفتح الربانی ۲۰۸، ۲۱۰
الفتح القسی فی الفتح القدسی ۲۲۸
فتوح البلدان ۴۹
فتوح الغیب ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۸، ۲۰۹
فجر الاسلام ۸۱
فرنچ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۱۲۴
فضائح الاباحیۃ ۱۳۶
فلسفۃ الاخلاق وصلاتہا بالفلسفۃ الاغریقیۃ ۱۶۸
فن تکفیر ۶۵
فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ ۱۸۵، ۱۸۶
فیوض یزدانی ۲۱۰، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۸
ق
قاصم الاباحیۃ ۱۳۶
قلائد الجواہر ۲۰۲ — ۱۹۹، ۲۱۶
قلائد العقود والعقیان ۸۲
قواعد عقائد آل محمد ۱۳۶
القواعد الکبریٰ ۳۰۲
قوت القلوب ۲۳۳
قیام اللیل ۶۲

ک

کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ ۱۰۹، ۱۱۰

کتاب الاجتہاد ۱۱۳

کتاب الام ۸۲

کتاب الحیوان ۷۰

کتاب الخراج ۸۲، ۲۲۷

کتاب الخطط والآثار ۲۸۲، ۲۸۳

کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین ۲۸۳، ۲۸۵، ۲۸۶

کتاب العبر ۲۸۸

کتاب اللمع ۱۱۳

کتاب النسخ ۱۱۳

کتاب الفصول ۱۱۳

کتاب القیاس ۱۱۳

کتاب الوجیز ۱۱۳

الکشف عن اسرار الباطنیہ ۲۸۱

کشف ما کان علیہ بنو عبید ۲۸۱

کلیات سعدی ۳۲۰

ل

لغت القیدلی تحت الوافد ۲۲۹، ۲۳۳

م

اناجیل ۷۱

مثنوی معنوی ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۵، ۲۵۵، ۲۶۰، ۲۶۲، ۳۱۲
۳۶۳-۳۶۸، ۳۷۶، ۳۸۰، ۳۸۲، ۳۹۰، ۳۹۸

مجاز القرآن ۳۰۲

المحاسن الیوسفیہ ۲۶۲

المدونہ ۸۲

مرصاد العباد ۳۱۹

مرآۃ الجنان یافعی ۲۴۳

مرآۃ الزمان ۳۰۵

مرآۃ المثنوی ۳۳۷

المستصفیٰ ۱۸۹

مستظہری ۱۲۸، ۱۳۹، ۲۴۳

مسلم کریڈ (Muslim Creed) ۱۱۳

مسند امام احمد ۱۰۱

المعتمد ۱۸۹

المغنی ۸۲، ۱۹۸

مفصل الخلافات ۱۳۹

مقاصد الصلاۃ ۳۰۲

مقاصد الفلاسفہ ۱۳۲، ۱۴۳
مقالات احسان گیلانی ۱۳۰، ۱۲۳
مقدمہ ابن خلدون ۲۹
مقدمہ فتح الباری ۲۹، ۶۸
معجزۂ قرآن ۲۲۶
مکتوبات امام غزالی ۱۹۰
مناقب ابن جوزی ۹۲، ۸۴
مناقب ابی حنیفہ ۸۱، ۶۸
مناقب حافظ ذہبی ۹۲
مناقب العارفین ۲۳۳
مناقب عمر بن عبدالعزیز ۳۸
المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ۱۸۲، ۱۸۳
۲۵۰، ۲۴۹، ۱۹۶
المنقذ من الضلال ۱۳۹، ۱۳۰، ۱۳۱
منطق الطیر ۲۵۴
منہاج القاصدین ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۳۷
مواہب اللدنیہ ۱۳۲
موطّا ۲۸۲، ۸۰

ن

نظام الملک طوسی ۱۲۸
نصیحۃ الملوک ۱۹۱
نفحۃ الشذی ۳۲۷
النوادر السلطانیہ ۲۶۷، ۲۶۳، ۲۱۲
۲۶۸ — ۸۱، ۲۷۲

و

وفیات الاعیان ۲۴۳
ورڈسن ۲۳۳، ۲۳

ہ

ہیورتھ ۲۳۶، ۲۳۳
ہندوستانی تمدن ۲۳
ہیوم ۲۲۹

ی

یوسف زلیخا ۲۳۹

مقامات

الف

آزر ۳۱۳

احسار ۲۲۹

آذربائیجان ۱۹۷، ۲۹۱

اردن ۲۷۰، ۳۴۳

ارسوت ۲۷۱

ارمن ۳۴۸

اریخیہ ۲۶۳

اسپین ۷۴، ۷۶، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۴۷، ۳۱۲

آسٹریلیا ۲۴۹، ۲۷۰

اسفرائن ۱۲۷

اسکندریہ ۱۹۲، ۲۵۹

اصفہان ۳۲۸

افحات ۲۹۲

افغانستان ۲۲۸

افریقہ ۱۵۰، ۲۷۰، ۲۹۰، ۳۴۰، ۳۴۰

آذرشہر ۳۳۰

اندلس ۵، ۲۷، ۳۴، ۱۲۴

انطاکیہ ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۵۰، ۲۵۹

انطرطوس ۲۴۳

انگلستان ۱۸، ۹۹، ۲۲۷، ۳۱۷

ایشیا ۲۵۵

ایران ۸۵، ۸۸، ۱۲۵، ۱۲۸، ۱۳۸، ۱۹۷، ۲۹۷، ۳۰۸

۳۱۲، ۳۱۸، ۳۲۳، ۳۴۳، ۳۵۰، ۳۶۶، ۳۷۶، ۳۹۷، ۴۰۲، ۴۰۷

اٹلیا ۳۳، ۷۲، ۹۷

ایشیائے کوچک ۳۱۰

ایلیا ۲۶۱

ب

باب الطاق ۹۹

بجایہ ۱۹۲

بخارا ۱۲۵، ۲۱۲، ۳۱۲، ۳۲۵

برز ۹۷

برگنڈی ۲۷۰

بصرہ ۵۲، ۶۵، ۷۴، ۸۹، ۸۵، ۱۰۵، ۱۱۰، ۱۲۰

بعلبک ۳۹۱

بغداد [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بقیع ۲۵۹

بلاد وسطی ۳۳۰

بلاد مغرب ۳۹

بلاد ما بین النہرین ۳۰۹

بلخ ۳۰ — ۳۲۸

بمبئی ۲۵

ت ث

تالیس ۱۹۷

تبریز ۳۴۴

ترکستان [illegible]

ترکی ۲۹۱

تکریت ۲۹۱

تیما ۱۹۲

تاہرت ۲۲۳

ج چ

جاوا ۲۲۱

جرجان ۱۳۰

جرمنی ۲۱

جزیرہ [illegible]

جزیرۃ العرب ۸۰

جیلان (دیلم) ۱۹۷

چین ۳۳۳

ح

حارم ۲۶۴

حجاز [illegible]

حضرموت ۲۲۰

حطین [illegible]

حلب [illegible]

حمص [illegible]

حیدرآباد [illegible]

خ

خراسان ۴۹، ۶۳، ۷۶، ۸۶، ۱۲۰، ۲۲۹، ۲۸۰، ۲۳۰، ۳۴۰

خلیج عجم ۳۱۱

خوارزم ۳۰۳

د

دائرۃ شاہ علم اللہ ۱۰، ۱۲

دمشق ۹۶، ۱۰۲، ۲۷۱، ۲۸۵، ۲۸۸، ۳۰۰، ۳۱۲، ۳۱۹، ۳۴۰

۳۴۳، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۵۰، ۳۵۱

دیبل ۲۵۹، ۳۰۹

دوریہ ۲۹۱

ر ز

رائے بریلی ۱۰، ۱۶

الرہا ۲۵۳، ۲۵۵

رحبۂ غسان ۴۹

رقہ ۷۱، ۹۵، ۹۶، ۱۰۰

رملہ ۲۷۰، ۳۴۶

روس ۳۱۶

روم ۴۹، ۵۸، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۴۰، ۲۵۱، ۲۵۶

رے ۸۸، ۱۲۶، ۳۱۲، ۳۱۹

زنجان ۲۰۳، ۳۰۳، ۳۴۹

س

سرخس ۸۶

ساٹرا ۲۲۱

سمرقند ۱۸۵، ۳۱۳

ستیاس ۳۴۳

سوبڈان ۳۱۶

سرینہ ۷۶

سیرابادرا ۳۲۵

ش

شام ۸۰، ۸۶، ۸۷، ۹۵، ۲۵۴، ۲۶۰، ۳۱۱، ۳۲۰، ۳۲۳

۲۸۶، ۲۹۰، ۳۰۵، ۳۱۰، ۳۱۸، ۳۳۲، ۳۳۶

۳۲۵، ۳۴۸، ۳۵۱

شیراز ۱۰۶

ص

صحرا ذریب ۳۴۷

صقرہ ۱۳۶

صقلیہ ۲۴۹، ۲۷۰

صنہار ۸۸

صور ۲۴۲

صیدا ۲۹۱

ط

طابران ۱۳۰، ۱۸۹

طرابلس الشرق ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۶

طرطوس ۹۵

طنجہ ۴۶

طوس ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۸۴، ۱۸۸

طہران ۳۱۸

ع

عالم اسلام [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
۲۹۴، ۲۹۸

عجم ۴۵، ۱۴۴

عرب ۳۲، ۲۴۱

عکہ ۲۵۳، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۸۱

عین جالوت ۲۲۱، ۲۲۲

ف

فرانس ۴۱-۲۶۹

فلانڈرز ۲۴۰

فلسطین ۲۵۳-۵۴، ۲۵۹، ۲۹۳-۹۴، ۲۴۰

ق

قاہرہ ۲۸۵، ۲۲۵

قدس ۲۵۳

قراقرم ۲۱۳

قزوین ۲۱۴

قسطنطنیہ ۲۴۲

قبرص ۲۹۰

قونیہ [illegible]

قیصریہ ۲۳۴

ک ل

کاشغر ۲۲۱، ۲۲۲

کانسوا ۲۲۲

کردستان ۲۴۲

کرک ۲۴۳

لنکاسٹر ۲۸۰

لوکمبر ۷۹

لوثر ۵۷، ۹۸

لیمبرج ۳۱۰

ماریدا ۳۴۰

لکھنؤ ۱

م

مازندران ۱۹۶

ماوراءالنہر ۲۹، ۱۱۳

مدینہ منورہ ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۳۰، ۲۴۱، ۲۵۰، ۲۵۷، ۳۰۱، ۲۵۲

۲۶۹، ۳۰۵

مراکش ۱۵۲

مرو ۸۹، ۳۱۳

مشرع الزوایا (قیروان) ۱۱۴

مصر ۴۵، ۷۰، ۱۴۰، ۱۵۰، ۲۱۷، ۲۵۱، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۷۱

۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۵، ۲۹۸، ۲۵۳، ۲۸۰، ۳۱۰، ۴۰۴

۹۹، ۱۵۰، ۲۱۵، ۲۳۴، ۲۴۰، ۳۱۳، ۳۲۰، ۲۵۰، ۲۸۸

مغرب ۹۱، ۲۳۵، ۲۴۱، ۴۰۵

مقام خلیل ۱۸۸

مکہ معظمہ ۹۰، ۸۸، ۱۳۰، ۲۵۵، ۲۷۹، ۲۹۱، ۲۷۵، ۳۲۰

ملطیہ ۳۲۰

منصورہ ۲۹۵

موصل ۲۵۵، ۲۵۸، ۲۶۱

مہد مسیح (بیت اللحم) ۲۵۲

میورقہ ۱۱۲

ن

نابلس ۳۰۵

نیشاپور ۷۷، ۸۸، ۹۲، ۱۳۶، ۱۴۶، ۳۱۲

ہ

ہرات ۳۳۹

ہمدان ۲۱۳، ۲۱۴

ہندوستان ۹۰، ۱۵۸، ۲۹۰، ۲۴۷، ۲۹۰، ۳۴۳، ۳۲۲، ۳۴۴

۲۵۰، ۲۹۱، ۲۹۳، ۲۹۶

ی

یافا ۲۵۳، ۲۶۰، ۲۹۱

یمن ۷۸، ۳۲، ۶۹، ۸۸، ۲۲۲

یرموک ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۸۳، ۳۲۱، ۲۲۸، ۲۲۹

یورپ ۲۷۹، ۲۷۰، ۲۷۶، ۲۹۰، ۲۸۰، ۲۸۰، ۲۹۷، ۲۹۵

۳۹۸

متفرقات

قلعے، شہر و دریا:

قلعہ الطیبان ٣٢١

قلعہ بانیاس ٢٥٦، ٣٦١

قلعہ بعلبک ٣٦١

قلعہ حارم ٢٥٩، ٢٦١

قلعہ حصن الاکراد ٢٥٩

بحر احمر ٤٩

بحر خوارزم (آرال) ٣١٠

بحر قزوین ١٩٧

بحر الکاہل ٢٣

بحر ہند ٢٣

خلیج بحر ٣١٠

دجلہ ٣٠٦

فرات ٢٥٥، ٣٠٢

کوہ طور ٢٣٦

مساجد، مقدس مقامات و معبد:

بیت اللہ شریف (کعبہ) ٢٠٣، ٢٠٤، ٢٠٥

بیت المقدس، مسجد اقصیٰ ١٣٦، ٢٣٣، ٢٥٥، ٢٥٦، ٢٥٧، ٢٦٢، ٢٦٤-٢٦٩، ٢٧٠، ٢٧٥، ٢٧٩، ٢٨٦، ٢٩٢، ٣٠٣

جامع ازہر ٢٨٨

جامع مسجد دمشق ١٣٦

جامع منصور بغداد ٢٥١

مسجد عمر ٢٥٣

باب کعبہ ١٢٣

روضۂ اطہر ٢٥٣

مطاف ٢٠٣

پگوڈا ٢٢

کلیسا ٢٢

درسگاہیں، ادارے اور مطابع:

الفنسٹن کالج بمبئی ٢٥

جامعۃ القاہرہ ١٦٨

طہران یونیورسٹی ٣١٨

مدرسہ حلاویہ، حلب ٢٤٢

مدرسہ خداوند گار ٣٣١

مدرسہ صالحیہ ۲۹۳
مدرسہ نوریہ ۳۳۶
مدرسہ مقدمیہ، دمشق ۳۳۲
مدرسہ مستنصریہ ۳۰۹
مدرسہ نظامیہ ۱۸-۱۹، ۲۱۳، ۱۳۰، ۱۳۶، ۱۸۶، ۱۸۳
کتب خانہ ندوۃ العلماء ۳۱۹
دار المصنفین اعظم گڑھ ۳۳۷
دائرۃ المعارف حیدرآباد ۲۱۰، ۲۵۰
مطبع السعادۃ، مصر ۳۲۲
مطبع صدیقی ۳۰۴
مطبع علامیہ، مصر ۱۳۳
مطبع مجیدی، دہلی ۶۵
النہضۃ المصریۃ ۴۴۳

مذاہب وادیان، عقائد و فلسفہ:

اسلام [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اسماعیلیت ۲۸۳، ۲۸۶
اشعریت، اشعری عقائد ۱۱۷، ۱۱۸، ۲۸۸
اباحیہ ۲۸۳
باطنیت، مذہب باطنی ۹، ۱۰، ۲۲۰، ۲۳۰، ۲۳۹
۲۳۱، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۷۰، ۲۸۵، ۳۰۷
برہمنیت ۲۴، ۲۵
بودھ مت ۲۴، ۲۵، ۲۷، ۳۳، ۳۴
جینیت ۲۷
(عقیدۂ) خلق قرآن ۷۲، ۷۳، ۸۵، ۹۵، ۹۶، ۱۰۱، ۱۰۳
دینِ الٰہی (اکبر) ۲۸
تشیعیت ۲۸۳
قادیانیت ۲۷، ۲۸
قدریت ۲۷
مادیت ۲۷
مذہب اعتزال ۷۸، ۸۵، ۹۶، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۲۰
۱۴۳
مذہب ایسینی (ESSINIS) ۲۱
مذہب بابی ۱۲۷
مذہب حنبلی ۲۹۹، ۳۰۲
مذہب شافعی ۳۰۲، ۳۲۳

مذہب شاہان ۲۲۵
مذہب عیسائی ۔ مسیحیت ۲۲۲،۲۰-۲۲،۱۰
(عقیدۂ) وحدۃ الوجود ۲۹ ۲۸
ہندو مت ۔ ہندو مذہب ۲۲-۲۵،۱۰

مذہبی، اسلامی اور اصطلاحی الفاظ:

اجماع ۱۳۳
آخرت ۱۳۸،۱۳۵،۱۲۹
استلام ۴۳
اسلامی معاشرہ ۶۲،۵۳
بحث ومناظرہ ۱۵۵،۱۵۴
بیعت ۱۹۷،۹۱
تکبیر ۱۵۵
تزکیہ ۱۴۷،۱۳۶
تصوف ۲۲۴،۱۹۱،۱۶۳،۱۴۷،۱۴۲،۹،۱۳۸
تقدیر ۸۵
توحید ۱۵۵،۲۵
جاہلیت ۲۱۲،۳۳،۳۱
جبر واختیار ۸۵
جزیہ ۴۷،۲۷
جنت ۱۳۶،۱۳۴
جہاد ۹۱
حج وزیارت ۱۹۴،۱۴۷،۱۳۹،۱۲۴،۸۸،۳۹
حدیث ۸۸،۸۴،۸۲-۸۱،۷۴-۷۳،۶۸،۶۴،۴۹
۱۸۴،۱۸۲،۱۷۷-۱۶۹،۱۴۴،۱۲۵،۸۹
حرام ۱۵۹،۱۲۳
حلال ۱۵۷،۱۴۴،۹۰
خراج ۱۵۷،۴۷،۳۸
ختم نبوت ۹۷
خلافت ۱۵۲،۱۴۲،۱۲۷،۵۱،۴۹،۳۹،۳۵،۲۹
۱۸۹
دجال ۱۲۷
دوزخ ۔ جہنم ۱۳۶،۱۳۴
رسالت ۱۲۳
رسم علمی ۔ مخالفت ۳۱
رشوت ۱۰۷
روزہ ۔ صیام ۱۲۶،۱۲۴
زکی ۱۵۱
رویت باری ۸۵
زکوٰۃ ۱۲۶،۱۲۴،۵۰
سبق ۱۵۱

سنت ۲۹، ۴۲، ۴۹، ۵۹، ۶۳، ۶۴، ۸۳، ۹۱، ۹۶، ۹۸، ۱۰۳
۱۳۱، ۲۰۲، ۲۳۴، ۲۶۳، ۲۶۷، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۸۴، ۲۸۸، ۲۹۸، ۳۰۸
شریعت ۱۳۴
صلاۃ۔ نماز ۱۳۴، ۱۳۶
ظہار ۱۵۱
کلی روح ۹۹
جزوی روح ۹۹
عقل اول ۱۲۸
فرض، واجب ۱۳۴، ۱۴۷
قیامت ۹۲
لعان ۱۵۱
مبدأ اول ۱۳۳
متعہ ۸۵
مستحب ۱۴۷
معاد ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۴۲
معجزہ ۱۳۳، ۱۴۷، ۱۷۷، ۱۸۴
ملائکہ ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۵۹
نبوت ۴۷، ۴۹، ۵۲، ۵۳، ۸۴، ۸۵، ۹۹، ۱۱۴، ۱۳۳، ۱۴۹
۱۳۶، ۱۴۷، ۱۳۸
نزول مسیح ۱۴۷
نفاق ۷۶–۹۳
ولی ۶۵، ۸۹، ۱۱۱، ۱۲۳، ۱۳۶
وضو ۱۴۷

علوم وفنون:

اخلاقیات ۱۳۴
اصول فقہ ۱۰۸
ریاضیات ۱۲۲، ۱۳۳، ۱۴۳
سائنس ۳۹۸
سنسکرت ۳۶
سیاسیات ۱۳۴
طبیعیات ۱۲۲، ۱۲۸، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۴۱، ۱۴۳
علم الاصنام ۱۲۰
علم تصوف ۱۳۶
علم الکلام ۹۸، ۹۹، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۱۸، ۱۲۸، ۱۴۷، ۱۴۸
۱۴۴، ۱۵۰، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۸، ۱۶۳، ۱۸۱، ۱۸۲
۱۸۴، ۲۲۳، ۲۲۷، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۶۵، ۲۷۹، ۲۸۱، ۲۸۴
۲۹۸، ۳۱۸، ۳۴۲، ۳۶۸
علم ہیئت ۱۲۸
علوم شرعیہ ۲۸۴
علوم عقلیہ، عقلیات ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۳۰، ۱۴۳، ۱۸۹
۱۹۱
علوم نقلیہ ۱۲۸، ۱۸۹، ۱۹۰
فقہ ۲۹، ۳۲، ۷۴، ۱۴۷، ۱۵۵

فقہ اسلامی ۸۲
فقہ شافعی ۸۲، ۱۲۳، ۱۹۶
فقہ مالکی ۸۲
فلسفہ ۲۵، ۲۹، ۳۰، ۱۰۸، ۱۱۰-۱۱۲، ۱۲۰، ۱۲۵، ۱۲۶، ۲۲۰، ۲۲۴، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۵-۲۴۶، ۲۵۹، ۲۸۲، ۲۸۵، ۲۹۳، ۲۹۶، ۲۹۸
فلسفہ اخلاق ۱۹۸
فلسفہ الٰہیات۔ الٰہیات ۲۲، ۲۴، ۲۶-۲۸، ۱۱۸، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۳۱، ۱۴۰، ۱۴۳
فن اسماء الرجال ۴۹
مسئلہ عدل ۸۵
معقولات ۱۲۵
منطقیات ۱۲۳، ۱۳۱، ۱۳۲
یونانی فلسفہ ۸۳، ۸۵، ۱۲۰، ۱۳۲

زبان:

سریانی ۸۴، ۱۲۰
سنسکرت ۳۵، ۳۶، ۱۲۰
عربی ۳۳، ۱۲۰
قبطی ۱۲۰
یونانی ۱۲۰

سلطنتیں و حکومتیں:

تاتاری سلطنت ۳۳۳
حکومت امویہ۔ خلافت امویہ ۳۴، ۳۸، ۵۸، ۸۵، ۹۸، ۹۹
خلافت راشدہ ۳۱، ۳۵
خلافت عباسیہ۔ سلطنت عباسیہ ۶۴، ۹۹، ۱۵۸، ۱۸۸، ۳۰۷، ۳۲۸، ۳۴۹
خوارزمی سلطنت ۳۰۸
دولت ایلخانیہ ۳۲۶
دولت مغلیہ ۳۲۹، ۳۳۳
عثمانی سلطنت ۳۳۲، ۳۳۳
سلجوقی سلطنت ۲۵۳، ۲۵۴، ۳۱۰
عبیدی سلطنت (فاطمی) ۲۸۲، ۲۸۳
لاطینی سلطنت ۲۸۵
ولایت اغالبہ ۲۵۳

عہد و ادوار:

زمانۂ صحابہ ۸۰
عہد اموی ۳۱-۳۳، ۴۱، ۸۲
عہد رسالت۔ عہد نبوت ۶۴، ۷۹، ۸۰، ۱۳۸
عہد صدیقی ۸۲
عہد عباسی ۲۰۶، ۳۰۶

سکّے:

اشرفی ۷۷

چاندی ۳۳۱
دینار ۳۶، ۶۹، ۷۷
درہم ۹۹
سونا ۳۳، ۳۲۱
قنطار ۹۱
گھنٹہ ۷۷

تحریکات و سلاسل طرق:

اخوان الصفا ۱۲۱، ۱۲۲، ۲۸۵
جماعت اسلامی و تبلیغ۔ کمیونزم ۱۱
قرامطہ ۱۲۱
سلسلہ قادریہ ۲۲۱
طریقہ سہروردیہ ۲۲۳

اہم واقعات و معرکے:

آتش نمرود ۱۲۶
ذبح ابراہیم ۱۲۶
طوفان نوح ۱۲۶
عصائے موسیٰ ۱۲۶
فتنہ اعتزال ۲۰۳
فتنہ باطنیت۔ ۱۲۳
فتنہ تاتار ۳۲۹، ۳۰
فتنہ خلق قرآن ۸۴-۹۰، ۹۱، ۹۳، ۹۵
واقعہ ارتداد ۲۵۳
واقعہ حصن الاکراد ۲۵۹
واقعہ کربلا ۶۸
جنگ عظیم ۲۶۳
جنگ خارا ۳۲۷
معرکہ بقیعہ ۲۵۹

دیگر متفرقات:

بت۔ صورت ۲۳-۲۶
برجیہ ۲۸۴
چقماق ۱۸۱
حجر اسود ۳۳
زقوم ۱۷۷
شطرنج ۱۷۵
صلوٰۃ الرغائب ۲۸۸
صلیب ۳۲، ۳۲۰
صنوبر ۲۰۸
عنبر ۷۰
فرنج ۷۵
مشک ۷۰
ملوخیا ۲۸۲
منجنیق ۹۱